آج

۷۵

نرمل ورما
توشیرو یامازاکی
سعید الدین
تنویر انجم
جاوید صدیقی
مطہر ضیا

ترتیب

اجمل کمال

Scanned with CamScanner

آج

ادبی کتابی سلسلہ شمارہ 74

جنوری - مارچ 2013

سالانہ خریداری:

پاکستان: ایک سال (چار شمارے) 800 روپے (بشمول ڈاک خرچ)

بیرون ملک: ایک سال (چار شمارے) 80 امریکی ڈالر (بشمول ڈاک خرچ)

بینک: میزان بینک، صدر برانچ، کراچی

اکاؤنٹ: City Press Bookshop

اکاؤنٹ نمبر: 0100513669

رابطہ:

پاکستان: آج کی کتابیں، 316 مدینہ سٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ، صدر، کراچی 74400

فون: 35213916 35650623

ای میل: ajmalkamal@gmail.com

دیگر ممالک:

Dr. Baidar Bakht, 21 White Leaf Crescent, Scarborough,
Ontario M1V 3G1, Canada.
Phone: (416) 292 4391Fax: (416) 292 7374
E-mail: bbakht@rogers.com

ترتیب

نرمل ورما

5

آخری بیابان

(ناول)

❁

توشیرو یامازاکی

211

نغمۂ ذات

❁

سعیدالدین

215

ریت نظم نظم ویناملک چھاتیاں گھر کا راستہ
آدمی کا نشہ خالی فریم نظم نظم سُرمئی ندی بے دخلی نظم
نظم نظم نظم تصادم الگ الگ اکائیاں

❁

Scanned with CamScanner

تنویر انجم

249

بدل رہا ہے موسم   یہ کیا نظم سوچی ہے   چھوٹی سی کھڑکی ہے

ہمارے سر اور دل ان کے نشانے پر   دیواریں پیچھے جا سکتی ہیں

میں اپنی نظمیں واپس لینے کو تیار ہوں   کہاں گیا وہ   جزیرۂ آہن

وہ میری کٹیا میں   تنہائی کے فن میں کامیاب   یہ میری دوڑ نہیں ہے

انسان اور دوسرے انسان   خرید دیتی ہوں میں تمھیں رشتے

میں رکھ دیتی ہوں تمھارا نام فوٹوگرافر   اگر وہ باندھ دے جوتے کا تسمہ

جب ایک رنگ رہ گیا   میرے ایک ہی جیسے لاتعداد پیالے

شرط   سناؤ مجھے بھی ایک لطیفہ   یہ سبھی کچھ   بریک بنتا ہے

❁

جاوید صدیقی

277

کیا آدمی تھا رے

❁

مظہر ضیا

299

ڈاکٹر رودھرفاؤ کا زندگی نامہ

Scanned with CamScanner

نرمل ورما

آخری بیابان

(ناول)

ہندی سے ترجمہ: شائستہ فاخری

نظرثانی: اجمل کمال

Scanned with CamScanner

ہندی کے جدید فکشن میں نرمل ورما ایک نمایاں اور منفرد مقام رکھتے ہیں اور آج کے پڑھنے والے ان کے نام اور کام سے اچھی طرح مانوس ہیں۔ ہندی کی ''نئی کہانی'' کی تحریک میں شامل نرمل ورما اپنے مخصوص اسلوب اور لسانی رویے کی بدولت جدید ہندی ادب میں ایک بے مثل مقام رکھتے ہیں۔ وہ 1929 میں شملہ میں پیدا ہوئے، بچپن پہاڑوں پر گزرا اور دلّی کے سینٹ اسٹیفنز کالج میں تعلیم پائی۔ 1959 میں انھیں چیکوسلوواکیہ کے ادیبوں کی انجمن کی دعوت پر پراگ جانے کا موقع ملا۔ وہ چیکوسلوواکیہ میں سات برس رہے اور اس دوران انھوں نے منتخب چیک تحریروں کا ہندی میں ترجمہ کیا۔ نرمل ورما نے کہانی اور ناول کے علاوہ سفرنامے، ڈائری اور مضامین کی اصناف میں اپنا بھرپور تخلیقی اظہار کیا۔ انھوں نے 2005 میں دلّی میں وفات پائی۔

آئندہ صفحات میں ان کے آخری ناول انتم ارنیہ کا ترجمہ آخری بیابان کے عنوان سے پیش کیا جا رہا ہے۔ نرمل ورما کا مخصوص نثری اسلوب ان کے اس ناول میں اور بھی زیادہ نکھری ہوئی صورت میں سامنے آتا ہے۔ وہ اپنی افسانوی تصویر بہت ہلکے رنگوں میں تیار کرتے ہیں اور اس طرح انسانی زندگی اور رشتوں کی نہایت نازک تفصیلوں کو بڑے موثر انداز میں گرفت میں لاتے ہیں۔ ناول کے تمام مرکزی کردار زندگی کے ایسے موڑ پر ہیں جب ان کی سرگزشت مکمل ہو چکی ہے، اور ان کی کہانی کو ایک ایسے راوی کی زبانی بیان کیا گیا ہے جو ان کے ماضی سے اسی طرح شناسائی حاصل کرنے کے عمل میں ہے جیسے ناول کا پڑھنے والا۔ اس کے علاوہ خود راوی کی اپنی زندگی بیانیے کے پس منظر میں موجود رہتی ہے۔ کم بیانی نرمل ورما کے فن کا بہت اہم خاصہ ہے اور اس عمل میں ان کی دھیمی اور حساس نثر کلیدی کردار ادا کرتی ہے۔ زیرِ نظر ترجمے میں اس نثر کو ممکنہ حد تک برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس لحاظ سے اس ناول کا مطالعہ اور اردو ترجمہ ہمارے لیے ایک قیمتی لسانی تجربہ بھی ہے۔ اس ترجمے کو پیش کرتے ہوئے یہ خیال رکھا گیا ہے کہ اردو کے مقامی الفاظ، جنھیں ایک دور کی مخصوص لسانی سیاست کے باعث متروک قرار دے کر ذخیرۂ الفاظ سے باہر دیا گیا تھا، جہاں تک ممکن ہو جوں کے توں برقرار رکھے جائیں تاکہ نرمل ورما کی نثر کا مخصوص لہجہ اردو پڑھنے والے تک پہنچ سکے۔ اس ترجمے کے ذریعے یہ احساس دلانے کی بھی کوشش کی گئی ہے کہ زندگی کی تفصیلوں کے اظہار کے کتنے ہی موثر اور خوبصورت سانچے ہمارے ہاتھ سے جاتے رہے، اور ان کو بحال کرنے سے ہماری زبان کے تخلیقی اظہار میں کتنی وسعت پیدا ہو سکتی ہے۔

Scanned with CamScanner

ہم میں سے کسی کے پاس سے نہیں تھا کہ ہم اپنے
جیون کے اصلی ناٹکوں کو جی سکیں جو ہماری قسمت
میں لکھے تھے۔ یہی چیز ہمیں بوڑھا بناتی ہے...
صرف یہ، اور کوئی نہیں۔ ہمارے چہروں کی
جھریاں اور سلوٹیں ان بے پناہ مدہوشیوں،
عادتوں اور دروں بینیوں کی طرف اشارہ کرتی ہیں
جو ہم سے ملنے آئی تھیں اور ہم گھر پر نہیں تھے۔"

...والٹر بنجمن (پروست پر لکھتے ہوئے)

Scanned with CamScanner

1

1.1

وہ آ رہے ہیں۔ میں انھیں دور سے دیکھ سکتا ہوں۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ یہ جان سکوں کہ وہ کسی کے ساتھ ہیں یا اکیلے۔ لیکن یہ ناممکن ہے۔ وہ ڈھلان کے ایک ایسے مقام پر ہیں جہاں دوسرا ہو بھی تو دکھائی نہیں دے سکتا۔ میں نے کوشش چھوڑ دی ہے۔ وہ اب پیڑوں کے آخری جھرمٹ میں چلے گئے ہیں جس کی ہریالی چھت پر ڈوبتے سورج کی ایک پیلی پرت پھیلی ہے۔ اس کے اوپر پرندوں کا ریلا ہے اور اس کے اوپر آکاش، تارے، ہوا... اور پھر کچھ بھی نہیں۔

میں انھیں کافی دور سے دیکھ سکتا ہوں... وہ اب پیڑوں کے جھرمٹ سے باہر نکل آئے ہیں اور پگڈنڈی کے اس آخری سرے پر چلنے لگے ہیں جو ان کی کاٹیج کے پچھواڑے تک جاتی ہے۔ ان کے ایک ہاتھ میں چھڑی ہے، دوسرے میں ٹارچ۔ تیسرا ہاتھ ہوتا تو شاید وہ اسے اپنے کندھے پر رکھ لیتے... اور خود اپنے سہارے کے ساتھ نیچے اترتے جاتے۔ کسی میں اتنی ہمت نہیں کہ انھیں سہارا دے سکے۔ وہ کسی کے محتاج نہیں ہیں۔ ان چیزوں میں تو بالکل نہیں جو روزمرہ کی اور دنیاوی ہیں۔ انھیں دیکھ کر مجھے ہوٹل کے بند کمروں کی یاد آ جاتی ہے جن پر سفید تختی لگی رہتی ہے: ''پلیز ڈونٹ ڈسٹرب!'' یہ وہی کر سکتا ہے جسے معلوم ہے کہ باہر اس کے لوگ بنچوں پر بیٹھے ہیں، اس کے انتظار میں۔ کب تختی اترے، کب وہ اس کے پاس جائیں۔ جو آدمی سچ مچ اکیلا ہوتا ہے وہ ایسی تختیاں نہیں لگاتا، یا اگر لگائے گا تو اس پر لکھا ہوگا: ''کم ون، کم آل!''

وہ اچانک کھڑے کیوں ہو گئے؟ وہ دروازہ کھول کر بھیتر کیوں نہیں چلے جاتے؟ انھوں نے ٹارچ بجھا دی اور بند کمرے کے آگے دہری پر ٹھٹکے رہے۔ کیا وہ کچھ سن پا رہے ہیں جو اتنی دور سے میں نہیں سن پاتا؟ کیا یہ ٹھیک ہے، اس طرح اپنے گھر کے آگے چوروں کی طرح کھڑے ہونا، خود اپنے گھر

Scanned with CamScanner

کی آوازوں کو سنتا؟ اس عمر میں کیا آدمی اتنا شکّی ہو جاتا ہے کہ خود اپنی دیواروں پر شک کرنے لگتا ہے؟

لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے لگا... میں کتنا غلط تھا! وہ سن نہیں رہے تھے، صرف دیکھ رہے تھے۔ تھوڑا سا پیچھے ہٹ کر اپنے گھر کو دیکھ رہے تھے، کچھ اسی طرح جیسے تھوڑا سا پیچھے ہٹ کر ہم کسی پینٹنگ کو دیکھتے ہیں۔ دو پہاڑیوں کے فریم میں جڑی ان کی کاٹیج اپنے ہیٹر کی روشنیوں میں چمچما رہی تھی۔ اندھیرا کہیں تھا تو صرف وہاں جہاں وہ کھڑے تھے — اپنی جھکی ہوئی پیٹھ، ہلتی ہوئی چھڑی اور بجھی ہوئی ٹارچ کے ساتھ... چوروں کی طرح وہ اپنے گھر کو نہیں، میں انھیں دیکھ رہا تھا۔

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ جسے ہم اپنی زندگی، اپنا گزشتہ، اپنا ماضی کہتے ہیں، وہ چاہے کتنا اذیت ناک کیوں نہ رہا ہو، اس سے ہمیں شانتی ملتی ہے۔ وہ چاہے کتنا اوبڑ کھابڑ کیوں نہ رہا ہو، اس میں ہم ایک سنگیت دیکھتے ہیں۔ جیون کے تمام تجربے ایک مہین دھاگے میں چھدے جان پڑتے ہیں۔ یہ دھاگا نہ ہو تو کہیں کوئی سلسلہ نہیں دکھائی دیتا۔ ساری جمع پونجی اسی دھاگے کی گانٹھ سے بندھی ہوتی ہے جس کے ٹوٹنے پر سب کچھ دھول میں مل جاتا ہے، اس فوٹو البم کی طرح جہاں ایک فوٹو پہلے ہی دوسری فوٹو کے آگے یا پیچھے آتی ہو، لیکن ان کے بیچ جو خالی جگہ بچی رہ جاتی ہے اسے بھرنے والا 'میں' کب کا گزر چکا ہوتا ہے۔ وہ ہمارے حال کے نگیٹو ہیں — سفید روشنی میں پھنسے والے پریت — جنھیں ہم چاہیں تو یادوں کی بند دراز سے نکال کر دیکھ سکتے ہیں... نکالنے کی بھی ضرورت نہیں... ایک منظر کو دیکھ کر دوسرا اپنے آپ باہر نکلا آتا ہے، جبکہ ان کے بیچ کا رشتہ کب سے مرجھا چکا ہوتا ہے۔

جیسے اس شام میں نے انھیں اپنی کاٹیج کے باہر کھڑے ہوئے دیکھا... تبھی مجھے ایک دوسرے منظر کی یاد آ گئی۔ ایک ساکت اور شانت لینڈ سکیپ... دو اٹھی ہوئی پہاڑیوں کے بیچ نیچے جاتا ہوا تابوت، جس میں ان کی پتنی لیٹی ہیں... وہ نیچے جا رہی ہیں اور وہ نیچے جھک کر کھلی ہوئی قبر کے اندھیرے کھوکھل میں جھانک رہے ہیں۔ ان کے پیچھے ان کی بیٹی کھڑی ہیں جن کی آنکھیں رومال سے ڈھکی ہیں۔ کیا وہ رو رہی ہیں؟ مجھے نہیں معلوم... میں نہ ان کی آنکھیں دیکھ سکتا ہوں نہ چہرہ... کیونکہ جہاں میں کھڑا ہوں وہاں سے صرف ان کا ایک اٹھا ہوا ہاتھ اور ہوا میں لٹکتے ہوئے رومال کا سرا ہی دکھائی دیتے ہیں۔

Scanned with CamScanner

اچانک مجھے وہ ہنسی سنائی دیتی ہے... سفید دانتوں کی چمکیلی قطار سے پہاڑی جھرنے کی طرح کل کل کرتی ہوئی... ان کی ہنسی جسے میں دفنایا جا رہا تھا — وہ ایسے ہنسا کرتی تھیں جیسے بچے آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے، اپنے چھپے ہوئے کونے سے ہنستے ہیں جب انھیں کھوجنے والا انھیں دیکھ کر پاس سے گزر جاتا ہے۔ میں نے آگے بڑھ کر ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''چلیے،'' میں نے کہا، ''اب وہ ہمیشہ کے لیے چھپ گئی ہیں۔''

ان کے پاس شروع میں جب آیا تھا تو مجھے حیرانی ہوئی تھی۔ وہ بیٹھتے ایک کمرے میں ہیں جبکہ بتیاں سارے کمروں کی جلتی رہتی ہیں۔ ایک بار مجھے نوٹس لکھواتے سے وہ بیچ میں ہی رک گئے۔ میں نے سوچا، وہ کچھ یاد کر رہے ہیں۔ میں قلم اٹھائے ان کی طرف دیکھتا رہا۔ اچانک انھوں نے چھڑی اٹھائی اور دیوار پر ٹنگی رسی کو کھینچا... وہ گھنٹی تھی جو رسی سے کھنچ کر سیدھے مرلی دھر کے کوارٹر میں بجتی تھی۔ چونکہ وہ کمرے میں سنائی نہیں دیتی تھی اس لیے جب مرلی دھر آتا تو لگتا جیسے وہ گھنٹی سن کر نہیں، رسی سے کھنچتا ہوا یہاں آیا ہے۔

وہ ہمیشہ نہیں آتا تھا، پائیدان پر کھڑا ہمیشہ جھانکتا تھا، ایک کٹھ پتلی کی طرح، جس کا سر ہلتا ہے، باقی دیہہ اندھیرے میں چھپی رہتی ہے۔ ''پچھلے کمرے کی بتی نہیں جلائی؟'' انھوں نے پوچھا۔ ''جی؟'' وہ دیکھتا رہا۔ ''کیا بھول گئے تھے آج؟'' ''جی نہیں!'' اس نے سر ہلایا۔ ''بلب فیوز تھا، کل لگاؤں گا۔''

وہ کچھ اور نہیں بولے۔ جو چیز بری لگتی تھی اس کے بارے میں وہ چپ ہو جاتے تھے۔ کچھ دیر بعد جب وہ میری اور مڑے اور پوچھا، ''میں کہاں تھا؟'' تو نوٹ بک میں ان کے رکے ہوئے جملوں کو دوبارہ پڑھنے کی بجائے میں نے ہنس کر کہا، ''آپ یہیں تھے جہاں بتی جلی ہے۔ آپ دوسرے کمروں کے بارے میں پریشان کیوں رہتے ہیں؟''

ان کے چہرے پر ایک عجیب، ذرا سا کا بھاؤ آیا۔ مکان، گھر، کمرے... وہ کافی دور دور تک پھیلے تھے اور وہ انھیں پار کر کے میرے پاس نہیں آنا چاہتے تھے۔ یہ صرف عمر کا ہی تقاضا نہیں تھا۔ یہ ایک دوسری قسم کا تقاضا تھا جسے لانگھ کر مجھے ہمیشہ ان کے پاس آنا پڑتا تھا۔ انھیں یہ اچھا بھی لگتا تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ میں ہمیشہ ان کے ساتھ رہوں، کوئی ہمیشہ ان کے پاس رہے... آس پاس بھلے ہی

Scanned with CamScanner

منڈلاتا رہے... لیکن ان سے چپکا نہ رہے۔ یہ بات سب پر لاگو ہوتی تھی، وہ ان کی بیٹی ہو یا مہمان یا نوکر، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

شاید یہی وجہ تھی کہ ان کی وہ کاٹیج چھوٹی ہوتے ہوئے دور دور تک پھیلی لگتی تھی... ایک پہاڑی قلعے کی طرح جسے نہ دشمن ٹھیک سے دیکھ پائیں نہ دوست آسانی سے کھوج سکیں. دونوں طرف چیڑ کے پیڑ تھے جن کے بیچ اس کی ہری چھت پیڑوں کا ہی حصہ جان پڑتی تھی۔ اوپر سڑک سے جھانکنے پر کاٹیج نہیں، صرف مرلی دھر کا کوارٹر دکھائی دیتا تھا، گھاس کی ڈھلان پر لیٹا ہوا۔ ایک پگڈنڈی اوپر کو جاتی تھی، اور تھوڑا سا اوپر گلیارے کا شیڈ تھا جو شاید پہلے کسی چوکیدار یا سنتری کا شیڈ رہا ہوگا مگر جسے اب الگ کوٹھری میں بدل دیا گیا تھا۔

میں یہیں رہتا تھا۔ میرے لیے وہ کافی تھا۔ ایک چھوٹا سا کچن، ایک ٹوائلٹ اور ایک کمرہ اور ایک گلیارہ۔ یہ گلیارہ ہی تھا جس نے مجھے پہلی بار اس کھنڈر نما کوٹھری کی اور کھینچا تھا۔ وہاں بیٹھ کر نیچے کی گھاٹی اور اوپر کا جنگل دونوں دکھائی دیتے تھے۔ اور جب رات ہوتی تھی تو شہر کی چمکتی روشنیاں اُتنی ہی دکھائی دیتی تھیں جتنے آکاش کے تارے۔ کہنا مشکل تھا، کون سی نقلی روشنی کون سے اصلی تارے میں کایا کلپ کر لیتی ہے۔

میں اندھیرے گلیارے میں تب تک بیٹھا رہتا تھا جب تک مجھے ایک تیسری روشنی دکھائی نہیں دے جاتی تھی۔ وہ اوپر نہیں، نیچے دکھائی دیتی تھی — نیچے سے اوپر آتی ہوئی۔ وہ مرلی دھر کی لالٹین ہوتی تھی۔ وہ اپنے کوارٹر سے نکل کر جھاڑیوں کے بیچ پگڈنڈی پکڑ لیتا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اوپر چڑھتا جاتا۔ پیچھے پیچھے کالی بھونکتی ہوئی آتی اور اس کے پیچھے اس کا بیٹا جسی دھر۔ میرے گلیارے کے پاس آ کر دونوں پیچھے رک جاتے اور صرف مرلی دھر ایک قدم آگے بڑھ کر کاٹھ کی سیڑھیوں پر کھڑا ہو جاتا۔ کہتا کچھ نہیں تھا، صرف اس کی لالٹین کی سرخ تیرتی ہوئی آنکھ اوپر اٹھ جاتی۔ اور تب مجھے پتا چل جاتا تھا کہ جس گھڑی کو میں اب تک ٹالتا آیا تھا وہ مجھے لینے آ پہنچی ہے۔

''چلیں؟'' میں کہتا۔

''جی،'' وہ سر ہلاتا۔ مجھے لگتا وہ اندھیرے میں مسکرا رہا ہے۔

"سب ٹھیک تو ہے؟" میں کہتا۔

"جی سب ٹھیک، بس آپ کا انتظار ہے۔" وہ کچھ ایسے کہتا جیسے ابھی ابھی تھیٹر کا سیٹ تیار کر کے آیا ہے جہاں پر صرف میرے آنے کی دیر ہے۔

میں نے اپنا چشمہ اور فاؤنٹین پین بیگ میں رکھے۔ مفلر پہنا، میز کی دراز سے برانڈی نکالی اور بنا گلاس میں ڈالے ہی اس کا ایک لمبا گہرا گھونٹ لیا تا کہ ان کا سامنا کرنے کی ہمت جٹا سکوں۔ پھر سفید ربڑ کے جوتے پہنے اور باہر چلا آیا۔

میرے باہر آتے ہی مرلی دھر مڑ جاتا اور ہم ایک چھوٹے مریل جلوس کی طرح پگڈنڈی پر چلنے لگتے۔ آگے آگے لالٹین ہلاتا ہوا مرلی دھر، اس کے پیچھے میں، میرے پیچھے کالی کلوٹی کالی... سب سے پیچھے جنسی دھر... اور ہم سب کے پیچھے آدھے چاند کا ٹکڑا جو ہمارے چلتے ہی خود چلنے لگتا اور جب ہم دروازے کے سامنے آ کر کھڑے ہو جاتے تو وہ خود بھی ہمارے پیچھے ٹھٹک جاتا، دیکھنے کے لیے کہ ہم آگے کیا کرتے ہیں۔

مرلی دھر ایک دم دروازہ نہیں کھولتا تھا۔ کچھ دیر اس سے کان سٹائے کھڑا رہتا، جیسے بھیتر سے کسی نامعلوم سگنل کے آنے کا انتظار کر رہا ہو۔ ایسے وقت وہ کسی پہاڑی قبیلے کے سردار جیسا دکھائی دیتا تھا۔ سر پر سات منزلی پگڑ جس کی ناگن پونچھ اس کے گلے میں لٹکی رہتی۔ منھ پر ڈھکا ہاتھ، جیسے وہ صرف سن ہی نہیں رہا بلکہ ہتھیلی کی اوٹ میں کچھ کہہ بھی رہا ہے— کوئی خفیہ پیغام جسے صرف کالی ہی سونگھ پاتی تھی کیونکہ وہ اس کے چاروں اور چکر لگاتے ہوئے پاگلوں کی طرح بھونکنے لگتی اور جنسی دھر ٹکر ٹکر کبھی باپ کو دیکھتا، کبھی کالی کتیا کو، کبھی مجھے...

لیکن تبھی دروازہ کھلا... اتنا اچانک اور جھٹکے سے کہ مرلی دھر نیچے گرتا گرتا بچا۔ اتر کر اس نے لالٹین سیدھی کی، نظر اوپر اٹھائی... وہ کھڑے تھے۔ وہ دہری پر کھڑے تھے اور دیکھ رہے تھے مرلی دھر کو، جو میز ھیوں کے نیچے منھ کھولے کھڑا تھا: کالی کو، جو پونچھ ہلانے لگی تھی: جنسی دھر کو، جو اندھیرے میں اپنے کو اور زیادہ اوجھل کر دینا چاہتا تھا، اور مجھے، جو اب بنا کسی آڑ کے ان کے سامنے کھڑا تھا اور جس کے منھ سے برانڈی کی باس آ رہی تھی...

انھوں نے کھٹ سے دروازہ بند کر دیا۔

Scanned with CamScanner

دروازہ بند ہوتے ہی باہر کی دنیا پیچھے سرک جاتی تھی... اور وہ روشنی میں دکھائی دیتے تھے اور مجھے لگتا تھا کہ میں اب بھی اندھیرے میں کھڑا ہوں، کسی اشارے کے انتظار میں، اس نوسکھیا ایکٹر کی طرح جو جب تک اشارہ نہیں ملتا، بت کی طرح کھڑا رہتا ہے۔

وہ کچھ کھوئے سے کھڑے رہتے۔ میرے لیے یہ ٹھیک تھا۔ مجھے کوئی جلدی نہیں تھی۔ میں روز کی طرح اپنی کرسی پر بیٹھ جاتا، سننے لگتا۔ پیڑوں میں ہوا کا شور کتنے سناٹوں کے بیچ سیندھ لگاتا ہوا بھیتر آتا تھا۔ وہ آتا اور وہیں ٹھہر جاتا۔ اور تب میں اسے سننا بھی بند کر دیتا۔ صرف ایک ہلکی سی کھنکھار سنائی دیتی، ایک سیٹی، ان کے پھیپھڑوں کو چھیدتی ہوئی باہر آتی، جو صرف تبھی باہر آتی جب وہ چلنے یا کھانسنے لگتے... "پانی؟" میں نے ان کی اور دیکھا۔

وہ آنکھیں موندے بیٹھے تھے۔ میں اٹھ گیا۔ میں نے جگ سے گلاس میں پانی ڈالا اور ان کے سامنے والی میز پر رکھ دیا۔ انھوں نے صرف ایک چوتھائی گھونٹ لیا۔ سر ہلایا، میری اور تب بھی نہیں دیکھا۔ صرف تھوڑا سا جھک کر میز کی نچلی دراز کھولی اور ایک لمبی چوکور نوٹ بک نکالی جو نوٹ بک اتنی نہیں جتنی رجسٹر جان پڑتی تھی۔ لیکن وہ کافی پتلی تھی اور دوسرے بھاری بھرکم رجسٹروں سے بہت الگ دکھائی دیتی تھی۔ اس پر خاکی کاغذ کی موٹی جلد چڑھی تھی جس کے کونے ادھڑ گئے تھے۔ دو تین بار کھول کر زور سے بند کیا۔ تھوڑی سی گرد اوپر اٹھی جسے انھوں نے پھونک مار کر ہوا میں اڑا دیا۔

"کل تم نے پوچھا تھا تو مجھے یاد نہیں آیا۔ لیکن اب دیکھو، یہ وہاں ہے جہاں میں نے پنسل سے نشان لگایا ہے!"

میرا اندازہ صحیح تھا۔ وہ نوٹ بک نہیں، اٹلس تھی۔ میں نے اسے بیچ میں کھولا تو افریقہ کا نقشہ دکھائی دیا۔ دوسرے پر بھی افریقہ کا، لیکن اس پر صرف پہاڑ، جنگل اور ندیاں تھیں۔ تیسرا کھولا، لیکن تبھی ان کی آواز سنائی دی۔ "وہ کھولو جہاں میں نے نشان لگایا ہے۔" تب مجھے کاغذ کی لمبی کترن دکھائی دی جو افریقہ اور آسٹریلیا کے کہیں بہت پیچھے لٹک رہی تھی۔ اور جب میں نے وہ پنا کھولا تو آنکھیں اس پر ٹھٹک گئیں... جو پہچانے دیش سے کہیں بڑا اور بھرا پرا دکھائی دیتا تھا... برما سے افغانستان تک پھیلا، لال، سفید اور پیلے رنگوں میں چھپا ہوا... عرب ساگر اور بنگال کی کھاڑی کے بیچوں

کے ساگر میں اٹھا ہوا جل سنہری پھول... برٹش انڈیا جو پرانے بھارت سے بھی کہیں پرانا دکھائی دے رہا تھا۔ اور تب بنا کچھ سوچے سمجھے میں نے اٹلس کو پلٹ کر اس کا پہلا پنّا دیکھا... ورلڈ اٹلس، میک ملن پبلشر، 1935۔

1935، وہ کل رات ہنسیں تو اگلے تھے۔ عجیب بات یہ تھی کہ انھیں اپنے گزرے جیون کی تفصیلیں یاد رہتی تھیں... دن، مہینہ، سال... مگر شہروں کے نام وہ بھول جاتے... ایسا کوئی کونا نہیں تھا جہاں ان کی یادداشت اپنے چھپنے سے بچی ہوئی گھٹنا کو باہر نکال سکے، لیکن جگہ، استھان، شہر — وہاں کچھ ایسی کیچڑ تھی کہ پیر ٹکاتے ہی وہ پھسلنے لگتا تھا۔ اس کی وجہ شاید ان کی افسری زندگی رہی ہوگی جس میں انھیں لگاتار یاترائیں کرنی پڑتی تھیں۔ ایک مریل شہر سے دوسرے منفصل شہر، جہاں چلتی ہوئی ٹرین سے دیکھنے کا لینڈسکیپ تو یاد رہتا ہے، بیچ میں ٹھہرے اسٹیشنوں کے نام نہیں۔ تبھی میری نظر اس اقتباس پر پڑی جو میں نے کہیں بیچ میں ٹانک دیا تھا:

> **Space doesn't live in pure tume,where we are now. But the object of space—trees, houses, weather, sky, even the colours of the earth—do have time, because they are supported by memory, which is a temporal fact. .**

پڑھتے پڑھتے میں رک گیا۔

"چندر؟" میں نے ان کی اور دیکھا۔

"چندل!" انھوں نے کہا، "نقشے میں اب دکھائی نہیں دیتا۔ وہ دریا میں ڈوب گیا ہے۔"

میں نے کبھی اس شہر کا نام نہیں سنا تھا۔ نقشے میں بھی پہلی بار دیکھا — جہاں بیچ بیچ دریا کی نیلی ریکھا بہہ رہی تھی۔

میں نے ایک بار پھر نقشے کو دھیان سے دیکھا جہاں دریا کی ریکھا کھنچی تھی، لیکن اس کا نام کہیں شہر کے بجوں کے پیچھے چھپ گیا تھا۔ وہ کافی خوش دکھائی دے رہے تھے۔

"آپ وہاں کافی عرصہ رہے؟"

"گر بازخ نہ آتی تو ہمیں کوئی جلدی نہیں تھی۔ جس سرکٹ ہاؤس میں میں ٹھہرا تھا، وہ تو آدھے سے زیادہ ڈوب گیا تھا... اسی دریا میں جو تم نے نقشے میں دیکھا تھا۔"

Scanned with CamScanner

''وہی جس کے نیچے جندل کا 'ایل' ڈوبا تھا؟''

وہ مسکرانے لگے۔ میری اور دیکھا۔

''کیا کرتے رہے آج؟''

وہ جب خوش ہوتے تھے تو سمجھتے تھے کہ میرا دن بھی اچھا بیتا ہے۔ ہم دن میں کئی بار ملتے تھے لیکن اس طرح کے نجی سوالات وہ صرف رات کی گھریلو گھڑیوں کے لیے رکھتے تھے، جب میں اپنے کوارٹر سے اتر کر ان کی کاٹیج میں آتا تھا۔

''کیا تم اسے دوبارہ پڑھ سکتے ہو جو تم نے کل رات لکھا تھا؟''

میں نے وہ نوٹ بک کھولی جو میں اپنے ساتھ دلّی سے لایا تھا۔ کسی راجستھانی بہی میں ان کے ماضی کا جمع کھاتا درج کیا جائے گا، یہ شاید ہم میں سے کسی نے نہیں سوچا تھا۔ یہ ان کی اچھا نہیں تھی مگر جب انھیں میری چوری پتا چلی تو کافی ہمدردی سے میرا ساتھ دینے لگے۔ کہنے لگے، ''اگر اس سے تمھارا من لگتا ہے تو مجھے بھی اچھا لگے گا۔ جب تک تم یہاں ہو، تم جو چاہے کر سکتے ہو۔ صرف میرے سامنے نہیں...''

اور اس طرح پوتھیاں اکٹھا ہونے لگیں، ایک کے بعد ایک۔ نہ جرنل، نہ ڈائری، صرف تاریخیں، شہروں کے نام، یاترائیں، ڈاک بنگلے، ندیاں، نہریں، مانسون کے مہینے اور باڑھ کے دن... ایک طرح کی ریفرنس بک... کچھ یادوں کے نقشے، پیلے کاغذ پر بکھرے تتر بتر شہر، جنھیں آپس میں جوڑ کر میں ان پڑاووں کی پناہ گاہ کو نشان زد کرتا تھا جہاں ان کا جیون بیتا تھا۔ جب وہ کچھ کہتے کہتے رک جاتے، بھٹک جاتے، بھول جاتے، تو میں ان کے سہارے انھیں دوبارہ لیک پر لے آتا... کچھ ویسے ہی جیسے بڑے شہر میں اندھے کو راستہ پار کرتے ہوئے لوگ ہاتھ پکڑ کر پٹری پر پہنچا دیتے ہیں...

لیکن نہیں، یہ غلط ہے۔ یہ مجھے بعد میں پتا چلا... دیکھتے وہ سب کچھ تھے پر ایک ایسی حالت میں پہنچ گئے تھے جہاں ایک پٹری سے دوسری پٹری تک پہنچنے میں دیر لگتی ہے۔ ایک کو پار کر کے ہی دوسری میں جانا پڑتا تھا۔ جب تک وہ کسی کھائی یا گڑھے کو لانگھتے، میری پنسل ہوا میں ٹنگی رہتی۔ میں سوچتا تھا، شاید وہ کسی بھولی ہوئی گھٹنا کو یاد کر رہے ہیں، جبکہ اکثر ہوتا یہ تھا کہ وہ کسی یاد آئی گھٹنا کو بھلا

Scanned with CamScanner

دینے کی کوشش کر رہے ہوتے تھے۔ یاد آنے اور بھولنے کے بیچ جو کھائی آتی تھی اس سے بچنے کے لیے مجھ سے پوچھتے تھے: ''کیوں صاحب، میں کہاں ٹھہرا تھا؟''

''باڑھ پر،'' میں نے کہا۔

''باڑھ' ہاں... یاد آیا۔ چھوٹی سی ندی اور اتنا پانی! یہ تو اچھا ہوا کہ میری پتنی میرے ساتھ نہیں تھیں، ورنہ کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جہاں وہ میرے ساتھ نہیں جاتی تھیں۔ اگر وہ میرے ساتھ آتیں تو مجھے ہی ندیا کو ان کے پیٹ سے باہر نکالنا پڑتا!'' وہ ہنسنے لگے۔ ''تم نے تو ندیا کو دیکھا ہے، ان دنوں وہ ان کے پیٹ میں تھی۔ میں اوپر کی منزل میں تھا جہاں پانی کی پہنچ نہیں تھی۔ تین دنوں تک میں اپنے کمرے میں ہی بیٹھا رہا، کھانا پینا سب بند! لیکن مجھے اس کی چنتا نہیں تھی۔ موت کوئی مسئلہ نہیں ہے، اگر تم نے اپنی زندگی شروع نہ کی ہو۔ لگتا ہے، تم کتنی آسانی سے وہاں لوٹ سکتے ہو جہاں سے تم آئے ہو۔ تم نے دیکھا ہوگا، جتنی آسانی سے نوجوان آتم ہتیا کر لیتے ہیں، بوڑھے لوگ نہیں... وہ جینے کے اتنے عادی ہو چکے ہوتے ہیں کہ اس سے باہر نکلنا دوبھر جان پڑتا ہے۔ موت سے زیادہ خوفناک یہ بات ہے کہ تم کبھی مرو گے نہیں، ہمیشہ کے لیے جیتے جاؤ گے! ہے نا بھیانک چیز؟''

''آپ کیا کرتے رہے ان دنوں؟'' میں نے انھیں پٹری پر کھینچتے ہوئے کہا۔

''فائلیں!'' انھوں نے کہا۔

''کیسی فائلیں؟''

''تم سوچ نہیں سکتے، جن سرکاری افسروں کو ایک شہر سے دوسرے شہر جانا پڑتا ہے انھیں کتنے فیصلوں سے گزرنا پڑتا ہے، فیتوں کے فیصلے!'' وہ اپنی ہی بات پر ہنسنے لگے۔ ''اس لیے جو حادثے سادھارن لوگوں کے لیے بپتا ہوتے ہیں وہ ہمارے لیے وردان۔ بھونچال، باڑھ، مہاماری... یہ اگر نہ آئیں تو ہمارے ادھورے کام کبھی پورے نہ ہوں۔ تمھیں وشواس نہیں ہوگا کہ ان تین دنوں میں میں نے اپنی ساری فائلیں نپٹا ڈالیں۔ جب ڈوبتے لوگ تنکے کا سہارا کھوجتے ہیں، ہم فیتوں کے سہارے سات سمندر پار کر لیتے ہیں... چوتھے دن جب میں نے کھڑکی سے باہر جھانکا تو پانی اترنے لگا تھا۔ سورج نکل آیا تھا، ریل کی پٹریاں ایسی صاف دھلی چمک رہی تھیں جیسے دو سانپ پانی سے نکل کر دھوپ سینک رہے ہوں... ڈاک بنگلے کا چوکیدار جب اوپر آیا تو مجھے زندہ دیکھ کر اسے اتنا ہی تعجب

Scanned with CamScanner

ہوا جتنا مجھے اسے دیکھ کر... جانتے ہو، اس کے ہاتھ میں کیا تھا؟ ٹیلیگرام — جو اسے تین دن پہلے ملا تھا۔ ذرا سوچو، جب بٹیا اس دنیا میں آئی تھی، میں دنیا کے کگار پر بیٹھا تھا... باڑھ کی بات کہاں سے شروع ہوئی تھی؟''

میں نے نوٹ بک کھولی۔ سوچا، شاید چھوٹی بات یاد کروا کر میں انھیں ڈاک بنگلے اور باڑھ کی دلدل سے نکال سکوں گا، لیکن انھوں نے بیچ میں ہی روک دیا۔ ''وہ پھر کبھی بعد میں... آج یہیں تک۔''

کچھ دیر تک ہم چپ بیٹھے رہے۔ پھر میں نے ان کی اور دیکھا۔ ''چلوں؟''

''اچھا ٹھیک ہے... لیکن ٹھہرو، مرلی دھر ابھی آتا ہی ہوگا۔''

''اس کی ضرورت نہیں ہے،'' میں نے کہا۔ ''میں اپنی ٹارچ ساتھ لے آیا ہوں۔ کوئی کام ہو تو بتائیے۔''

وہ کچھ دیر چپ بیٹھے رہے، پھر میری اور دیکھا۔ ''تمھیں یہاں اکیلاپن تو نہیں لگتا؟''

''آپ کیا سوچتے ہیں؟''

وہ چپ بیٹھے رہے۔ کچھ نہیں بولے۔ میں ان کے پاس آیا، ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا، اسے دھیرے سے دبایا۔ وہ نہ ہلے نہ ڈُلے اور میں دروازہ کھول کر باہر چلا آیا۔

اپنے کمرے میں لوٹنے سے پہلے میں کچھ دیر ٹہلنے کے لیے نکل پڑتا۔ ہوا میں خنکی ہوتی اور آکاش کھلا ہوتا۔ تارے اتنے زیادہ ہوتے... اور اتنے چمکیلے کہ لگتا، ہاتھ اٹھا کر انھیں چھوا جا سکتا ہے۔ پیڑوں کے اوپر سفید دھند کے پھاہے تیرتے رہتے — شانت، ٹھہرے ہوئے، ساکت... ان کے نیچے چلتا ہوا میں بھول جاتا کہ میں وہاں کس لیے ہوں، اپنے گھر سے اتنی دور کیا کر رہا ہوں۔ ہوا میں سانس لیتے ہوئے دیہہ ہلکی سی جان پڑتی اور آشا بندھنے لگتی۔ کس چیز کی آشا اور کس کے لیے... یہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ من خالی رہتا تو اس میں کچھ بھی آ سکتا تھا۔

پگڈنڈی پر چلتے چلتے میں رک گیا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اندھیرے میں ان کی کاٹیج ایک جھپجھپاتی دیا سی دکھائی دیتی تھی جسے کوئی بھولے سے بیچ جنگل میں چھوڑ گیا تھا۔ ہر کمرے کی بتی جل رہی تھی، تین برس پہلے کی طرح جب میں وہاں پہلی بار آیا تھا۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ وہی ہری

کاٹھ کی کھڑکیاں، بینڈ سٹینڈ کا لان، پتھر کی بنچیں... سب کچھ ویسا ہی تھا۔ صرف اب وہاں وہ نہیں تھیں... وہی جنھوں نے مجھے یہاں بلایا تھا... کیا وہ اسی لیے قبر میں جاتے ہوئے ہنس رہی تھیں جیسے مجھ سے کہہ رہی ہوں، "دیکھو، تمھیں بلا کر میں جا رہی ہوں!" یا انھیں ڈر تھا کہ کہیں میں اکیلے پہاڑ پر اوب تو نہیں رہا؟ اوبنے کا سوال نہیں تھا۔ دن کیسے شروع ہوتا تھا، کب رات چلی آتی تھی، مجھے پتا نہیں چلتا تھا۔ جب صبح مرلی دھر کا لڑکا چائے لاتا تھا تو مجھے پتا چلتا تھا کہ یہ دن ہے، اور شام کو جب خود مرلی دھر لالٹین لے کر آتا تو یہ نہیں لگتا تھا کہ کوئی نیا دن شروع ہوا ہے۔ صرف یہ لگتا تھا کہ پرانے دن کی یہ ایک نئی شروعات ہے — جیسے دن ایک ہی ہے اور میں اسے کبھی اوپر سے اور کبھی نیچے سے، نئی نئی طرفوں سے دیکھ رہا ہوں۔

جب کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہ ایک دن کے بعد دوسرے دن میں رہتے ہیں تو شاید اصل میں ان کا مطلب ہوتا ہے کہ وہ ایک ہی دن میں رہتے ہیں جو چلتا رہتا ہے۔ جب میں چھوٹا تھا تو ایک بار میں نے اپنی گرمی کی چھٹیاں ایک چھوٹے سے قصباتی اسٹیشن میں گزاری تھیں۔ وہاں میرے چاچا اسٹیشن ماسٹر تھے۔ میں دیکھا کرتا تھا کہ ریل کے ڈبے جو پرانے ہو جاتے تھے، انھیں ایک چھوٹی لائن پر کھڑا کر دیا جاتا تھا۔ ریل گاڑیاں آتیں اور انھیں چھوڑ کر دھڑدھڑاتی ہوئی آگے بڑھ جاتیں۔ ان خالی ڈبوں میں ہم لکا چھپی کا کھیل کھیلتے تھے... کبھی کبھی وہاں ہمیں انوکھی چیزیں مل جاتیں — کسی آدمی کا عطر، سیٹ کے نیچے دبکی کسی لڑکی کی سینڈل... ایک بار تو مجھے ایک مسافر کی پھٹی پرانی نوٹ بک بھی ملی تھی جس میں پانچ روپے کا چیکٹ نوٹ دبا تھا... لیکن سب سے حیرت انگیز یاد خود ریل کے ڈبے کی تھی جو ریل کی پٹری پر کھڑا ہوا بھی کہیں نہیں جاتا تھا۔ اگر انھوں نے وہ اشتہار نہ دیا ہوتا تو آج بھی میرا ڈبا اس پہاڑی قصبے کی برانچ لائن پر لگا رہتا۔ کبھی کبھی کتنی چھوٹی چیز آدمی کی زندگی بدل دیتی ہے...

میں نے دلی کے اسٹیٹسمین میں وہ اشتہار دیکھا تھا، جس کی کترن آج بھی میرے کاغذوں میں پڑی ہوگی۔ مجھے اب اس کی بھاشا ٹھیک سے یاد نہیں۔ اگر کوئی چیز یاد رہ گئی ہے تو اپنے بھیتر کا حیرت انگیز تجسس جو اس چھوٹے سے اشتہار نے میرے بھیتر جگایا تھا۔

Scanned with CamScanner

پہلی چیز تو یہی تھی کہ وہ اشتہار ایک عورت نے دیا تھا جس میں کسی پڑھے لکھے جوان لڑکے کی مانگ کی گئی تھی جو ان کے ریٹائرڈ پتی کے ساتھ ہر روز کچھ گھنٹے بتا سکے اور ان کی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کو پورا کر سکے۔ وہ 'ضرورتیں' کیا ہوں گی، اس کا کوئی حوالہ اشتہار میں نہیں دیا گیا تھا۔ اس کے عوض میں درخواست گذار کو (اس کے تقرر پر) مفت کی بورڈنگ اور لاجنگ ہی دی جا سکے گی...

میرے تجسس کا ایک کارن یہ بھی تھا کہ خط و کتابت کے لیے انھوں نے گھر کے پتے کی جگہ بہادر گنج کے پوسٹ آفس کا پتا دیا تھا۔ بعد میں جب میں نے ان سے اس کا بھید جاننا چاہا تو وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگیں، جیسی کہ ان کی عادت تھی۔ کہنے لگیں، ''آپ کیا سوچتے ہیں، اگر میں انھیں (مہرا صاحب کو) پہلے سے بتا دیتی تو وہ آپ کو یہاں اپنے گھر میں پیر رکھنے دیتے؟ میں انھیں آخر تک اندھیرے میں رکھنا چاہتی تھی۔''

اندھیرے میں؟ میں ان کے بارے میں نہیں جانتا، صرف اپنے بارے میں کہہ سکتا ہوں کہ جس دن میں نے وہ اشتہار پڑھا، میں اندھیرے سے باہر نکل آیا تھا۔ میں جیون کے ایک ایسے دور سے گزر رہا تھا جسے کچھ لوگ 'کرائسس آف مڈل ایج' کہتے ہیں۔ یہ میں اب سوچتا ہوں، میں اس سے باہر نکلنا چاہتا تھا۔ اب ہنسی آتی ہے — کیا کوئی اپنے تن کی کھال اور من کے میل سے باہر آ سکتا ہے؟ کہیں بھی جاؤ، یہ دونوں چیزیں پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ لیکن ایک بات میں جانتا ہوں — یہاں آنے کا مطلب ایک دنیا کو چھوڑ کر دوسری دنیا میں جانا نہیں تھا؛ یہ اپنی ہی دنیا میں اپنے کو دوبارہ پانے کی کوشش تھی...

مجھے نہیں معلوم، میں اس میں کتنا سپھل ہو پایا ہوں لیکن کبھی میں اپنی کوٹھری کے برآمدے میں بیٹھا ہوا بارش کی بوچھار دیواروں پر گرتی ہوئی دیکھتا ہوں تو لگتا ہے کہ میرا 'مڈل ایج' کا کرب پہاڑ کی پھیلی ہوئی شانتی میں گھل گیا ہے — اگر شانتی کا مطلب ایک بندھی لیک کے ساتھ جینا ہے جہاں نہ کسی اچانک خوشی کا جھٹکا لگتا ہے اور نہ کسی خطرے کا جھونکا آتا ہے۔

کام بھی زیادہ نہیں ہے... ہفتے میں دو بار مہرا صاحب کی کاٹیج میں جاتا ہوں۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں، یاد کرتے ہیں، سوچتے ہیں، اسے نوٹ کر لیتا ہوں۔ بیچ کے خالی دنوں میں انھی نوٹس میں ضروری کاٹ چھانٹ کرتا رہتا ہوں، تاکہ جب کوئی تیسرا آدمی انھیں پڑھے تو وہ بالکل ہی بے معنی نہ جان

Scanned with CamScanner

پڑیں۔ بھلا اس جگہ تیسرا آدمی اور کون ہو سکتا ہے... سوا ان کی بیٹی کے جو مہینے میں کبھی کبھار ایک ویک اینڈ گزارنے کے لیے یہاں آ جاتی ہیں۔ یہ وہی ہیں جن سے پہلی بار ملنا ان کی ماں کی قبر پر ہوا تھا۔ بھری میں، پکی قبر کے آگے۔

وہی جن کے مردہ کھوکھل سے میں نے ان کی ہنسی سنی تھی جنھیں دفنایا جا رہا تھا۔

جیسے وہ کہہ رہی ہوں: "دیکھو، میں نے تمھیں یہاں بلایا تھا اور میں جا رہی ہوں۔"

کیا وہ سچ مچ چلی گئی ہیں؟ میں خالی کمرے میں باہر ہوا کا چلنا سنتا رہتا ہوں۔ مجھے ان کا یاد آنا ایک پربت جیسا لگتا ہے — گھر کے بھیتر باہر کوئی بھٹکتی سی چیز... نہیں، آتما نہیں، اتنی بھری، صاف، چھپاتی دیہہ، اپنے میں سمپورن جان پڑتی تھی۔

وہ مہرا صاحب کی دوسری بیٹی تھیں، عمر میں ان سے بہت چھوٹی۔ جب میں پہلی بار آیا تھا تو میں سمجھا تھا کہ وہ ان کی بیٹی ہیں۔ یہ پتا تھا کہ وہ پہلے سے ہی ایک بیٹی کی ماں بن کر آئی ہیں۔ جس دن میں آیا تھا، وہ بیڈمنٹن کھیل رہی تھیں۔ ان کے ساتھ ایک دوسری مہیلا تھیں اور مہرا صاحب کورٹ کے باہر بیٹھے تھے۔ ان کے آگے میز لگی تھی جس پر پانی کا جگ اور شیشے کے گلاس رکھے تھے۔ قلی سامان لیے میرے ساتھ کھڑا تھا۔ بارہ گھنٹے کی یاترا کے بعد... دھول، گرد، پسینے میں لدا پھندا میں... پہاڑی کاٹیج کے اس منظر کو ایک فلم کی طرح دیکھ رہا تھا۔

اس دن بھی ہوا ویسے ہی چل رہی تھی جیسے آج... ہوا میں بہتی ہوئی شٹل کاک کورٹ کی باؤنڈری کو لانگھ کر وہاں چلی آئی جہاں میں کھڑا تھا۔ وہ بالکل میرے پیروں کے سامنے آ کر گری تھی۔ سفید چڑیا! وہ بھاگتی ہوئی میرے پاس آئیں اور میں نے چڑیا اٹھا کر ان کے ہاتھ میں پکڑا دی۔

وہ لمحہ بھر مجھے اپلک گھورتی رہیں... پھر میرے قلی کی طرف دیکھا، پھر دوبارہ میری طرف...

اور تب انھوں نے کچھ حیرت میں کہا: "کیا تم وہی ہو، اسٹینسمین والے امیدوار؟"

انھوں نے اپنا جملہ پورا نہیں کیا۔ ان کے پیچھے مہرا صاحب کھڑے تھے اور مجھے دیکھ کر مسکرا رہے تھے... اپنی بیٹی کے ادھورے جملے اور اپنی مسکراہٹ کے بیچ انھوں نے میرے تعارف کو پورا کر دیا تھا۔ ہاتھ پکڑ کر وہ کچھ آگے چلے آئے جہاں بیڈمنٹن کا کورٹ تھا... وہاں ایک بدیسی مہیلا اب

بھی ریکٹ ہاتھ میں لیے کھڑی تھیں بہت چھوٹے قد کی، لیکن سخت، چوڑی کاٹھی، سفید بال اور بڑی بڑی نیلی آنکھیں...''یہ انا جی ہیں۔لیکن یہ ابھی آپ سے ہاتھ نہیں ملائیں گی جب تک اپنا گیم پورا نہیں کرلیں گی...''

جب تک گیم پورا نہیں ہو گیا، میں کورٹ کے کنارے بیٹھا رہا تھا۔مسز مہرا ایک طرف اور دوسری طرف مہرا صاحب اور وہ بدیسی میبالا۔کورٹ کے پیچھے پیڑوں کی ترچھی لائن جو پہاڑ پر کھنچتی ہوئی آسمان تک چلی گئی تھی، سورج کی آخری روشنی میں سلگتی ہوئی...

شام کا وہ دھندلکا بہت چمکیلا سا ہو گیا تھا...تارے نکل آئے تھے۔ان کے شٹل کاک کی کھٹ کھٹ کی آواز کبھی ایک طرف، کبھی دوسری طرف سے میرے پاس چلی آتی تھی...مسز مہرا اکیلی ہو کر بھی جیت گئی تھیں...میرے پاس آکر کرسی پر بیٹھ گئیں تو تاروں کی روشنی میں ان کے سندر، تپتے ہوئے چہرے کو دیکھ کر کون کہہ سکتا تھا کہ دو سال بعد میں ان کی قبر کے سامنے کھڑا ہوں گا...

1.2

یہ میری چھٹی کی شام ہے۔ مجھے ان کے پاس نہیں جانا۔کوئی اور دن ہوتا تو میں کمرے میں بیٹھ کر ان کی ڈائری کے نوٹس کو نئے کاغذوں پر ٹیپنے بیٹھ جاتا، لیکن بتی چلی گئی تھی اور کمرے میں سرمئی سا اندھیرا چلا آیا تھا۔باہر برآمدے میں آیا تو میز پر چائے کی ٹرے دکھائی دی جو سرلی دھر چھوڑ گیا تھا جب میں اندر سو رہا تھا۔میں کچھ چونک سا گیا جب میں نے دیکھا، ٹرے کے نیچے کاغذ کا پرزہ دبا تھا۔کھول کر دیکھا تو اس میں انا جی کے صاف ستھرے اکشر چمک رہے تھے...

Please come this evening. A surprise is waiting for you!
A.

انا جی وہی میبالا تھیں جنھوں نے پہلے دن کورٹ میں مجھ سے گیم پورا ہو جانے کے بعد ہی ہاتھ ملایا تھا۔وہ جرمن تھیں اور دوسری لڑائی سے پہلے یہاں آئی تھیں...انھوں نے اپنا بچپن بلیک فاریسٹ میں بتایا تھا جس کے بارے میں وہ مختلف قصے کہانیاں سناتی تھیں...لیکن ہندوستان آنے کے بعد ان کی کہانی پٹری سے اتر کر کئی پہیلیوں کے بیچ ایک ساتھ چلتی تھی...جن کے بیچ کسی طرح کا تال میل

بٹھانا ناممکن لگتا تھا۔ کچھ سال فرید کوٹ کے راج گھرانے کی گورنس بھی رہی تھیں... پھر راجستھان چلی گئی تھیں، جہاں تھار کے ریگستان میں ان کی جیون دھارا کئی برسوں تک اوجھل رہ کر آخر ہماچل کے اس ڈیرے پر دکھائی دی جہاں وہ پچھلے کئی برسوں سے اکیلی رہ رہی تھیں... ان کے بارے میں جانکاری کی کمی ہو، افواہوں کی کمی نہیں تھی... سنا جاتا تھا کہ جرمن ہونے کے کارن لڑائی کے دنوں میں ان پر کڑی نگاہ رکھی جاتی تھی۔ یہ بات مسز مہرا ہنستے ہوئے بتاتی تھیں... ''کیا تمہیں ہماری اناجی جاسوس جان پڑتی ہیں؟ ہماری میم صاحب ماتا ہری جی؟''

جب کبھی مجھے ان کا نوٹ ملتا، کاغذ کے پرزے پر ان کے ہاتھوں سے لکھا ہوا خفیہ پیغام، تو مجھے لگتا کہ وہ جاسوس نہ بھی رہی ہوں، شاید ان کی ایسی سنکوں کے کارن ہی انگریزوں نے ان پر شک کیا ہوگا... کچھ بھی ہو لیکن اس شام چائے کی ٹی کوزی پر ان کے ہاتھ کا براؤن کاغذ دیکھ کر مجھے گہری راحت ملی، کہیں باہر جانے کا بہانہ ملا۔ لیکن سرپرائز کی بات سے تھوڑی حیرانی ہوئی۔ اس طرف پہاڑی نگر میں سرپرائز کی بات تبھی ہوتی تھی جب کوئی بھوکا بھیڑیا اپنی ماند سے نکل کر کنٹونمنٹ کی سڑک پر چہل قدمی کرتا ہوا پایا جاتا تھا یا کہیں جنگل میں آگ کی لپٹیں دکھائی دیتی تھیں۔ میں نے اپنے کپڑے بدلے اور ٹارچ لے کر باہر نکل آیا۔

باہر اب بھی بادل چھائے تھے۔ لگتا تھا، میں جب سو رہا تھا تب بارش کی کوئی بوچھاڑ جھکتی ہوئی آئی تھی اور سارے شہر کو ایک شاور میں بھگو کر کسی دوسرے پہاڑ پر چلی گئی تھی۔ پانی میں چھت کی اولتیوں سے نکلی گھاس چمک رہی تھی۔ اناجی کے گھر ایک چھوٹی پگڈنڈی اوپر جاتی تھی جس کے دونوں اور بانج کے پیڑ لگے تھے۔ اوپر جاتے ہوئے وہ سنتری سے دکھائی دیتے تھے اور لوٹتے ہوئے جب رات ہو جاتی تھی تو وہ سنیاسیوں میں بدل جاتے تھے۔

پگڈنڈی ختم ہوتے ہی ایک چوڑی چوکوری چوکی آتی تھی جہاں اب بھی دو لمبے ترازو ٹانگنے والا بانس دو پیڑوں کے بیچ لگا تھا... انگریزوں کے زمانے میں یہ چنگی خانہ رہی ہوگی۔ نیچے گاؤں کے لوگ جب اوپر شہر آتے ہوں گے تو یہیں اپنا سامان تلوا کر چنگی دیتے تھے۔ ترازو اب نہیں تھا، لیکن بانس اب بھی لگا تھا اور چوکیدار کی وہ کٹیا بھی وہیں تھی جہاں کبھی سرکاری افسر بیٹھتے ہوں گے۔

گرمی کی دوپہر میں کبھی کبھی ٹہلتے ہوئے میں گھڑی دو گھڑی سانس لینے وہاں بیٹھ جاتا تھا۔

Scanned with CamScanner

بجری بھی بہت ٹھنڈ ہوتی تھی۔ پیچھے پہاڑی سوتا بہتا تھا، جس کی جھر جھر سنائی دیتی تھی... چنگی کی چوکی کے نیچے سمٹری کا میدان تھا، پتھر کی دیوار اور چیڑ کے پیڑوں سے گھرا ہوا... وہاں سے گزرتے ہوئے مجھے ہمیشہ مسز مہرا کا دھیان آجاتا تھا، جیسے میں انھیں اکیلا پیچھے چھوڑ کر اناجی کے گھر جا رہا ہوں۔ میرے قدم اپنے آپ تیز ہو جاتے۔ بارش کے چھینٹوں سے اپنے کو بچاتا ہوا میں چڑھائی پار کر جاتا جو اناجی کے گھر کے فینس پر آکر کنٹونمنٹ کی سڑک میں بدل جاتی... اور میں پھاٹک کھول کر سیدھا اپنے کو اس باغ میں پاتا جہاں سے اناجی کے باغ کی سیما شروع ہوتی تھی...

کچھ دیر تک میں ان کے پھاٹک کے آگے کھڑا رہا۔ چھت کی چمنی سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ پھاٹک پر ہری جھنڈی لہرا رہی تھی، کچھ ویسے ہی جیسے پہاڑی لوگ مندروں پر اپنی کن مرادوں کی جھنڈیاں لگا دیتے ہیں۔ پہلی بار جب اناجی کے گھر آیا تھا تو اسے دیکھ کر میں اچرج میں پڑ گیا تھا۔ سوچا، شاید یہ جرمن لوگوں کا کوئی ٹوٹکا رہا ہو، شیطان آتماؤں کو اپنے گھر سے دور بھگانے کا... بعد میں پتا چلا، ایسا کچھ نہیں ہے... ان کے گھر کے دروازے اور پھاٹک کے بیچ کافی اونچی کھڑی چڑھائی تھی... وہ نہیں چاہتی تھیں کہ جب وہ گھر میں نہ ہوں تو ان کے مہمان اتنی دور چل کر آئیں اور نراش ہو کر لوٹ جائیں... ہری جھنڈی سگنل تھا، پریت آتماؤں کو بھگانے کا نہیں، آتی آتماؤں یعنی اپنے لوگوں کو بلانے کا...

کیا میں ان 'آتماؤں' میں شامل تھا؟ پائیدان پر جوتے رگڑتے ہوئے ایک گہرے شک نے مجھے جکڑ لیا۔ ان سے اکیلے ملتے ہوئے مجھے ڈر سا لگتا تھا... جیسے میں کسی ایسے پانی میں کودنے جا رہا ہوں جو اتھلا ہونے پر بھی ہڈی پسلی توڑ دے گا، اور اگر گہرا ہوگا تو اتنا بھی پتا نہیں چلے گا، میں کتنا نیچے ہوں...

کیا اس لیے کہ وہ بلیک فاریسٹ سے آئی تھیں؟ تبھی وہ جرمن اتنی نہیں جتنی 'بن دیوی' جیسی جان پڑتی تھیں... سفید بال، نیلی صاف آنکھیں، جن کے نیچے عمر کی جھریاں پھیلی تھیں، پر عمر کا کوئی پتا نہیں چلتا تھا۔ وہ برسوں کسی راجہ کی ریاست میں گورنس بن کر رہی تھیں، یہ میرا اندازہ تھا، وشواس نہیں۔ وشواس تبھی ہوتا ہے جب کوئی اپنے بارے میں بتاتا ہے (اور تب بھی پورا نہیں، جیسا کہ میرا

صاحب کی آپ بیتی سن کر لگتا تھا)۔ اما جی کبھی اپنی طرف سے کچھ نہیں بتاتی تھیں۔ وہ بولتی تھیں تو اپنی رو میں بہنے لگتیں۔ ان کے جیون کی گھٹنائیں پانی پر بہتے تنکوں کی طرح آتی تھیں۔ اکا دکا جو کنارے پر لگ جاتیں وہ پکڑ میں آ جاتیں، باقی بہتی دھارا میں بہ جاتیں۔

جھنڈی کو تہ دیکھتا تو پتا بھی نہ چلتا کہ وہ گھر میں ہی ہیں۔ آگ جلا کر بیٹھی ہوں گی، اسی لیے تو چمنی سے دھواں باہر نکل رہا تھا۔ دروازہ کھٹکھٹایا تو بھیتر غرانے کی آواز سنائی دی... میں ٹھٹک گیا۔ دوسرے لمحے پسکی پونچھ ہلاتا مجھ پر کود رہا تھا۔ نرنجن بابو صوفے پر بیٹھے تھے۔ ان کی مسکراہٹ آنکھوں سے اتر کر ان کی ڈاڑھی سے کھیل رہی تھی۔

سو یہ تھا اما جی کا سرپرائز، جس کی میں نے کلپنا بھی نہیں کی تھی۔

''آپ کب آئے؟''

''ایک ہفتہ پہلے...'' ان کی جگہ اما جی نے کہا۔ ''ذرا ان سے پوچھیے، اتنے دن کہاں رہے؟''

نرنجن بابو کو دیکھ کر میرا من اتنا ہی بے چین ہو جاتا تھا جتنے وہ شانت اور بے نیاز دکھائی دیتے تھے۔ اما جی کی کاٹیج سے دو کلومیٹر اوپر نرنجن بابو کا سیبوں کا باغیچہ تھا... مئی کا مہینہ شروع ہوتے ہی وہ آ جاتے تھے اور نومبر کے آخری دنوں تک رہتے تھے۔ لیکن اس بار انھیں دیر ہو گئی تھی... صرف ان کے مالی سے ان کی خبریں ملتی رہتی تھیں... جب میں نے انھیں پہلی بار دیکھا تھا تو وہ ہیٹ پہنے ہوئے کوئی بدیسی سیلانی جان پڑے تھے... آدھے ہپی، آدھے ارسٹوکریٹ... ان کی اور بھی خوبیاں تھیں جو بعد میں پتا چلیں۔

پسکی اب میرے پیروں پر لوٹ رہا تھا۔

''اما جی سے پتا چلا، تم اب بھی یہیں ہو؟'' نرنجن بابو کے لہجے میں ہلکا سا مذاق تھا... لیکن خوشی نے اسے اجلا بنا دیا تھا۔ کیا انھیں یاد ہے، پچھلے سال بھی انھوں نے یہی سوال پوچھا تھا— اتنے ہی تعجب سے... جتنا انھیں آج ہے۔

اما جی کی پہاڑن نوکرانی جمنا چائے کی ٹرے لے کر آئی۔ کیک کی خوشبو سے پسکی کی لال زبان باہر نکل آئی اور میں باہر دیکھنے لگا... اما جی اپنی اونی اسکرٹ میں کھڑی، ہم سب کو ایک طنز بھرے انداز میں دیکھ رہی تھیں۔

''آپ آتے نہیں... میں نے سوچا، انھیں دیکھنے ضرور آئیں گے۔'' انھوں نے زنجن بابو کی اور دیکھا جیسے اپنا غصہ ان پر نکال رہی ہوں۔ ''مہرا صاحب آج کل اپنی بایوگرافی انھیں ڈکٹیٹ کروا رہے ہیں... آپ اس میں نہیں ہیں؟''

زنجن بابو، جو اپنی ڈاڑھی کی آڑ میں پائپ سلگانے کی کوشش کر رہے تھے، اچانک ٹھٹک گئے۔ مسکرا کر کہا، ''میں آخر کیوں؟''

''سب لوگ ہیں... تو آپ نہیں ہوں گے؟''

''یہ تو پڑھ کر ہی پتا چلے گا... کیا وہ اسے کہیں پبلش کروائیں گے؟''

وہ دونوں میری طرف دیکھ رہے تھے جیسے مہرا صاحب کے گزرے جیون کے آرکائیوز کی چابی میرے پاس ہو۔

میں کیا جواب دیتا... سوا ہنسنے کے! وہ اس طرح میری نوکری کو نہیں چھین سکتے تھے۔ پر حملہ کرنا چاہتے تھے۔

انگیٹھی کی لکڑیاں اب دھو دھو کرتی ہوئی سلگ رہی تھیں اور ان کی لپٹوں کی چھایا دیواروں پر سانپوں کی طرح ڈول رہی تھی۔ زنجن بابو، جواب تک چپ بیٹھے تھے، جیسے اپنے ہی سوالوں سے چھٹکارا پانے کے لیے بولے، ''میرے گھر کب آنا ہوگا؟ تم لوگوں نے میرا گیسٹ ہاؤس بھی نہیں دیکھا۔''

''کیا وہ تیار ہو گیا؟'' ااجی نے ان کی اور دیکھا۔

''بس ملبہ صاف کرنا باقی ہے... پچھلی بار تم آئے تھے تب تو اس کا ایک ونگ ہی بنا تھا!''

بات پٹڑی سے اتر کر پھر پٹڑی پر چلی آئی تھی۔ ایسے ہی ہوتا تھا۔ زنجن بابو جب ہمارے بیچ بیابان میں اچانک نازل ہو جاتے تھے تو ہریالی بھی دکھائی دیتی تھی اور حرارت بھی... ہم سب کا ٹمپریچر ایک ڈیڑھ ڈگری اوپر ہو جاتا تھا... ااجی کچھ زیادہ ہی جوش میں دکھائی دیتی تھیں... جس کی بو بسکی کو مل جاتی تھی اور وہ بہکایا سا بات بات پر بھونکنے لگتا تھا۔ لیکن زنجن بابو پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا تھا۔ وہ بے نیاز ہو کر اپنی جگہ پر بیٹھے رہتے تھے۔ ہمیں لگتا تھا، وہ نیچے کی دنیا سے کوئی گھٹنا اپنے ساتھ لائے ہیں، حالانکہ وہ کچھ کہتے نہیں تھے۔ ہمارے بیچ ان کا ہونا ہی ایک گھٹنا بن جاتا تھا۔ وہ کبھی کالج میں میرے ساتھ رہے تھے... اتنی اونچائی پر ان کو دیکھتے ہوئے میں یہ بھی بھول جاتا تھا۔

Scanned with CamScanner

انھوں نے پائپ منھ سے نکالی، کچھ لمحے آگ کی طرف دیکھتے رہے۔ ''مہرا صاحب کیسے ہیں؟''

''تم ان سے ملے نہیں؟'' اما جی نے کہا۔ ''ملو گے تو پہچانو گے نہیں... ہر شام یہ دونوں پتا نہیں کون سے انجان استھانوں کی کھوج میں نکل جاتے ہیں... کیوں، ہنستے کیوں ہو؟ میں کیا غلط کہہ رہی ہوں؟'' انھوں نے غصے سے میری طرف دیکھا۔

''مجھے کچھ یاد آگیا تھا،'' میں نے کہا۔

''کیا یاد آگیا تھا تمھیں؟''

''کہتے تھے... جب بنیا دنیا میں آئی، وہ دریا کے کنارے پر بیٹھے تھے... پوسٹ مین پانی میں تیرتا ہوا ان کے لیے ٹیلیگرام لایا تھا۔''

''کیا تمھیں وہ ساری باتیں لکھواتے ہیں جو ان کے جیون میں ہوئی ہیں؟''

اما جی کی نیلی آنکھیں روشنی میں تیر رہی تھیں۔

''کتنا گھٹتا ہے، کتنا لکھواتے ہیں، یہ میں کیسے کہہ سکتا ہوں؟''

''ہو سکتا ہے وہ لکھواتے سے ایک دوسری زندگی جی رہے ہوں،'' نرنجن بابو نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''دوسری زندگی... کیا مطلب؟'' اما جی نے انھیں غصے میں دیکھا۔

''وہ جو ہم جیتے نہیں لیکن اپنے بھیتر لے کر چلتے ہیں،'' نرنجن بابو نے کہا۔

کچھ دیر تک کوئی کچھ نہیں بولا، پھر اما جی نے میری اور دیکھا۔ ''میں ان کی بات تو سمجھ سکتی ہوں... ان کی عمر میں کون شخص خبطی نہیں ہو جاتا... مگر تم، تمھارا مجھے سمجھ میں نہیں آتا... وہ کون سی زندگی جی رہے ہیں، مجھے نہیں معلوم، لیکن تم اپنی زندگی ضرور برباد کر رہے ہو۔'' انھوں نے میرے کندھے کو تھپتھپایا اور اٹھ کھڑی ہوئیں۔

پلیٹ میں پیسٹری ختم ہو چکی تھی اور آگ کی لکڑیاں مرجھانے لگی تھیں۔ اما جی ایسی ہی گھڑی کا انتظار کرتی تھیں۔ کیا یہ ان کی جرمن عادت تھی کہ جب تک اندھیرا نہ ہو جائے، ہمیں انتظار میں لٹکائے رکھنا چاہتی تھیں؟

''کیا لیں گے؟'' وہ ایک سنتری کی طرح اٹھ کھڑی ہوئیں جیسے اچانک اپنی ڈیوٹی کی یاد آ

Scanned with CamScanner

جاتی ہے۔" آج تو آپ کے آنے کی خوشی منانی ہے۔"

اما جی بھیتر گئیں اور ایک کالے رنگ کی چوکور بوتل لے آئیں جسے میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا حالانکہ میں نے ان کے گھر طرح طرح کی شرابیں چکھی تھیں۔ اس بوتل کی بناوٹ کچھ انوکھی تھی... وہ ایک کتاب کی شکل میں بند تھی اور اس کی اسپائن پر اس کا نام لکھا تھا جو دور سے پڑھا نہیں جاتا تھا۔ واٹر آف لائف... سنجیونی جل...

"سرپرائز..." انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تم کیا نرنجن بابو کو سرپرائز سمجھے تھے؟ وہ تو آتے ہی رہتے ہیں، لیکن یہ تم نے کبھی نہ دیکھی ہوگی۔"

کٹ گلاس کے تین ننھے گلاس۔ جب وہ اوپر تک لبالب بھر گئے تو انھوں نے اپنے گلاس کو اوپر اٹھایا۔ "نرنجن بابو، آپ کے آنے کی خوشی میں!"

"نہیں، ان سب کے لیے جو یہاں ہیں۔"

"اور ان کے لیے بھی جو یہاں نہیں ہیں،" اما جی نے کہا۔

سب نے اپنے گلاس اوپر اٹھائے تو میری نگاہیں اما جی کے چہرے پر ٹک گئیں... کیا مطلب تھا ان کا؟ میں نے پوچھا نہیں، لیکن وہ سمجھ گئیں۔ ان کے چہرے پر ہلکی سی چھایا اتر آئی۔ انھوں نے ایک لمبا گھونٹ لیا اور میری طرف دیکھا...

"کیا وہ کبھی دیوا کی بات کرتے ہیں؟"

"مسز مہرا کی؟" میں نے کچھ چونک کر انھیں دیکھا۔ "کبھی کبھی تو کرتے ہیں لیکن..." میں رک گیا۔ سمجھ میں نہیں آیا وہ کیا جاننا چاہتی ہیں۔

"لیکن کیا؟" مجھے لگا جیسے نرنجن بابو کی آنکھیں مجھ پر اٹھی ہیں۔

"کبھی کبھی انھیں یاد نہیں رہتا کہ وہ نہیں ہیں،" میں نے کچھ جھجکتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب؟" اندھیرے میں ان کی آواز کی چمک دکھائی دی۔ "کیا وہ اُسے اتنی جلدی بھول گئے ہیں؟"

"نہیں نہیں!" میں نے ان کی غلطی کو سدھارا۔ "وہ بھول جاتے ہیں کہ اب وہ اس دنیا میں نہیں ہیں۔"

کچھ دیر ہم چپ بیٹھے رہے۔ نرنجن بابو نے ماچس جلائی لیکن پائپ کو جلانے کی بجائے اسے بجھ جانے دیا... اور بجھی ہوئی تیلی کو فائر پلیس میں پھینک دیا جہاں وہ دوبارہ سے جلنے لگی۔

''کیا وہ اسے اب بھی جیوت لگتے ہیں؟''

''نہیں... جب وہ مجھے نوٹس لکھواتے ہیں... تو مجھے لگتا ہے، وہ جیسے کہیں دوسرے کمرے میں بیٹھی ہیں اور وہ اپنی آپ بیتی مجھے نہیں، انھیں سنا رہے ہیں۔''

کچھ دیر تک باہر لان سے مسلسل بے چین کرنے والا جھینگروں کا الاپ سنائی دیتا رہا۔

''وہ بھی جب یہاں آتی تھیں تو اسی کرسی پر بیٹھتی تھیں جس پر نرنجن بابو بیٹھے ہیں۔''

اتا جی نے ڈن ہل پیکٹ سے ایک سگریٹ نکالی جو وہ ہمیشہ دوسرے گلاس کے شروع ہونے پر لیتی تھیں۔ نرنجن بابو نے جھک کر ان کی سگریٹ سلگائی اور وہ آرام سے کرسی کے کشن پر پیٹھ لگا کر بیٹھ گئیں۔

''اتنی خوبصورت عورت میں نے بہت کم دیکھی ہے... جب وہ مہرا صاحب کے ساتھ پہلی بار آئی تھیں تو میں نے سمجھا تھا وہ ان کی بیٹی ہیں۔ بعد میں پتا چلا... وہ ان کی دوسری پتنی تھیں۔ آپ کو تو معلوم ہوگا؟''

''کچھ رشتے اوپر سے دکھائی نہیں دیتے،'' نرنجن بابو نے کہا۔ ''میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ تیا ان کی کوئی لگتی ہے۔''

''آپ کیا سوچتے تھے؟''

''میں نے انھیں مہرا صاحب کے گھر میں دیکھا تو سوچا گرمیوں کے لیے آئی ہیں... سمر ٹورسٹ کی طرح۔ وہ ان دنوں اسی کمرے میں رہتی تھیں جس میں آپ رہتے ہیں۔'' انھوں نے میری اور دیکھا۔

مجھے لگا، ہم سب کہیں نہ کہیں ان جگہوں پر بیٹھے تھے جن پر ہمارا کوئی ادھیکار نہیں...

اتا جی نے ہمارے گلاس بھرنے کے لیے اپنی کتاب نما بوتل اٹھائی تو نرنجن بابو نے ہاتھ آگے کر دیا...

''اب نہیں... مجھے جانا ہے۔''

''ارے، آپ کا آنا ہی تو سیلی بریٹ کر رہے ہیں... آتی جلدی کیا ہے؟''

انگیٹھی کی آگ بجھ چلی تھی لیکن اما جی نے جو آگ گلاس میں ڈالی تھی وہ کہیں جسم کے اندر اب بھی سلگ رہی تھی۔

''کیا انھیں اپنی بیماری کے بارے میں معلوم تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''معلوم نہیں ہوگا؟'' اما جی کے سفید چہرے پر یاد کی پرانی چھایا اتر آئی۔ ''ایک بار اکیلے میرے گھر آئی تھیں... تب ان کا پہلا آپریشن ہوا تھا۔ پھر اچانک مجھ سے پوچھا، اما، تمھیں معلوم ہے میں کرسچین ہوں؟ میں نے ہنس کر کہا، اس سے کیا فرق پڑتا ہے... فرق پڑتا ہے، انھوں نے کہا۔ مجھے کبھی کبھی ڈر لگتا ہے... کرسچین ہونے سے۔ میں نے پوچھا نہیں... وہ بولیں، اگر انھوں نے مجھے قبر میں دفنا دیا اور میرے جیتے جان بچی ہو؟ میں چاہتی ہوں کہ مجھے زمین میں گاڑنے سے پہلے تھوڑا سا جلایا جائے تاکہ اگر زندہ ہوں تو تھوڑی سی جلن لگتے ہی اٹھ کھڑی ہوں۔ ایک بار قبر کے اندر گئی تو کوئی میری آواز بھی نہیں سن سکے گا... کیسی پاگل تھی...!''

''آپ کو کیا لگتا ہے؟''

''میری زمین ہوتی تو کہتی، زمین سے کوئی آواز باہر آتی ہے کیا؟ آتی ہوگی تو بھی کون سنتا ہوگا؟ کس میں اتنی دھیرج ہے؟... میں کتنی بار سمٹری کے پاس سے گزر جاتی ہوں اور یاد بھی نہیں رہتا کہ وہ وہاں کہیں پیڑوں کے پیچھے لیٹی ہے... میں ہمیشہ دیوا سے کہتی تھی کہ وہ بہت قسمت والی ہے... کم سے کم اپنی دھرتی کے پیچھے تو لیٹی ہے...'' اما جی نے اپنی سگریٹ ایش ٹرے میں مسل دی... اور اس بار کیول نرنجن بابو کے گلاس کو دیکھا۔ وہ ابھی بھرا تھا... انھوں نے پھر بوتل میز پر رکھ دی۔

''کیا کبھی آپ کا من نہیں ہوتا گھر لوٹنے کا؟''

''من؟'' وہ مجھے دیکھ کر ہنسنے لگیں۔ ''من کی بات میں نے مدت سے سننا بند کر دی... اس کی بات سنتی تو کیا آج آپ کے سامنے بیٹھی ہوتی... اس بیابان جنگل میں؟ نہیں، ان باتوں میں من ناکارہ رہ جاتا ہے...''

''میں جب آج آپ کے گھر آ رہا تھا...'' نرنجن بابو نے کہا، ''تو سوچ کر اچانک بہت خوشی ہوئی کہ میں کتنی مدت کے بعد اس شہر میں کیوں نہ لوٹوں، ہمیشہ آپ کے پاس آ سکتا ہوں... آپ

ہمیشہ یہاں رہیں گی... جب میں ہے پور جاتا ہوں تو وہاں ایسا نہیں لگتا... حالانکہ وہاں میرا پورا پریوار ہے — میری پتنی، بچے، سب...."

"یہ میرے لیے نہیں ہے..." El جی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "یہ جگہ کی بات ہے۔ میں جب بھی سیر کے بعد اپنی کاٹیج کے دروازے کے آگے کھڑی ہوتی ہوں تو مجھے بھی یہی لگتا ہے کہ کوئی بھیتر ہے جس کے پاس میں جا سکتی ہوں... حالانکہ بھیتر سارے کمرے خالی رہتے ہیں... کیا کبھی کبھی گھر آدمیوں کی جگہ نہیں لے لیتے؟"

میرے گلاس میں برانڈی ڈالتے ہوئے وہ اچانک ٹھٹک گئیں۔ میری طرف دیکھا۔ "تم نے پوچھا تھا تو کہتی ہوں کہ ہاں، میں گئی تھی، کولون میں جہاں میرے ماتا پتا رہتے تھے... وہ تب بھی جیوت تھے۔ لیکن ہمارا گھر — وہ کہیں نہیں تھا۔ پڑوس کے سارے مکان لڑائی میں ڈھے گئے تھے۔ اور تب مجھے پہلی بار پتا چلا کہ جن جگہوں پر ہم رہتے ہیں، اگر وہ نہ رہیں... تو اس میں رہنے والے لوگ، وہ تمھارے ماں باپ ہی کیوں نہ ہوں، بیگانے ہو جاتے ہیں... جیسے ان کی پہچان بھی کہیں اینٹوں کے ملبے میں دب جاتی ہو۔"

"لیکن یہاں اتنی دور، ہندوستان میں؟"

"ہندوستان آپ کے لیے ہوگا... میرے لیے تو یہ پہاڑی شہر ہی سب کچھ ہے۔ یہ میرا گھر ہے۔ آپ کا ہندوستان مجھے یہاں سے اتنا ہی دور لگتا ہے جتنا اپنا جرمنی۔"

میں ان کی اور دیکھتا رہا۔ وہ چپ چاپ سگریٹ پی رہی تھیں۔ آنکھیں باہر اندھیرے پر لگی تھیں۔ پیروں پر پشمی سویا پڑا تھا۔ کون تھیں وہ؟ ہم ان کے بارے میں کیا جانتے تھے؟ انھوں نے جیسے سب دیشوں کے جنجال سے چھٹکارا پا کر اپنی زمین پالی تھی... وہی زمین جس کے نیچے دیوا لیٹی تھیں؟

انھوں نے سر اٹھایا تو آنکھیں چمک رہی تھیں... جھریوں کے جالے پر ٹمٹماتی ہوئی مسکراہٹ چلی آئی۔

"جس سال میں یہاں آئی تھی... تم دونوں میں سے یہاں کوئی نہیں تھا... میں ایک بار سیر کرتے ہوئے جا رہی تھی تو مہرا صاحب دکھائی دیے۔ وہ پیدل جا رہے تھے اور ڈاکٹر سنگھ گھوڑے

Scanned with CamScanner

پر... مجھے دیکھ کر ڈاکٹر سنگھ گھوڑے سے نیچے اتر آئے اور کہنے لگے، گھوڑے پر بیٹھیے... ہم پیدل چلیں گے... لیکن میں تو آپ کو جانتی نہیں، میں نے کہا... کوئی بات نہیں... گھوڑا آپ کو جانتا ہے... اس کے باپ دادا جرمنی سے یہاں آئے تھے... دیکھیے، آپ کو کیسے دیکھ رہا ہے! کیا آپ وشواس کریں گے؟ اس روز میں سچ مچ ان کے گھوڑے پر بیٹھ کر ان کے ساتھ کلب گئی تھی... مجھے معلوم بھی نہیں تھا کہ اس اجاڑ بستی میں کوئی انگریزوں کے زمانے کی کلب بھی ہو سکتی ہے... بعد میں پتا چلا، وہ کئی دنوں تک مجھے جرمن جاسوس سمجھتے تھے، تبھی کلب کی لائبریری سے مجھے چن چن کر ڈٹیکٹو ناول دیتے تھے..."

زنجن بابو نے ہنس کر کہا، "میں اب بھی سمجھتا ہوں... یہاں کون آدمی ہے جس کے بھید آپ سے چھپے ہیں..."

اناجی نے ان کی اور دیکھا... وہ ہنس نہیں رہی تھیں... "آپ کے بارے میں نہیں... اچھا، زنجن بابو... آپ یہاں کس لیے آئے تھے؟ یونیورسٹی کی اتنی اچھی نوکری چھوڑ کر... کیا سیب کے باغ لگانے کے لیے؟"

"یہی سمجھ لیجیے۔"

"صرف یہی کارن تھا؟"

"ہر چیز کا کوئی کارن ہوتا ہے؟"

"مجھے معلوم ہے..." وہ شمبا کا مار کر ہنسنے لگیں۔ "لیکن میں بتاؤں گی نہیں۔"

ایسے موقعے پر وہ سچ مچ کوئی بوڑھی جادوگرنی جیسی دکھائی دیتی تھیں... پراچین جرمن جنگلی قبیلوں کی کوئی مہارانی، جس کے ذرا سے اشارے سے پورے جنگل کے چرند پرند، پیڑ پودے اور زمین کا ذرہ ذرہ ہلنے لگتا ہے...

میں حیرت زدہ ہو کر انھیں دیکھتا رہا۔ "میں نے کہا تھا نا، آپ کو سب کچھ معلوم ہے۔"

زنجن بابو اٹھ کھڑے ہوئے۔ "دیر ہو گئی، میں چلتا ہوں۔"

"ارے بیٹھیے،" اناجی نے اچانک فکرمند ہو کر کہا۔ "ابھی تو شام شروع ہوئی ہے... نائٹ از اسٹل ینگ، نہیں؟" انھوں نے حمایت کے لیے میری اور دیکھا۔

"آپ کب آئیں گی؟" زنجن بابو نے اپنی پائپ اور لائٹر میز سے اٹھایا... وہ اچانک اکھڑ

Scanned with CamScanner

سے گئے تھے۔

"اتنی چڑھائی بابا..." اتا جی نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "میں اب چل نہیں سکتی... ڈاکٹر سنگھ کو بھی بلا لو تو ان کے گھوڑے پر آ سکتی ہوں..."

"بیچارہ!" انھوں نے میری اور دیکھا۔ "تم ابھی بیٹھو گے؟"

"نہیں، میں بھی آتا ہوں۔" مجھے کوئی جلدی نہیں تھی لیکن نرنجن بابو جس طرح ہڑبڑا کر اٹھے تھے، اس کے بعد وہاں بیٹھنا ان کے تئیں وشواس گھات سا جان پڑا۔ میں نے اتا جی سے چھما مانگی اور باہر چلا آیا۔

نرنجن بابو کا رستہ اوپر جاتا تھا، مجھے نیچے اترنا تھا... لیکن کچھ دیر تک ہم سیدھی سڑک پر ساتھ چلنے لگے۔ اوپر تاروں کا جال بچھا تھا اور چاروں طرف ایک روپہلی سی روشنی پھیلی تھی جس کے پیچھے ہر چیز... مکان، پیڑ، جھاڑیاں... بھوتیلی پریت چھایا جیسی دکھائی دیتی تھی۔ نرنجن بابو کی چھایا بھی بہت ہی لمبی دکھائی دیتی اور میں سوچنے لگتا، اصلی زندگی میں جو آدمی اتنے ادھورے دکھائی دیتے ہیں ان کی چھایا ہمیشہ بہت ثابت اور سڈول دکھائی دیتی ہے، جیسے ہماری دیہہ وہاں کہیں مکمل بننے کا سپنا دیکھتی ہے... لیکن نرنجن بابو؟ وہ تو کہیں سے ٹوٹے دکھائی نہیں دیتے تھے... سال کے کچھ مہینے یہاں بتاتے تھے... پھر نیچے کی دنیا میں چلے جاتے تھے، جہاں ان کی پتنی تھیں۔ بڑی لڑکی دلّی کے کسی اخبار میں کام کرتی تھی... ایک لڑکا رڑکی کے انجینئرنگ کالج میں تھا۔ ایک بھرا پرا پریوار، ان کے سیب کے باغیچے کی طرح، جو ان کے بنا بھی پھل پھول رہا تھا...

کیا یہی ایک احساس تھا جو انھیں چھیلتا رہتا تھا؟

"تمھاری عمر کیا ہوگی؟" نرنجن بابو نے اچانک پوچھا، جیسے میرا خیال انھیں بھی چھو گیا ہو۔

"کیوں، کیوں پوچھتے ہیں؟"

"ایسے ہی... نہ بتانا چاہو تو رہنے دو۔"

"سینتیس سال۔"

"یہ تو زیادہ نہیں،" انھوں نے کہا اور پھر چلنے لگے۔

Scanned with CamScanner

سڑک کا آخری سرا دیواروں سے ڈھکا تھا اور ان پر جگنو منڈلا رہے تھے۔ جھینگر اچانک شانت ہو گئے تھے، تھک کر شاید سو گئے تھے۔ اسی لیے ہمیں ایک دوسرے کی پدچاپ اتنی صاف سنائی دے رہی تھی۔

"آپ نے میری عمر کے بارے میں کیوں پوچھا تھا؟"

"کوئی خاص وجہ نہیں تھی۔ صرف خیال آیا تھا۔" انھیں چلتے ہوئے بولنا کھرتا تھا اس لیے بولتے ہوئے کھڑے ہو جاتے تھے۔ سڑک اتنی سنکری تھی کہ ہم ایک ساتھ کھڑے نہیں ہو سکتے تھے... وہ آگے دیکھتے ہوئے بولتے تھے، میں پیچھے کھڑا ہوا سنتا تھا۔ اس سے ایسا کچھ بھرم ہوتا تھا کہ وہ اپنے سے بول رہے ہیں اور میں چوری چھپے انھیں سن رہا ہوں۔

"خیال کیسا؟" میں نے پوچھا۔

"یہاں سب لوگ اپنی زندگی کے آخری سرے پر آتے ہیں... تم شروع میں ہی آ گئے۔"

"شروع تو میرا بہت پہلے ختم ہو گیا۔" میں نے کہا۔

"کیا کہا؟" وہ کھڑے ہو گئے۔

"میں نے کہا، سینتیس سال کوئی شروعات ہے؟"

"کچھ لوگوں کی شروعات اسی عمر کے آس پاس ہوئی تھی... جیزس کرائسٹ، گوتم بدھ، وٹگنسٹائن..."

وہ پھر چلنے لگے۔ میں ان کے پیچھے پیچھے۔ اوس ٹپکنے لگی تھی، پتے چھو جاتے تو ہاتھ گیلے ہو کر لوٹ آتے تھے۔

"کیسا چل رہا ہے تمھارا کام؟"

"آپ کو تو معلوم ہے..."

"کیا ہر روز لکھواتے ہیں؟"

"نہیں، لکھواتے نہیں..." میں نے کہا "جب من کرتا ہے تو... میں بعد میں نوٹ کر لیتا ہوں۔"

"کیا یہ ان کی اچھا سے کرتے ہو یا اپنے شوق کے لیے؟"

"شروع میں کچھ بھی نہیں تھا... شروع میں جب یہاں آیا تھا تو مسز مہرا نے کہا تھا کہ وہ ہر شام

مجھ سے اتنی باتیں کرتے ہیں، میں لکھتا کیوں نہیں؟... اس سے ان کا وقت بھی کٹ جائے گا اور میرا من بھی بہل جائے گا۔"

"تمہارا من بہل جاتا ہے؟"

"ایک روشنی تو ہے... اُن کے جانے کے بعد اب اسے چھوڑنا ٹھیک نہیں لگتا۔"

اُن کے جانے کے بعد؟ مجھے لگا جیسے وہ ابھی ٹہلنے گئی ہیں۔ لوٹ کر پوچھیں گی، آج کتنا کام ہوا؟ ہم کیا آس پاس بھٹک کر ان ہی کے پاس اٹک جاتے ہیں... ماجی کی خالی کرسی کے سامنے؟

"نرنجن بابو، کیا آپ پڑھنا چاہیں گے؟"

وہ اچنبھے سے رک گئے۔ "کیا کہتے ہو؟ کیا پڑھنا ہے؟"

"وہی سب، جو مہرا صاحب لکھواتے ہیں؟"

"نہیں نہیں، یہ تم کیا کہتے ہو... میرا کوئی ادھیکار نہیں..."

"ایسا اس میں کچھ بھی نہیں جو صرف ان کا ہو... کبھی کبھی تو ان کی باتیں سنتے ہوئے لگتا ہے کہ وہ اپنی نہیں، کسی دوسرے کی زندگی کے بارے میں بتا رہے ہیں۔"

"کسی دوسرے کی زندگی... کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"میں جب اپنے کمرے میں لوٹ کر اپنے نوٹس لکھتا ہوں تو لگتا ہے، میں جیسے کوئی ناول پڑھ رہا ہوں۔"

"تمہارا مطلب ہے، وہ سب خیالی کتھا ہے؟"

"یہ میں کیسے کہہ سکتا ہوں۔ خیالی بھی ہو تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے... ہے تو وہ ان کی ہی کتھا۔"

"پری کتھا... فیری ٹیل... کپلنگ نے جنگل اسٹوریز لکھی تھیں... تم پہاڑوں کی پری کتھائیں لکھتے ہو۔ میرے ایک دوست ہیں... لیکھک ہیں۔ بہت سے ناول لکھے ہیں... ایک بار میں نے پوچھا، تم کیسے ایک کے بعد ایک ناول لکھ لیتے ہو؟ کہنے لگے، اپنی زندگی کی اُوب مٹانے کے لیے لکھتا ہوں، کوئی حرج ہے؟"

وہ کھڑے ہو گئے۔ ہم دیوداروں کے جھنڈ سے نکل آئے تھے... یہاں سے ان کی چڑھائی

Scanned with CamScanner

شروع ہوتی تھی، میری اترائی۔ بازار کی دکانیں بند تھیں۔ کہیں ہوٹل کے پیچھے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

''آپ چاہیں تو میں آپ کے ساتھ کچھ دور تک آسکتا ہوں... میری بھی سیر ہو جائے گی۔'' میں نے کہا۔

وہ کچھ ہچکچاتے سے کھڑے رہے۔ ''میں ابھی سیدھا گھر نہیں جارہا ہوں۔''

میں نے کچھ حیرت سے انھیں دیکھا۔ ''کیا ڈاکٹر صاحب کے یہاں جانا ہے؟''

ڈاکٹر سنگھ تھے جن کے گھر وہ جب چاہیں جا سکتے تھے...

''ان کے گھر نہیں، آج انھوں نے مجھے کلب کھانے پر بلایا ہے۔ چلو، تم بھی چلو۔ وہ تمھیں دیکھ کر خوش ہوں گے۔ میں جیسے تمھارے لیے سرپرائز تھا، تم ان کے لیے سرپرائز ہو سکتے ہو۔''

کوئی اور دن ہوتا تو میں چلا جاتا، لیکن آج ان کا پہلا دن تھا اور ڈاکٹر سنگھ ان کے پرانے دوست تھے۔ آج میں ان کے نجی ایکانت کے بیچ نہیں آنا چاہتا تھا۔ میں وہیں ان سے وداع لے کر نیچے شارٹ کٹ پگڈنڈی کی ڈھلان پر اترنے لگا۔

1.3

پیڑوں کے بیچ اس کی پگڑی دکھائی دی۔ وہ نیچے اتر رہا تھا۔ ہر موڑ پر تھوڑا سا بڑا ہو جاتا تھا۔ جب وہ پیڑوں کے جھرمٹ سے نکل کر باہر آتا تو اس کی بیلٹ پر اٹکا تانبے کا بِلّا دھوپ میں چمکنے لگتا۔ پچھلی کسی صدی میں ڈاکیے اسی طرح گھنٹی بجاتے ہوئے آتے ہوں گے۔ اب گھنٹی کی بجائے اس کی سیٹی تھی... اس کے پیلے دانتوں اور بھوری مونچھوں کے بیچ ایک لمبی سانس کی طرح باہر نکلتی ہوئی...

مجھے پتا بھی نہ چلا، وہ کب سے پھاٹک کے آگے کھڑا ہے۔

''آپ کی چٹھی ہے...'' ہیرا لال نے کچھ ایسے الجھے ہوئے انداز میں کہا جیسے چٹھی نہ ہو کر وہ کوئی سمن لایا ہے۔ وہ پہلی بار آیا تھا۔ اکثر وہ میرے گھر سے نیچے اتر کر مہرا صاحب کے گھر چلا جاتا تھا۔

''بھیتر آجاؤ، ہیرا لال۔ پھاٹک کھلا ہے۔''

اس نے ڈاک کا تھیلا پھاٹک کے پاس رکھ دیا۔ خاکی کاغذ میں لپٹا ایک پیکٹ تھا جسے لے کر

Scanned with CamScanner

وہ برآمدے کی سیڑھیوں میں چلا آیا تھا جہاں میں بیٹھا ہوا تھا۔

شاید میری طرح اسے بھی اچنبھا ہوا تھا کہ باہر کی دنیا سے میرے لیے کوئی سندیش آسکتا ہے۔

''کیا میں یہ اسٹامپ رکھ سکتا ہوں؟'' اس نے میری اور دیکھا۔ بھوری مونچھوں کے بیچ اس کی مسکراہٹ دکھائی دی۔

پیکٹ کلکتے کے ایک پبلشر نے بھیجا تھا... جس پر بہت سے ٹکٹ آڑی ترچھی ریکھاؤں میں لگے تھے۔

''کیا تم ٹکٹ جمع کرتے ہو؟'' میں نے ٹکٹ اکھاڑنے کی بجائے سارا ریپر نکال کر اسے دے دیا۔

''جی... میرا صاحب نے ایک البم دی ہے... اسی میں چپکاتا ہوں۔''

ہیرالال کی آنکھیں کتاب پر لگی تھیں جو ریپر سے باہر آکر دھوپ میں ننگ دھڑنگ چمک رہی تھی۔ کور پر ایک قدیم دیوتا کی سیندوری آنکھیں کہیں بہت دور افق پر لگی تھیں۔

''کیا میں دیکھ سکتا ہوں؟''

میں نے کتاب اسے دے دی۔ وہ وہیں سیڑھیوں پر بیٹھ گیا اور تصویریں دیکھنے لگا۔ کلکتہ کا وہ سیکنڈ ہینڈ بک سیلر مجھے اکثر ایسی کتابیں بھیجا کرتا تھا جن میں اسے معلوم تھا میری دلچسپی ہے... جو مجھے پسند آجاتیں، میں انھیں اپنے پاس رکھ لیتا، باقی پڑھ کر واپس بھیج دیتا تھا۔ وہ مجھ سے یہ بھی جاننا چاہتا تھا کہ کون کتاب کتنی پرانی اور نایاب ہے جسے اونچے داموں پر بیچا جا سکے۔

''آپ کیا کام کرتے ہیں بابو جی؟'' ہیرالال پوسٹ مین نے اس دیوتا سے دھیان ہٹا کر میری اور دیکھا... جیسے تین ہزار برس پہلے کے دیوتا کو دیکھ کر اسے میری یاد آگئی ہو۔

''صاحب کا کام کرتا ہوں۔''

''ہمارے صاحب کا؟'' اس نے مہرا صاحب کی کاٹیج کی طرف اشارہ کیا جو دھوپ میں شانت اور ساکت چمک رہی تھی۔ ''کیوں، انھوں نے ہی آپ کو بلایا ہے؟''

''نہیں ہیرالال، بلایا انھوں نے نہیں تھا، لیکن اب میں یہاں ہوں۔ جب تک چاہیں گے، یہیں رہوں گا۔''

''ٹھیک ہے، میں بھی یہی سوچتا تھا۔'' اس نے سر ہلایا۔ ''اس اجاڑ میں یہاں اور کون آکر رہ

Scanned with CamScanner

سکتا ہے!''

اس نے کتاب مجھے واپس کر دی۔ پیٹھ کا بکسوا سیدھا کیا۔ ''بابو جی، آپ کے بال بچے؟''

''ابھی تو کچھ بھی نہیں، ہیرالال!''

اس نے سیانے کی طرح اپنا سر ہلایا، جیسے یہ بھی ٹھیک ہے۔ سیٹی بجانے کے لیے ہونٹ آدھے گولائی میں کھولے لیکن پھر کچھ سوچ کر انھیں کھلا چھوڑ دیا، جن کے بیچ بیڑی سے سنے دانت دکھائی دیے۔ ''آپ کی ایک چٹھی بھی ہے!'' اچانک اسے یاد آیا۔ اس نے ایک لفافہ میرے آگے کر دیا۔ ''پیکٹ کے ساتھ یہ بھی آئی تھی۔''

میری آنکھیں پتے پر پڑیں۔ پتا ٹھیک تھا، نام بھی میرا ہی تھا، صرف نیلے اکشروں کی لکھاوٹ انجانی تھی۔

''ہیرالال، چائے پیو گے؟''

وہ ٹھٹک گیا۔ ''کیا آپ بنائیں گے؟''

''ہاں، بس کچھ دیر میں تیار ہو جائے گی۔''

''نہیں، آج نہیں، میں پھر کبھی آؤں گا...''

چٹھی مہرا صاحب کی بیٹی تیا کی تھی۔ مجھ سے مہرا صاحب کے بارے میں پوچھا تھا۔ کوئی چنتا کی بات تو نہیں ہے؟ کچھ بھی ہو، میں انھیں لکھنا نہ بھولوں... اور اگر ہر مہینے ان کی صحت کے بارے میں ایک چھوٹی سی رپورٹ بھیج سکوں تو وہ ممنون ہوں گی۔ ویسے وہ خود کرسمس کی چھٹیوں میں آنے کی کوشش کریں گی، اگر اسپتال میں کوئی ایمرجنسی نہ آن پڑی۔

صرف سترہ لائنیں، میں نے گنی تھیں... پھر ان کا نام... سرکاری اسپتال کے پیڈ پر ہی یہ سطریں ہڑبڑی میں لکھی گئی تھیں... میں کچھ اچنبھے میں پڑ گیا۔ انھیں معلوم تھا میں یہاں ہوں، ان کے پتا کے پاس... پھر اچانک اتنی چنتا کیوں؟ پریشانی میں بھیگے اکشروں پر ان کا چہرہ ڈبڈبا گیا۔

میں نے انھیں صرف دو بار دیکھا تھا — ایک بار سمٹری میں، جب میں ان کے پیچھے کھڑا تھا، اور وہ مہرا صاحب کا ہاتھ پکڑ کر تابوت کو قبر میں لے جائے جاتے ہوئے دیکھ رہی تھیں، اور دوسری بار سرسا گاؤں میں، دلی سے آتے ہوئے جہاں میں صرف ایک گھنٹہ ٹھہرا تھا۔

Scanned with CamScanner

وہ بھی کیسی ملاقات تھی! مہرا صاحب نے مجھے ان سے کچھ دوائیں لانے کے لیے لکھا تھا۔ میں ان سے ٹھیک سے مل بھی نہیں سکا تھا۔ سیدھا بس اسٹیشن سے ان کے اسپتال گیا تھا۔ وہاں پتا چلا کہ وہ پاس والے گاؤں کی کسی ڈسپنسری سے دوائیاں لینے گئی ہیں۔ لمبے انتظار کے بعد میں آخری بس پکڑنے والا ہی تھا کہ گیٹ کے سامنے اسپتال کی وین میں وہ دکھائی دیں۔

وین کی سیٹ پر ان کے دھوپ میں تپے چہرے کی تھکی سی مسکان میں صرف ایک جھلک ہی تھی، جو سمٹری میں میرے آگے اپنے کو ہوا سے بچاتے، آنکھوں کو پلو سے ڈھکے کھڑی تھیں۔ میں نے جلدی سے ان سے دوائیں لیں اور پھلوں اور پیسٹری کا لفافہ... جو مہرا صاحب کے لیے تھا۔ کیا میں کھانے کے لیے رک نہیں سکتا، وہ اسپتال کی کینٹین میں ہی لنچ لینے جا رہی تھیں، انھوں نے پوچھا۔ جب میں نے انھیں بتایا کہ میری آخری بس بیس منٹ میں ہی چھوٹنے والی ہے تو پھر شاید میرے چہرے کو دیکھ کر ہنس دیں۔ ''وہ آپ کے انتظار میں ہوں گے!''

''آپ کب آئیں گی؟'' میں نے پوچھا۔

''ابھی کچھ معلوم نہیں، مانسون کے موسم میں یہاں بیماریاں پھیلتی ہیں۔ ستمبر میں ہو سکا تو... میں چٹھی لکھوں گی۔ چلیے، میں آگے سے آپ کو بس اسٹینڈ تک چھوڑ دیتی ہوں۔''

وہ مجھے اپنی وین میں کاٹھ گودام تک لے آئی تھیں... وہیں کے بس اسٹیشن پر انھوں نے مجھے چھوڑا تھا۔ جب تک بس چھوٹ نہیں گئی تھی، وہ وہیں باہر کھڑی رہیں، چھوٹے قصباتی شہر کے اس اونگھتے، دھوپ میں چمکتے ہوئے اسٹیشن پر...

اب سوچتا ہوں تو اچنبھا ہوتا ہے کہ انھوں نے اس دن سمٹری والی ملاقات کا ذکر نہیں کیا تھا، جب وہ میرے آگے کھڑی تھیں، کھلی ہوئی قبر کے سامنے... اور ان کی ماں دھیرے... دھیرے... نیچے جا رہی تھیں... کیا وہ اس کے بارے میں یاد کرنا نہیں چاہتی تھیں... یا بھول گئی تھیں کہ میں بھی وہاں کھڑا تھا؟

وہ بھی کوئی دن تھا! پتا نہیں چلا، کتنا سے بیت گیا، ہوا کی طرح... لگاتار زمین کے نیچے، اندھیرے میں۔ انھیں اب تو کیا ڈر لگتا ہوگا؟

Scanned with CamScanner

میں شاید سو گیا۔ پہاڑی دھوپ کی السائی نیند۔ کچھ بھی سنائی نہیں دیتا... پیروں کی آواز پاس آئی تو آنکھ کھلی۔ سامنے مرلی دھر۔ مونچھوں میں مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

"صاحب نے بلایا ہے۔"

"اس وقت؟"

ایسا کم ہوتا تھا۔ صبح وہ شاید ہی کبھی بلاتے تھے، جیسے پچھلی رات کے قصوں کا دن کی روشنی سے کوئی رشتہ نہیں تھا۔ وہ انھیں میری آنکھوں میں نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ باڑھ کا پانی صبح ہوتے ہی اتر جاتا تھا۔

پھر آج کیوں؟

بھیتر کے دروازے بند تھے، اس لیے میں باہر برآمدے ہی میں بیٹھ گیا۔ بنگلے کے پاس دیوداروں کی قطار ترچھی لائن میں اٹھ آئی تھی۔ بھیتر سناٹا تھا۔ اکیلے میں کیا کرتے ہوں گے؟ کوئی ایسے اعتقاد والے بھی نہیں کہ پوجا پاٹھ کرتے ہوں۔ ایشور، موت، پنر جنم... کبھی تو سوچتے ہوں گے؟ شاید سوچتے ہوں... مجھ سے کبھی چرچا نہیں کرتے تھے۔ باؤنڈری کے باہر چھوڑ دیتے ہوں گے، جیسے کچھ گھروں کے باہر پرانی چٹھیاں پھینکی جاتی ہیں، جن میں گھر کے بھید اور من کی پیڑائیں دبی ہوتی ہیں۔ ایک دن کوئی آتا ہے، سب سمیٹ کر لے جاتا ہے، کچھ بھی بچا نہیں رہتا۔ بڑھتی عمر کے خالی پچھواڑے...

پتا بھی نہیں چلا، کب پیچھے سے آئے، میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ میں کھڑا ہو گیا، وہ بیٹھ گئے۔ مجھے بھی پاس بیٹھا لیا۔ ان کی چھاتی سے کھنکھارتی سی آواز آ رہی تھی۔ جب سانس لیتے تھے تو لگتا تھا، پھیپھڑوں کے بھیتر سے کوئی سیٹی بجا رہا ہو۔

"تم آج کہیں باہر نکلو گے؟"

"آپ بتایئے..."

"اگر نکلو تو یہ چٹھی رجسٹر کروا سکتے ہو؟"

انھوں نے مجھے ایک لمبا چوکور لفافہ ہاتھ میں پکڑا دیا، جیسے سرکاری دفتروں کے ہوتے ہیں... اوپر سے بھاری، بھیتر سے بھرا ہوا۔ مجھے کچھ اچنبھا ہوا... یہ کام تو وہ مرلی دھر سے بھی کروا سکتے تھے۔ کہا

کچھ نہیں۔ لفافہ لے کر اٹھنے لگا تو چہرہ پاس سے دکھائی دیا... ڈاڑھی نہیں بنائی تھی، سفید بال روئی کے دھاگوں سے ہونٹوں پر، ٹھوڑی پر، گالوں پر اگ آئے تھے۔ آنکھوں میں پیلی سی روشنی تیر رہی تھی۔

میں نے دھیرے سے کہا: "ڈاکٹر سنگھ سے کہہ آؤں؟"

"کس لیے؟" انھوں نے کہا۔

"وہ دیکھ جائیں گے... دوسرا مہینہ ہو گیا۔"

مہینے بعد ڈاکٹر سنگھ چیک اپ کے لیے آتے تھے، مسز مہرا کے زمانے سے یہ قاعدہ چلا آتا تھا۔

"انھیں پریشان کرنے کا کیا فائدہ؟ جب انھیں سے ملے گا، وہ خود آ جائیں گے۔"

وہ جانے لگے تو میں نے کہا: "تیا کی چٹھی آئی ہے..."

"تیا کی؟" وہ دروازے پر ٹھٹک گئے۔ "کیا لکھا ہے؟"

"آپ کے بارے میں پوچھا ہے..."

"میرے بارے میں...؟" ایک پھیکی سی ہنسی چہرے پر چلی آئی۔ ڈاڑھی نہیں بنائی تھی، شاید اسی لیے سفیدی کے بیچ چہرہ عجیب سا جان پڑتا تھا جیسے شیو کا صابن لگایا ہو اور اسے دھونا بھول گئے ہوں۔

"رات کو آؤ گے تو ساتھ لے آنا۔" کچھ اور نہیں پوچھا۔ دروازہ کھول کر بھیتر چلے گئے۔

میں کچھ دیر ان کا لفافہ ہاتھ میں لیے بند دروازے کے آگے کھڑا رہا۔ سناٹے میں گھر ڈوبا تھا۔ دوپہر کی کسمسائی دھوپ میں دیوار چمک رہے تھے۔ میں اپنی کوٹھری میں لوٹ آیا۔ بھیتر جانے کی ہمت نہیں ہوئی، وہیں برآمدے کی کرسی پر پسر گیا۔ باہر باغیچے میں گنگو مالی کی کھرپی پودوں کے بیچ مٹی کھود رہی تھی... کرچ، کرچ، کرچ۔ گلابی رنگ کا انگوچھا سر پر لپیٹے وہ کیاریوں پر جھکا تھا جو بیڈمنٹن کورٹ کے چاروں طرف لگی تھیں۔ پائپ سے اٹھتی پانی کی دھار سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی گھاس میں پھنکارتی ہوئی بہہ رہی تھی... مکان چپ کھڑا تھا۔ پتا نہیں دروازوں کے بھیتر وہ کہاں بیٹھے تھے!

میں باہر آ گیا۔

جب کبھی میرا من بھٹکا ہوتا تھا تو میں پگڈنڈی کا سہارا پکڑ کر اوپر چڑھتا جاتا تھا۔ دونوں طرف بانج کے پیڑ، بیچ ٹکڑوں میں چلتا آکاش۔ اکھڑی ہوئی سانسوں کے بیچ کچھ دیر کے لیے اپنے کو

Scanned with CamScanner

بھول جاتا۔ پسینے میں لت پت ہانپتے جسم کے بھیتر مَن ٹھہر جاتا ہے... شانت... بھیتر کی گھڑی چلنا بند ہو جاتی تھی۔ دل کی دھڑکن کہیں دور سے آتی سنائی دیتی تھی۔ یہ بھی بھول گیا کہ کون سی پھانس من کو ٹیس رہی تھی۔ صرف لہو کا شور رگوں میں سنائی دیتا رہا... جنگل کے بھیتری شور جیسا، جسے صرف اس کے بھیتر رہ کر ہی سنا جا سکتا ہے۔ دنیا کے شور سے پرے، اپنی رو میں بہتا ہوا۔ اپنے شہر میں تھا تو وہ سنائی بھی نہیں دیتا تھا، صرف من کا لٹو گھومتا تھا، دن رات، رات دن۔ اس کی گھرر گھرر غراہٹ تلے سب آوازیں پس جاتی تھیں، چورا بن جاتی تھیں۔ جس دن پتا کی استھیوں کو گنگا میں بہا کر لوٹا تو لگا، باہر کی آوازوں کی پوٹلی بھی ڈبو آیا ہوں... تبھی سے اپنے کو سننا شروع ہوا۔ لوگ یہاں زندگی کے کگار پر آتے ہیں... نرنجن بابو کہتے تھے، تم یہاں زندگی کے شروع میں ہی آ گئے... مگر وہ جانتے، میں اپنے شروع کو کتنا پیچھے چھوڑ آیا ہوں۔

پر سب کچھ کہاں پیچھے چھوٹ جاتا ہے... کچھ نشان تو بچے ہی رہتے ہیں... چھوڑی ہوئی جوٹھن۔ ماں باپ کا ہونا نہ ہونا ایک جیسا ہی لگتا تھا۔ بابو کی موت کے بعد ماں چھوٹے بھائی کے پاس آسٹریلیا چلی گئی تھیں۔ پیچھے ان کا گھر میرے پاس رہ گیا تھا، جو اب خالی تھا۔ خالی تب بھی جان پڑتا تھا جب وہ ساتھ رہتے تھے۔ جب اناجی نے مجھ سے مسکرا کر پوچھا تھا کہ مہرا صاحب کے ساتھ رہ کر تمھیں خالی پن نہیں لگتا، تو مجھے اچرج ہوا تھا۔ پتا نہیں چلا وہ کون سے خالی پن کی بات کر رہی ہیں۔ ساتھ رہنے کا خالی پن کیا ساتھ رہتے ہوئے پتا چلتا ہے؟

"آپ یہاں؟"

میں چونک گیا۔ پہلے ان کا گھوڑا دکھائی دیا، جیسے مجھے وہاں دیکھ کر مسکرا رہا ہو، پھر ڈاکٹر سنگھ کی مسکراہٹ دکھائی دی۔ میں بنچ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "آپ کی لمبی عمر ہے۔ آپ سے ملنے ہی آ رہا تھا۔"

"چلیے پھر میرے ساتھ... صرف ایک مریض رہتا ہے، پھر کلب چلیں گے۔"

"آپ چلیے۔ جب تک آپ اپنے مریض سے نپٹتے ہیں، میں اپنا کام کر آتا ہوں۔"

"کیسا کام؟"

"یہ چٹھی پوسٹ کرنی ہے۔" میں نے انھیں مہرا صاحب کا لفافہ دکھایا۔

"کلب میں بھی تو لیٹر باکس ہے۔"

''یہ خاص چٹھی ہے، رجسٹرڈ پوسٹ سے جائے گی۔''

میں نے سینٹ سباستین کی گردن تھپتھپائی۔ وہ اپنی پونچھ سے مکھیاں اڑا رہا تھا۔ چڑھائی چڑھنے کے بعد نتھنے پھول آئے تھے۔ منھ پر ہلکا سا سفید جھاگ چمک رہا تھا۔ اس کی بھاؤ بھرا سے کے ساتھ ڈاکٹر سنگھ سے ملنے لگی تھی۔ لمبا چہرہ جس پر سفید نشان کا ٹیکا لگا تھا، سوچتی ہوئی آنکھیں، اچھے برے کو سویکار کرنے کی سمجھداری۔ شاید یہی کارن تھا کہ ابا جی نے اسے سینٹ کا لقب دیا تھا۔ یہیں ڈاکٹر سنگھ اپنے گھوڑے سے تھوڑے چھوٹے پڑ جاتے تھے کیونکہ ان میں اپنی پوری سوجھ بوجھ اور سمجھداری کے باوجود سنت بھاؤ کہیں دکھائی نہیں دیتا تھا۔

''جلدی آیئے گا۔'' انھوں نے گھوڑے کو ایڑی لگائی۔ ''مہرا صاحب ٹھیک تو ہیں؟''

میں کچھ کہہ پاتا کہ سینٹ سباستین انھیں آگے لے جا چکا تھا۔ پہاڑی موڑ پر صرف ان کی پھدکتی ہوئی دیہہ دکھائی دے رہی تھی۔

وہ ایسے ہی تھے — ڈاکٹر سنگھ۔ دنیا کے آدمی تھے لیکن اس کے ساتھ نہیں تھے — اپنی دنیا اپنے ساتھ لے کر چلتے تھے۔ وہ یہاں نہ ہوتے تو میں مہرا پریوار کا قیدی بن کر رہ جاتا۔ انھوں نے ہی مجھے اپنے سے باہر نکالا تھا۔ آرمی کے ڈاکٹر ہونے کے ناتے ان کی پوسٹنگ بہت سے شہروں میں ہوتی تھی۔ ریٹائر ہونے کے بعد انھوں نے اپنی پریکٹس اس شہر میں شروع کی تھی۔ کلینک نیچے بازار میں تھی، لیکن گھر اوپر تھا۔ گھوڑے پر چڑھ کر وہ روز اوپر نیچے جایا کرتے تھے۔

مہینے میں ایک بار مہرا جی سے ملنے برابر آتے تھے۔ ملنے بھی، دیکھنے بھی... عمر میں بڑے ہونے پر بھی مہرا صاحب ان سے ڈرتے تھے۔ جس دن ڈاکٹر بابو کو آنا ہوتا تھا، گھر کی صفائی تو کراتے ہی تھے، خود بھی صاف کپڑے پہنتے تھے، ٹائی لگا کر بیٹھتے تھے، جیسے کہیں باہر جانا ہو۔ گیٹ پر سینٹ سباستین کو دیکھتے ہی مرلی دھر کو آواز لگاتے تھے۔ وہ ایک ہاتھ میں گھوڑے کی لگام اور دوسرے میں ڈاکٹر صاحب کا بیگ پکڑ لیتا تھا۔ ڈاکٹر سنگھ نیچے کود جاتے، کیاریوں کے بیچ چابک ہلاتے ہوئے آتے تھے۔

دونوں بھیتر کافی دیر تک بیٹھے رہتے۔ دیہہ کا معائنہ ہوتا یا بیتے ہوئے کا لیکھا جوکھا... کہنا مشکل تھا۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد جب وہ باہر آتے تو مہرا صاحب کہیں دکھائی نہ دیتے۔ صرف مرلی دھر بھاگتا ہوا آتا، ان کے گھوڑے کے ساتھ... مگر وہ فوراً اس پر بیٹھتے نہیں تھے، باغ کو لانگھ کر سیدھے

Scanned with CamScanner

میری کوٹھری کی دہری پر آ کر رک جاتے۔ گیٹ کو اپنی چھڑی سے کھٹکھٹانے لگتے۔

میں کھڑکی سے انھیں آتا ہوا دیکھتا تھا۔ پہلے سے ہی معلوم ہوتا تھا، ان کے ساتھ کلب جانا ہے۔ ہر مہینے ایسا ہی ہوتا تھا۔ لگا بندھا ڈاکٹری اصول تھا جسے توڑا نہیں جا سکتا تھا۔ جب آتے، ہمیشہ اپنے ساتھ کلب لے جاتے۔ وہ گھوڑے پر، مرلی دھر ان کا بکسا لیے پیچھے پیچھے، میں سینٹ سیاستین کے ساتھ قدم ملاتا ہوا...

ایک چھوٹا سا قافلہ پہاڑ پر چڑھتا تھا۔

چڑھائی تیکھی نہیں تھی۔ تھوڑی سی اٹھان کے بعد اترائی آتی۔ چیڑوں کے جھرمٹ کے پیچھے کلب کی ہری چھت دکھائی دیتی۔ کھڑکیوں کے لمبے شیشے دھوپ میں جھلملاتے۔ یہاں سینٹ سیاستین کے پیر سنبھل جاتے، چیڑ کی سوئیوں پر دھیرے دھیرے چلتے۔ مرلی دھر بھاگتا ہوا نیچے جاتا اور کلب کے پرانے پھاٹک کے پلّوں کو کھول دیتا اور تھوڑا سا پیچھے ہٹ کر اٹنشن کے انداز میں کھڑا ہو جاتا، جیسے ہماری گوائی کے لیے وہ بہت پہلے سے ہی گیٹ پر کھڑا ہو۔

مرلی دھر آج وہاں نہیں تھا۔ دوپہر کی اس گھڑی میں کلب اجاڑ دکھائی دیتی تھی۔ دوپہر کے بعد سے صرف بلیرڈ کھیلنے کچھ لوگ آتے تھے۔ لائبریری کے ریڈنگ روم میں کچھ ریٹائرڈ افسر دکھائی دے جاتے، اخباروں اور پتریکاؤں پر جھکے ہوئے۔ پیچھے بار تھی، جس کے دروازے لان کی طرف کھلتے تھے۔ دھوپ میں چمکتی ہوئی پہاڑیاں ہر کھڑکی سے دکھائی دے جاتی تھیں۔

وہیں ایک کونے کی میز پر ڈاکٹر سنگھ بیٹھے تھے۔ ہر دوپہر ایک ہی ٹیبل پر۔ "دوسروں کو کلینک میں دیکھتا ہوں، اپنے کو یہاں،" وہ کہا کرتے تھے۔

مجھے دیکھ کر ہاتھ ہلایا، خالی کرسی کو پیچھے دھکیل دیا، کہا کچھ نہیں، منھ میں دبی سینڈوچ چباتے رہے... میں بیٹھ گیا۔

"پوسٹ آفس ہو آئے؟"

"جی۔"

"کچھ کھاؤ گے؟"

میں نے سر ہلایا۔ انھوں نے میرے لیے بیئر منگائی... ان کا گلاس میز پر رکھا تھا۔ بیئر اور

سینڈوچ... یہی ان کا لنچ تھا۔

بار خالی تھی۔ دوپہر کی دھوپ خالی کرسیوں میزوں پر گر رہی تھی۔

انھوں نے سر اٹھایا۔ "تم کہتے تھے، مجھ سے کچھ کام تھا؟"

"آپ بہت دن سے آئے نہیں... ایک بار انھیں دیکھ لیجیے..."

"دیکھ لوں گا۔" اس بار مجھے دھیان سے دیکھا۔ "کوئی فکر کی بات ہے؟"

"آپ جانتے ہیں، وہ اپنی بات کسی سے کہتے نہیں۔"

وہ چپ چاپ کھاتے رہے۔ بیئر کا گھونٹ لیا۔

"تمھیں جو لکھاتے ہیں وہ اپنے بارے میں نہیں ہے؟"

کیا وہ ہنس رہے ہیں؟ انھیں دیکھ کر پتا نہیں چلتا۔ ان کا لہجہ ایک جیسا رہتا ہے۔ پینے کے بعد بھی کوئی فرق نہیں آتا۔ مجھے ان سے ہمیشہ حسد ہوتا ہے۔

"انھیں کوئی تکلیف ہے؟" انھوں نے میری اور دیکھا۔

"تکلیف؟ نہیں، تکلیف نہیں۔ ہوسکتا ہے وہ آپ سے کچھ کہنا چاہیں، جو اور کسی سے نہ کہہ سکتے ہوں... آپ انھیں برسوں سے جانتے ہیں۔"

"ڈاکٹری پیشہ ہی ایسا ہے۔ وہاں جاننے کا مطلب کچھ نہیں۔ دوا اور دو چار، بس اتنا ہی۔ جب کبھی پانچ ہو جاتا ہے تو ہم اسے چمتکار کہتے ہیں۔ تم چمتکاروں میں وشواس رکھتے ہو؟"

ان کے ساتھ ایسا ہوتا تھا— بات پٹری سے اتر کر کہیں کی کہیں چلی جاتی تھی۔ میں ایک جگہ رکا رہتا تھا، وہ ہر جگہ دکھائی دیتے تھے۔

"آپ کرتے ہیں؟"

"کیوں نہیں... تمھیں یاد ہے، جب تم پہلی بار مجھ سے ملنے آئے تھے۔"

"میں نہیں... مسز مہرا لائی تھیں،" میں نے کہا۔

"ہاں، وہی تو،" وہ ہنسنے لگے۔ "وہ اسادھارن عورت تھیں۔ اپنے ساتھ عجیب قسم کے جیو جنتوؤں کو لے کر میرے پاس آتی تھیں... لیکن تم سب سے نرالے تھے!"

"آپ نے مجھے مشکل سے دس منٹ دیکھا ہوگا۔"

Scanned with CamScanner

"میرے لیے وہ کافی تھے۔ جانتے ہو، پرانے زمانے کے ویدراج صرف چہرے کا رنگ دیکھ کر دیہہ کا روگ پہچان لیتے تھے۔"

"مجھے نہیں معلوم تھا آپ آیوروید میں وشواس رکھتے ہیں۔"

"چہروں کو تو پہچانتا ہوں۔"

"مجھ میں آپ نے کیا دیکھا؟"

"میں نے سوچا تھا، تم مہینہ ختم ہوتے ہی اس بیابان سے بھاگ نکلو گے۔"

"آپ کا اندازہ غلط نکلا — دیکھیے، میں یہیں ہوں۔"

"یہی تو چمتکار ہے۔"

انھوں نے سگریٹ سلگائی، کرسی کے سرھانے سر ٹکا کر بیٹھ گئے۔ کھڑکی کے باہر پیڑوں پر چھایا اترنے لگی تھی۔

"جانتے ہو، مہرا صاحب نے مجھے کیوں بلایا ہے؟" انھوں نے آنکھیں موندے موندے ہی پوچھا۔

"کس لیے؟"

"وہ جاننا چاہتے ہیں، کتنا سمے اور بچا ہے۔"

"کیسا سمے؟"

"جینے کا..." ان کی مندی آنکھیں کھل گئیں۔ "کتنے دن، مہینے، سال..."

مجھے ہلکا سا جھٹکا لگا۔

"ان کی عمر میں شاید سب کو ایسا ہوتا ہے۔"

"عمر کی بات نہیں... کیا چوبیس گھنٹے ہمیں اپنی عمر یاد رہتی ہے؟ جو چیز یاد رہنی چاہیے، اسے ہم بھول جاتے ہیں۔"

"کون سی چیز؟"

"جیسے یہ..."

انھوں نے ہلکے سے میری چھاتی کو تھپتھپایا۔ "دل، دیہہ، بیماری، سوگ... سب! تمھیں کیا یہ

Scanned with CamScanner

عجیب نہیں لگتا کہ جو چیز ہمیشہ ہمارے ساتھ رہتی ہے اسی کے بارے میں ہم ڈاکٹروں سے پوچھنے جاتے ہیں... یا جوتشیوں سے۔"

"آپ پران کا بھروسا جو ہے،" میں نے کہا۔

"بھروسا ہوتا تو میری بات نہ سنتے؟ کتنی بار ان سے کہا کہ اپنی بیٹی کے پاس جا کر کیوں نہیں رہتے؟ آخر ڈاکٹری تو وہ بھی کرتی ہے۔"

"پھر؟"

"پھر کیا... کہتے ہیں، میں اس پر بوجھ بننا نہیں چاہتا۔" انھوں نے سگریٹ کو ایش ٹرے میں مسل دیا، جیسے بہت غصے میں ہوں۔ "سچ بات تو یہ ہے، وہ یہاں سے جانا نہیں چاہتے۔"

"یہاں آخر ان کا ہے کون جو جانا نہیں چاہتے؟"

"کیوں؟ مسز مہرا نہیں ہیں؟"

میں نے انھیں دیکھا وہ نشے میں تو نہیں بہک رہے؟

"نہیں، میں سمشری کی بات نہیں کر رہا جہاں وہ دبی ہیں... میں گھر کی بات کر رہا ہوں جہاں کبھی وہ رہتی تھیں... اس گھر کو چھوڑنا آسان ہے؟"

وہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہے تھے۔ سورج پر کوئی بادل اٹکا تھا۔ ایک ہلکی سی چھاؤں شہر پر چلی آئی تھی۔

"میں چلتا ہوں۔" انھوں نے ویٹر کو بلا کر بل پر دستخط کیے، پھر میری اور دیکھا۔

"تمھیں میری بات عجیب لگی؟" انھوں نے کہا۔ "لیکن ایسا ہوتا ہے، آدمی کی کایا اسے چھوڑ کر چلی جاتی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ اپنے گھر کو چھوڑ دیتا ہے، جہاں اس کے پران بسے ہیں۔ مہرا صاحب کیا انھیں پیچھے اکیلا چھوڑ کر جا سکتے ہیں؟"

انھوں نے اپنے گلاس سے بیئر کا آخری گھونٹ لیا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

"مجھے تو جلدی ہے... آپ بیٹھیے... اور ان سے کہیے گا، گھبرائیں نہیں... میں ایک دو دن میں آؤں گا..."

Scanned with CamScanner

کچھ دیر بعد میں کلب سے باہر چلا آیا۔ پیچھے کی طرف ایک کچا رستہ تھا جو فاریسٹ ریسٹ ہاؤس کی طرف جاتا تھا۔ کچھ دور چل کر ایک چھوٹی سی اٹھان آتی تھی۔ چاروں طرف چیڑ کے اونچے پیڑ اور بیچ میں دھوپ میں نہاتی جھلملاتی گھاس۔ کسی نے اس کا نام 'پائن گروو' ٹھیک ہی رکھا تھا۔ گرمیوں میں یہاں ٹورسٹ پکنک کے لیے آتے تھے لیکن ان دنوں وہ جگہ جاڑ پڑی رہتی تھی۔ چیڑ کی سوئیوں پر پاؤں بار بار پھسل جاتے تھے۔ میری گھر لوٹنے کی کوئی اِچھا نہیں تھی، اس لیے کچھ دیر کے لیے میں وہیں بیٹھ گیا۔ بیئر کا ہلکا سا نشہ رہا ہوگا یا پائن کی پتیوں کی سوکھی نشیلی مہک، کہ بیٹھتے ہی لیٹنے کو من چاہا اور لیٹتے ہی نیند کے ہلکے جھونکے نے ایک چادر کی طرح مجھے ڈھک لیا۔ کچھ دیر تک پلکوں پر دھوپ کی رنگ برنگی بندکیاں ناچتی رہیں، پھر وہ دھیرے دھیرے ہوا کی آہٹوں میں بدل گئیں جو اوپر پھرپھراتی پھنگیوں سے نیچے آ رہی تھیں۔ ایک سونی سی سرسراہٹ جو صرف بیچ جنگل میں سنائی دیتی ہے — پہاڑ کے ایک چھور سے دوسرے پہاڑ کی اور بھاگتی ہوئی۔ اچانک گھنٹیوں کی آواز سن کر میری آنکھ کھل گئی۔ سورج کہیں کونے میں چلا گیا تھا۔ ایک پہاڑی لڑکی سر پر سوکھی ٹہنیوں اور گھاس کا گٹھڑ لے کر جا رہی تھی۔ اس کے آگے ایک چھوٹا سا لڑکا ڈنڈی گھماتا ہوا ان بھیڑ بکریوں کو ہانک رہا تھا جو گھنٹیاں بجاتے ہوئے ادھر اُدھر دوڑنے لگتی تھیں۔ میں اٹھ کھڑا ہوا اور پگڈنڈی کی راہ سے نیچے اترنے لگا۔

1.4

گھر لوٹا تو اندھیرے میں مری دھر کی لالٹین دکھائی دی۔ وہ میری کوٹھری کی سیڑھیوں پر بیٹھا بیڑی پی رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی تپاک سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"آپ کہاں تھے؟ صاحب جی آپ کو کب سے بلا رہے ہیں۔"

"آج اتنی جلدی!" میرا دل دھک سے ہو گیا تھا۔ "سب ٹھیک تو ہے؟"

"آئیے میرے ساتھ۔" اس نے میرا ہاتھ پکڑا۔ "ورنہ وہ خود چلے آئیں گے۔" نہیں، ایسا کوئی اندیشہ دکھائی نہیں دیا۔ ان کی کاٹیج اندھیرے میں ساکت کھڑی تھی۔ کوئی ہلچل نہیں۔ برآمدے کی بتی جل رہی تھی — کھڑکی کے پردوں کے پیچھے پیلی روشنی کا آبھاس تھا۔ سب کچھ شانت تھا...

Scanned with CamScanner

خاموشی...

میں اپنی کوٹھری کے بھیتر گیا۔ ہاتھ منھ دھو کر باہر آیا۔ پنسل اور نوٹ بک ساتھ تھی۔ پتا نہیں اتنے دنوں بعد کس گزرے ہوئے موڑ پر کیا دکھائی دیا ہو جو مجھے بتانا چاہتے ہوں۔ وہ اپنی ایزی چیئر پر بیٹھے تھے۔ آنکھیں بند تھیں، جیسے کچھ سوچتے ہوئے سو گئے ہوں۔ ٹیبل لیمپ میز پر تھا، پر اس کی روشنی ان کے چہرے پر نہ پڑ کر اپنے ہی دائرے میں سمٹ گئی تھی۔

"آ گئے؟... میں تمھاری باٹ جوہ رہا تھا۔"

انھوں نے آنکھیں کھولیں۔ شال سے ہاتھ نکالا اور ٹیبل لیمپ کا شیڈ تھوڑا سا اٹھا دیا۔ "چٹھی پوسٹ کر دی تھی؟"

"جی..." میں تھوڑا سا ان کے پاس سرک آیا۔ "کلب گیا تھا۔ ڈاکٹر سنگھ ملے تھے۔ وہ جلدی ہی آئیں گے۔"

انھوں نے کوئی دلچسپی نہیں دکھائی۔ راحت سی ملی۔ کوئی اور دن ہوتا تو مجھے سارے دن کا حساب کتاب انھیں دینا پڑتا۔ کچھ دیر کمرے میں سناٹا کھنچا رہا۔ باہر سے کبھی کبھی کسی کتے کے بھونکنے کی آواز سنائی دے جاتی تھی۔

"آج انّا جی آئی تھیں۔ بہت دیر تک بیٹھی رہیں۔" انھوں نے کہا۔

"کوئی کام تھا؟"

"نہیں، کام کیا ہوگا! دیوا کی قبر پر تازے پھول رکھنے جاتی ہیں، لوٹتے ہوئے یہاں رک جاتی ہیں۔ کہہ رہی تھیں، تم ان کے گھر گئے تھے۔"

"انھوں نے بلایا تھا، نرنجن بابو سے ملنے۔"

"وہ لوٹ آئے؟"

"کچھ دن پہلے ہی آئے تھے۔"

"کیا تم ایک کام کرو گے؟ اگلی بار انّا جی کے گھر جاؤ تو وہ سب کتابیں لے آنا جو وہ دیوا سے لے گئی تھیں۔ آج میں الماری میں ایک کتاب ڈھونڈ رہا تھا، تب پتا چلا کہ اسے تو انّا جی لے گئی تھیں۔"

"کوئی خاص کتاب تھی؟"

Scanned with CamScanner

''خاص تو ایسی کوئی نہیں تھی لیکن کافی عجیب کتاب تھی... شاید تم نے پڑھی ہو... Confessions of a Country Priest۔ کبھی ایک جیسوئٹ فادر نے مجھے پڑھنے کو دی تھی۔ آج ان کی یاد آئی تو وہ کتاب بھی یاد ہو آئی۔ کچھ کتابوں کے ساتھ عجیب لوگوں کی یاد جڑ جاتی ہے... تمھارے ساتھ کبھی ایسا ہوتا ہے؟''

''کہاں ملے تھے وہ آپ سے؟''

''وہ کیرلہ کے تھے لیکن میں انھیں رانچی میں ملا تھا، جہاں ان دنوں میری نئی نئی کلکٹری کی پوسٹنگ ہوئی تھی۔ وہ وہاں کسی بہت پچھڑے آدی واسی علاقے میں اسکول چلایا کرتے تھے... کبھی کوئی مشکل آتی تو میرے پاس آیا کرتے تھے۔ ان کا کام نپٹا کر میں انھیں اکثر گھر پر ہی روک لیتا تھا۔ ہم رات بھر باتیں کرتے رہتے تھے۔ میرا تب بیاہ نہیں ہوا تھا... اور وہ تو خیر بیاہ کر نہیں سکتے تھے... ہم دونوں کے پاس نہ موضوعات کی کمی تھی نہ مے کی، نہ مہوا کی شراب کی جو وہ اپنے ساتھ خاص میرے لیے لاتے تھے... جیسوئٹ پادری اور مہوا کی شراب... اس سے زیادہ دو پوئنٹ کمپیر اور کیا ہو سکتا ہے!''

وہ ہنسنے لگے۔

کچھ دیر چپ رہنے کے بعد انھوں نے کہا: ''وہ مجھ سے بہت چھوٹے تھے لیکن میں ان کا بہت آدر کرتا تھا... اور اس سے مجھے شانتی بھی ملتی تھی... ایک رات ہم اسی طرح بیٹھے تھے، میں نے ان سے ایشور کے بارے میں پوچھا۔ کیا ہے وہ؟... فادر کچھ دیر چپ رہے تھے، پھر اچانک انھوں نے مجھ سے کہا، کیا اس سے مجھے کوئی کشٹ ہوتا ہے؟... کشٹ کیسا؟ میں نے ان سے پوچھا۔ اور تب انھوں نے کہا، ایشور کے نہ ہونے کا ابھاؤ... جیسے کوئی سگا سمبندھی ہمیں چھوڑ کر چلا جاتا ہے، ویسا ابھاؤ نہیں... بلکہ کسی ایسی چیز کا ابھاؤ جسے کبھی دیکھا ہی نہیں۔ جیسے بے اولاد ماں کو بچہ نہ ہونے کا کشٹ ہوتا ہے!''

''تب آپ نے کیا کہا؟''

''کچھ نہیں... میں بھول گیا۔ برسوں پہلے ہم جو پینے کی دھن میں دوستوں سے باتیں کرتے ہیں، وہ کیا یاد رہتی ہیں؟'' وہ کچھ دیر چپ بیٹھے رہے۔ ''ایشور کے نہ ہونے کا کشٹ؟ پتا نہیں وہ مجھ

Scanned with CamScanner

سے کیا پوچھنا چاہتے تھے۔ تم جانتے ہو، دیوا کر جین تھیں؟''

''جی۔''

''کیسے؟'' انھوں نے کچھ شک سے مجھے دیکھا۔

''ETA جی نے بتایا تھا۔''

''اوہ، انھوں نے یہ نہیں بتایا، وہ کشٹ میں مری تھیں؟ پیٹ میں ٹیومر تھا... مرنے کے بعد جب اسے پیٹ سے نکالا تو اتنا بڑا جیسے ٹینس کی گیند ہوتی ہے۔ لیکن جب تک وہ جیتی تھیں، درد کی اتنی سی ہائے بھی ان کے منھ سے نہیں نکلتی تھی۔ اسلئے وہ مجھے دلاسا دیتی تھیں جب میں انھیں دیکھ کر بےحال ہو جاتا تھا۔ جب تم آئے تو وہ تھوڑا بہت ٹھیک ہو چلی تھیں۔ ہم نے سوچا تھا، تمھیں ان کے بارے میں کچھ نہیں بتائیں گے... انھی دنوں انھوں نے تمھیں بلانے کا فیصلہ لیا تھا تا کہ ان کے جانے کے بعد...''

میرا صاحب کچھ پیچھے ہٹ گئے جیسے یاد کا کوئی بگولا دھول سے اٹھ کر آنکھوں کے سامنے آ گیا ہو، جس سے اپنے کو بچانا ناممکن ہو۔ وہ اس سے بچنا بھی نہیں چاہتے تھے، جیسے بونڈر کے پیچھے کسی 'خبر' لانے والے ہرکارے کی چھایا دکھائی دے گئی ہو۔ وہ 'خبر' کیا مجھے پہلی بار سنا رہے تھے؟

''مجھ میں اُن دنوں ایک عجیب تبدیلی ہوئی...'' ان کی آواز کچھ دھیمی سی ہو گئی۔ ''تبدیلی اب کہتا ہوں لیکن ان دنوں میں ایک دن سے دوسرے دن میں رہتا تھا — بنا یہ جانے کہ مجھے ہو کیا رہا ہے... مجھے صرف یہ لگتا تھا، اگر کوئی کسی پیڑا کو اتنے گریس کے ساتھ برداشت کر سکتا ہے تو کوئی چیز اس پیڑا سے کہیں اونچی ہے۔ بہت اونچی نہیں... صرف اتنی اونچی کہ اس پر پاؤں ٹکا کر اپنے شریر کو، کشٹ چھوڑا جا سکتا ہے... اور جب میں یاتنا کی بات کہہ رہا ہوں تو بالکل فزیکل پیڑا کی... کینسر کی بات تو الگ رہی، تم نے کبھی، مینگرین کے مریضوں کو دیکھا ہے؟ یا دمے میں مبتلا بھاگوں کو، جنھیں ایک سانس سے دوسری سانس تک جانے میں کتنا کشٹ ہوتا ہے؟ وہ کیا ہمارے پرانے زمانے کے تیرتھ یاتریوں کے کشٹ سے کم ہے، جو ایک ایک قدم چڑھتے ہوئے بدری ناتھ اور کیدار کی چڑھائی پار کر لیتے تھے؟ کشٹ بھی ایک یاترا ہے... کیوں، نہیں؟''

انھوں نے ایک لمبی سانس لی جیسے کسی اندھیرے گڑھے کو لانگھنے سے پہلے وہ اپنے کو تول

رہے ہوں۔" ایک رات میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا، ان کا پلنگ خالی پڑا ہے۔ میں نے سوچا، وہ باتھ روم گئی ہوں گی۔ میں پھر سونے چلا گیا۔ دوبارہ آنکھ کھلی تو ان کا بستر ویسا ہی خالی پڑا تھا۔ میں نے ایک دو بار نام لے کر بلایا، لیکن جب کوئی جواب نہیں آیا تو بھاگ کر باتھ روم کا دروازہ کھولا۔ وہاں بھی کوئی نہ تھا۔ گھر کے سارے کمرے خالی پڑے تھے۔ گودام، کچن، دالان کا کوئی کونا ایسا نہیں تھا جسے میں نے نہ چھان ڈالا ہو، جیسے میں اپنی بیمار پتنی کو نہیں، کھوئی ہوئی چابی کو ڈھونڈ رہا ہوں۔ میں انھیں دلّی کے ایک نرسنگ ہوم میں لے گیا تھا... وہیں اپنے ایک دوست کے سرکاری بنگلے میں ٹھہرا تھا۔ تم نے کبھی نئی دلّی کے سرکاری بنگلے دیکھے ہیں؟ ضرور دیکھے ہوں گے — تم تو دلّی سے ہی آئے ہو... چاروں طرف ہرے لان کے سمندر کے بیچ وہ سفید اسٹیمر کی طرح کھڑے رہتے ہیں۔ اندھیرے میں پتا نہیں چلتا کہ آپ اس میں چل رہے ہیں یا وہ آپ کو بہاتے ہوئے کہیں لے جا رہا ہے۔ اگر تم آدھی نیند میں ہو تو یہ بھی پتا نہیں چلتا کہ دروازہ کھولتے ہی تمھارے پیر آگے کے لان کی طرف جائیں گے یا پیچھے کے کچن گارڈن میں... میں وہاں ہوں، اس کا اندازہ مجھے تب ہوا جب میں نے اچانک اپنے کو کیاریوں کے پرے کنویں کی جگت پر پایا، جہاں سے ہمارے آؤٹ ہاؤس میں رہنے والے مالی اور نوکر چاکر پانی بھرا کرتے تھے۔

"میرے پاؤں وہاں خود اپنے آپ رک گئے، حالانکہ اندھیرے میں دکھائی کچھ بھی نہیں دیا تھا... لیکن آنکھیں ہی سب کچھ نہیں دیکھتیں۔ جس عورت کے ساتھ تم برسوں سے رہ رہے ہو، اس کے ہونے کی مہک کسی بھی اندھیرے کونے کو چیر کر تمھارے پاس آجاتی ہے۔ اگر میں وہاں پانچ منٹ دیری سے پہنچتا تو شاید اس کتے کی طرح ساری رات بھٹکتا رہتا جو ایک بار سراغ پالینے کے بعد اسے کھو دیتا ہے۔ لیکن میں نے اسے پالیا تھا، اسے پکڑ لیا تھا اور اس کے اشارے پر کھنچتا ہوا وہاں پہنچ گیا تھا جہاں وہ تھیں، کنویں کی جگت پر بیٹھی ہوئی۔ اور جیسے مجھے پتا چل گیا کہ وہ وہاں ہیں، انھیں بھی پتا چل گیا تھا کہ میں وہاں ہوں... یہاں کیا کر رہی ہو؟ میں نے انھیں اٹھانے کی کوشش کی، لیکن انھوں نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنے پاس بٹھا لیا۔ 'تم میرا سکھ چاہتے ہو؟' مجھے لگا، یہ ان کی آواز نہ ہو کر کہیں کنویں کے تل سے آرہی ہے۔ 'اگر تم مجھے چاہتے ہو تو مجھے دھکا دے دو، بس ہلکا سا... باقی میں کرلوں گی۔' وہ جو آج تک مجھے اپنی پیڑا سے بچاتی آئی تھیں اب اس سے چھٹکارا پانے کے لیے مجھ سے

Scanned with CamScanner

بھیک مانگ رہی تھیں۔

''میں انھیں گھسیٹتے ہوئے گھر لایا تھا۔ ان کے پیٹ کی نکی، کنویں کی مٹی اور پانی میں لتھڑی، میرے ساتھ گھسٹ رہی تھی۔ بستر پر لٹایا تو وہ برابر میری طرف دیکھ رہی تھیں... مجھے نہیں معلوم ان آنکھوں میں کیا تھا۔ کبھی کچھ نہیں بولیں۔ تم نے تو دیکھا ہے، ہم یہاں برآمدے میں انھیں کرسی پر لٹا دیتے تھے اور شام ہوتے ہی، لٹا دیتے تھے۔ جانتے ہو، جب میں انھیں آخری دنوں میں دیکھتا تھا تو کیا سوچتا تھا؟''

میں انھیں چپ چاپ دیکھتا رہا۔

''میں نے انھیں روکا کیوں... جانے کیوں نہیں دیا؟''

''آپ کیا کہہ رہے ہیں؟''

''سنو، جسے ہم پیڑا کہتے ہیں اس کا جینے یا مرنے سے کوئی سمبندھ نہیں ہے۔ اس کا دھاگا پریم سے جڑا ہوتا ہے۔ وہ کھنچتا ہے تو درد کی لہر اٹھتی ہے۔ 'اگر تم مجھے چاہتے ہو' اس نے کہا تھا۔ مجھے لگتا ہے اس کا وشواس ایشور میں نہیں، مجھ میں تھا، اور میں نے اسے دھوکا دیا...''

رات بہت گزر چکی تھی اور ہمیں پتا نہیں چلا تھا۔ دروازے پر ہلکا سا کھٹکا ہوا اور ہم دونوں چونک گئے۔ مرلی دھر لالٹین لے کر چوکھٹ پر کھڑا تھا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ جانے سے پہلے ایک بے تکا سا خیال آیا، ان سے پوچھوں آج جو بات چیت ہوئی ہے، کیا اسے بھی نوٹ بک میں نوٹ کرتا ہوگا؟

اس رات مجھے ایک عجیب سا سپنا آیا۔ صبح اٹھا تو ٹھیک سے یاد بھی نہیں رہا۔ سپنے کے کچھ ٹکڑے ٹکڑے ہی بچے رہ گئے تھے...

میں نے دیکھا، ہم کنٹری میں کھڑے ہیں۔ وہ نیچے اتر رہی ہیں۔ کوئی میرے کانوں میں کہہ رہا ہے دیکھو، اس رات تو بچ گئی لیکن اب میں جا رہی ہوں۔ ان کا جسم پہیے میں بند نہیں ہے، وہ کھلی ہوا میں نیچے اتر رہی ہیں۔ آپ کہیں رہیں گے؟ تیا، ان کی بیٹی، مجھ سے پوچھتی ہے۔ آپ ان کے ساتھ کیوں نہیں چلے جاتے؟ وہ آپ کو ٹھیک جگہ پہنچا دیں گے۔

وہ کون؟ میں دیکھتا ہوں، پائن کے پیڑوں کے پیچھے کوئی کھڑا ہے۔ نرنجن بابو؟ میں ان کے

Scanned with CamScanner

پاس جاتا ہوں تو اپنی غلطی کا پتا چلتی ہے۔ وہ کوئی لمبا چغہ پہنے شخص ہے۔ لمبی ڈاڑھی، سفید بال۔ کیا آپ ہی وہ جیسوئٹ فادر ہیں، رنچی میں رہنے والے؟ ہاں، لیکن مہرا صاحب کہاں ہیں؟ میں ان سے ملنے آیا تھا۔

مہرا صاحب کہیں دکھائی نہیں دیتے، سپنے میں بھی نہیں!

1.5

دو میل کی کھڑی چڑھائی... دم اکھڑ جاتا ہے تو میں سانس لینے کھڑا ہو جاتا ہوں۔ چیڑ اور بانج کے پیڑ پیچھے چھوٹ گئے، صرف دیودار کے پیڑ ہوا میں لہراتے ہیں۔ E.J. کے بھاگ کو سراہتا ہوں جنھوں نے میرے ساتھ آنے سے صاف انکار کر دیا۔ ''نرنجن بابو سے کہنا، آپ کا بلاوا آپ کو مبارک۔ میں تو ایک بار ہی اوپر جاؤں گی جب ایشور بلائے گا۔'' ایشور مجھے کب بلائے گا، مجھے نہیں معلوم، لیکن نرنجن بابو کی چوٹی تک پہنچتے ہوئے مجھے لگا کہ اب دھرتی پر لوٹنا شاید ممکن نہ ہو پائے گا۔

لوٹنا کیوں ضروری ہے؟

نرنجن بابو یہاں نہ ہوتے تو میں اس نرجن میں اتنے دن رہنے کا صبر بٹور سکتا تھا؟ وہ رہتے بھی کتنے دن تھے، پانچ مہینے، چار مہینے... لیکن جب تک رہتے تھے، ایک بھروسہ بنا رہتا تھا، جیسے آنے والی سردیوں سے بچنے کے لیے وہ گرمائی کا گدّا چھوڑ جاتے تھے — اوڑھنے کے لیے، بچھانے کے لیے، منھ پر ڈھک کر سونے کے لیے... رونے کے لیے...

میں کچھ نہیں کرتا تھا۔ اسے اپنے پاس خزانے کی طرح رکھے رہتا تھا۔ جب چاہا تب اس میں سے کچھ نکال لیا کرتا تھا۔ روئی کے تاروں سے سِلا خزانہ... کبھی کچھ، کبھی کچھ... جینے کا پاگل پن... پیاروں کا پریم، اپنوں کی موت... کیا اس کا حساب کسی بھی کھاتے میں درج کیا جا سکتا ہے؟ سارے امتحانوں کو پار کرتے ہوئے ہم اس اسٹیشن پر آ پہنچے تھے۔ یونیورسٹی میں تھے تو امتحانوں کے شروع ہونے سے پہلے ہونے والی چھٹیوں کو ہم 'تیاری کے دن' کہتے تھے۔ اب کس کی تیاری؟ کہاں جانے کا امتحان؟... میری بات تو الگ تھی... کچھ بھی طے نہیں تھا۔ لیکن نرنجن بابو؟ سب جانتے تھے ان کی فلاسفی ان کے ایم اے کرنے کے بعد بہت دور تک جائے گی، کہیں بہت اونچے عہدے پر... وہ گئے

بھی تھے، لیکن وہاں نہیں جہاں ہم نے سوچا تھا۔ وہ اپنے عہد سے کو پانچ ہزار فٹ کی اونچائی پر لا کر سیب کے باغیچوں کے بیچ رو پیں گے۔ یہ کون جانتا تھا؟ کیا وہ بھی جانتے تھے؟

عمر میں مجھ سے کچھ بڑے ہونے پر بھی گزری ہوئی عمر ہمارے بیچ نہیں آئی تھی۔ ہر بار ہم وہیں ملتے تھے جہاں سے جدا ہوئے تھے۔ جدائی کے دن بیچ میں جھڑ جاتے تھے۔ لگتا تھا کہ وہ وہیں ہیں یونیورسٹی کے لان پر... جیسے بیس سال پہلے میں نے انھیں کافی ہاؤس کے پاس چھوڑا تھا... کتابوں کے گٹھر کے ساتھ جو وہ لائبریری سے لاتے تھے۔ تب کون جانتا تھا کہ ہم اپنے رستوں پر اتنی دور نکل جائیں گے، اور جب ملیں گے تو اتفاقاً، ایک ایسی جگہ جو نہ ان کی تھی نہ میری۔ اگر میں نے اسٹیٹسمین میں مسز مہرا کا خفیہ دعوت نامہ نہ دیکھا ہوتا تو آخر تک پتا نہ چلتا وہ یہاں ہیں... اس نرجن اجاڑ میں... جہاں کبھی مجھے آنا تھا۔ کون وہ دیوی ہرکارہ تھا جو سنجوگوں کی بھول بھلیوں سے گزرتا ہوا ایک کی خبر دوسرے تک پہنچا آیا تھا؟

آخر جب پہاڑ کی چوٹی پر پہنچا تو وہ دکھائی دیے۔ ان کی پیٹھ میری طرف تھی۔ وہ جھولے پر بیٹھے تھے۔ ہوا میں دھیرے دھیرے ڈول رہے تھے۔ میری آہٹ سنائی دی تو زمین پر پیروں کی بریک لگائی۔ مڑ کر میری اور دیکھا۔ میں ہانپ رہا تھا۔ ”اماجی کہاں ہیں؟“ انھوں نے میرے پیچھے جھانک کر دیکھا جیسے وہ جھاڑیوں میں چھپی ہوں۔

”میرا تو یہ حال ہے، وہ آتیں تو بیچاری بے حال ہو جاتیں۔ یہ پھانسی کس کے لیے ٹانگی ہے؟“ میں نے پیڑ پر لٹکی رسی کو جھٹکا دیا تو جھونٹا کھا کر وہ اوپر چلے گئے۔ ان کی ڈاڑھی ہوا میں لہرا رہی تھی۔

نیچے آئے تو بولے، ”یہ گڑیا کے لیے لگایا تھا جب وہ چھوٹی تھی۔ اب میں اس پر جھولتا ہوں... بھیتر چلو گے؟“

”نہیں، یہیں اچھا ہے،“ میں نے کہا۔ ”کچھ دیر یہیں بیٹھتے ہیں۔“

پیڑ کے چاروں طرف اینٹوں کی گول چوکی تھی... میں اسی پر بیٹھ گیا... کچھ فاصلے پر ان کی کاٹیج کا برآمدہ تھا جہاں کرسیاں اور میز رکھے تھے۔ دروازوں کے شیشوں پر شام کی پیلی دھوپ چمک رہی تھی۔ کھڑکیاں، ڈھلواں چھت، چمنیاں، سب ایک سرخ آگ میں سلگتی سی دکھائی دے رہی تھیں۔

Scanned with CamScanner

ان کی کاٹیج اندھیرا ہونے سے پہلے دھوپ کا آخری اسٹیشن جان پڑتی تھی... لیکن جہاں ہم بیٹھے تھے وہاں کیکر کی چھایا اتنی گھنی تھی کہ ٹہنیوں کے بیچ سے روشنی کی صرف چھوٹی چھوٹی بندکیاں جھر رہی تھیں... کچھ بھی نہیں مل رہا تھا سوا ان کے جھولے کے، جس پر وہ بے حرکت بیٹھے تھے۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔ یہ اچھا ہی تھا۔ میری اکھڑی سانسیں دھیرے دھیرے پٹڑی پر لگ رہی تھیں۔ میں اب بنا ہانپتے ہوئے ان سے بات کر سکتا تھا... سامنے پوری شام پڑی تھی، اور شاید رات کا ایک ٹکڑا بھی... اگر میں وہاں رک جاتا ہوں۔

''گیسٹ ہاؤس کہاں بنایا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

وہ جھولے پر ڈول رہے تھے... کیا سو رہے تھے؟

''چلیں گے،'' انھوں نے کہا۔ ''ابھی پورا تیار نہیں ہوا لیکن رہنے لائق ٹھیک ہے... تھوڑا چلنا پڑتا ہے۔''

''یہ خیال کیسے آیا... گیسٹ ہاؤس کا؟''

''میرا نہیں، یہ نجو کی اچھا تھی، یہاں اسکول چلانے کی۔ سیبوں کا باغیچہ تو تم نے دیکھا ہے؟ اس کے اوپر والی زمین خالی پڑی تھی۔ جھاڑ جھنکاڑ اور پتھر... وہاں کچھ بھی نہیں تھا، صرف لکڑی کا شیڈ تھا جو برسوں سے خالی پڑا تھا۔''

''پھر گیسٹ ہاؤس کہاں سے آیا؟''

''اسی شیڈ کو دیکھ کر خیال آیا تھا۔'' وہ ہنسنے لگے۔ ''اگر وہ وہاں نہ ہوتا تو کسی کو یاد بھی نہ آتا کہ وہاں کچھ بن سکتا ہے۔''

''اور اسکول کا کیا ہوا؟''

وہ چپ رہے، جھولے کی پٹڑی پر ساکت بیٹھے رہے۔ ہلکی سی ہوا میں صرف رسی دھیرے دھیرے ڈول رہی تھی۔

''اب وہ یہاں نہیں آنا چاہتیں۔''

میں نے ان کی اور دیکھا ''نہیں آنا چاہتیں... کیا مطلب؟''

''کہنا مشکل ہے... جاننا اس سے بھی زیادہ۔'' ایک اداس سی مسکراہٹ ان کے چہرے پر

Scanned with CamScanner

چلی آئی۔" "یہ خالی میں نے یوں ہی چھوڑ دی؟... جتنا وہ دیتی ہے، یا اس سے زیادہ خالی نہیں چھوڑ دیتی؟"

میں چپ بیٹھا رہا۔ دوستی میں چپ کا اپنا کنارہ ہوتا ہے۔ باتوں کے دوران وہ رکاوٹ پیدا کرتی ہے۔ ہم اس میں اسے سن لیتے ہیں جو کہا نہیں جاتا۔ ایک آدھی سانس جو کنارے کو گیلا کر، اپنے سوکھے میں لوٹ آتی ہے...

"تب کیا آپ یہاں اکیلے رہیں گے؟"

"اکیلا کیسے؟ پہلے بھی تو میں کچھ مہینوں کے لیے ہی آتا تھا۔ سیبوں کا سیزن کتنے دن چلتا ہے؟"

"اسکول کھولنے کا ارادہ کیوں بدل دیا؟"

"کیونکہ جس کا ارادہ تھا، وہ خود اسے چھوڑ کر چلی گئیں۔"

میں انھیں دیکھتا رہا۔ "میں سمجھا نہیں۔"

انھوں نے دھیرے سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "تم کیسے سمجھو گے؟ تم اس جگہ تب آئے ہو جب سب کچھ بیت چکا ہے۔" کچھ دیر بعد بولے تو ان کا لہجہ نم ہو آیا تھا۔ "مسز مہرا یہاں بہت اکیلا محسوس کرتی تھیں۔ اسکول کھولنے کا ارادہ انھی کا تھا۔ یہ جگہ انھیں بہت اچھی بھی لگتی تھی۔ انھوں نے ہی یہ بات مجھ سے کہی تو وہ مان گئیں۔ پڑھانے کا کام جیسا یہاں ویسا جے پور میں... بلکہ یہاں ان کو زیادہ سہولت ہوتی، آنے جانے کے جھنجھٹ سے چھٹکارا مل جاتا۔"

وہ کچھ دیر اندھیرے میں دیکھتے رہے۔ "جس دن مسز مہرا نے اسکول کی پہلی اینٹ لگائی تھی... سب لوگ یہاں آئے تھے... ماتاجی، ڈاکٹر سنگھ، مہرا صاحب... ان کی بیٹی تیا بھی اسپتال سے چھٹی لے کر آئی تھی... یہیں پر بیٹھ کر ہم نے پکنک کی تھی۔ اس دن پہلی بار مسز مہرا کے چہرے پر خوشی دیکھی تھی۔ سچ مچ کی خوشی... جیسے انھیں یہاں رہنے کا جسٹیفکیشن مل گیا ہو... تب کسے معلوم تھا کہ ان کے جسم کے بھیتر کون سی بیماری پل رہی ہے۔ کیا تمھیں یہ عجیب نہیں لگتا؟ اس دن جب یہاں سارے دوست جمع تھے، ہم نے اس مہمان کو نہیں دیکھا جو ان کے بھیتر تھا... جس کے ساتھ انھیں جانا تھا۔"

ایک اندھیری سی کپکپی میرے بھیتر دوڑ گئی... موت، کیا وہ اس طرح آتی ہے؟ مہمانوں کے بیچ بیٹھی مسکراتی مہمان؟ انھوں نے میری کپکپی کو دیکھا تو بولے، "بھیتر چلیں؟ سردی تو نہیں لگ رہی ہے؟"

''نہیں، سردی کیسی؟ یہاں اچھا ہے۔ کچھ دیر یہیں بیٹھتے ہیں۔''
''تو ٹھہرو، میں ابھی تنکو کو بلاتا ہوں۔''

وہ بھیتر چلے گئے، میں بیٹھا رہا۔ جب یہاں آتا تھا تو سب یہیں بیٹھتے تھے۔ ان کی پتنی تو، نئی جواب دتی میں تھی، اناجی جو کبھی مسز مہرا کے ساتھ سیر کرتے ہوئے یہاں آجاتی تھیں۔ نرنجن بابو کے باغیچے میں سب لوگ اپنے اپنے گھروں سے چھٹکارا پا لیتے تھے۔

کانیج سے کوئی چھایا باہر نکلتی دکھائی دی۔ بوڑھے چوکیدار تنکو کا چہرہ تاروں کی روشنی میں چمک رہا تھا۔ وہ اپنے ساتھ ایک لمبی ٹرے میں گلاس، پانی کا جگ اور نمکین کی پلیٹیں لایا تھا۔ تپائی پر رکھنے کے بعد اس نے میری اور دیکھا۔ ''اس بار تو آپ بہت دنوں میں آئے صاحب!''

''کیا کریں! تمھارے صاحب نے اتنے اونچے پہاڑ کی چوٹی پر دھونی رمائی ہے کہ یہاں تک آنے میں سب کے پران سوکھ جاتے ہیں۔''

وہ مسکرا رہا تھا۔ مہمان آتے تھے تو اس کی باچھیں کھل جاتی تھیں، چہرے کی جھریاں کسی لمبی نیند سے جاگ کر ایک دوسرے کے پیچھے بھاگنے لگتی تھیں۔

''اناجی بھی یہی کہتی تھیں۔ ان کو آئے بھی مدت ہو گئی۔''

تنکو گہرے لگاؤ سے اناجی کو یاد کرتا تھا۔ وہ جب یہاں آتی تھیں تو ہمیشہ کوئی سوغات اس کے لیے لاتی تھیں۔

''تم ہی کبھی ان سے ملنے کیوں نہیں چلے جاتے؟''

''میں؟''

اس نے کانوں کو ہاتھ لگایا، جیسے میں نے کوئی انہونی بات کہہ دی ہو۔ ''ان دنوں مرنے کی فرصت نہیں۔'' اس نے اوپر کی اور اشارہ کیا۔ ''نیچے جانے کی بات تو بہت دور کی رہی۔''

یہ سچ بھی تھا۔ تنکو کے بنا نرنجن بابو کیسے سب سنبھال پاتے؟ وہ اتنا ہی پرانا تھا جتنا سیبوں کا باغیچہ... منیجر، چوکیدار، سیکرٹری، سب۔ سیبوں کے سیزن کے بعد جب نرنجن بابو جے پور چلے جاتے تو سال کے باقی بچے مہینوں میں مکان، باغیچوں کی سپروائزری بھی وہی کرتا۔ جب خالی سے ملتا تو مرلی دھر سے ملنے چلا آتا۔ تنکو کی بیٹی مرلی دھر سے بیاہی گئی تھی۔ اپنی بیٹی سے ملنے جب کبھی نیچے آتا تو

میری کوٹھری کے آگے حال چال پوچھنے کے لیے رکتا ضرور تھا۔

''صاحب، ایک بات پوچھوں؟'' تو ہی آنکھوں سے کاٹیج کی اور دیکھا، پھر میری اور۔

''کیا بات ہے ننکو؟''

''اس بار صاحب کے ساتھ بی بی نہیں آئیں؟''

میں گھبرا سا گیا۔ مالکوں کے نجی جیون کے راز ان کے ملازموں کے ساتھ بانٹنا کیا ٹھیک ہے؟

''کوئی کام پڑ گیا ہوگا... ننکو تم سے کچھ نہیں کہا؟''

''مجھ سے کبھی کچھ کہتے ہیں؟ بس... آنے سے پہلے ایک چٹھی بھیج دیتے ہیں۔''

''ہو سکتا ہے بعد میں آئیں۔''

اس نے ایک لمبی سانس کھینچی۔ ''کچھ اور چیز کی ضرورت ہے تو لاؤں؟''

''نہیں ننکو، صاحب کہاں چلے گئے؟''

''بس آتے ہوں گے۔''

زنجن بابو جب آئے تو شام کی روشنی بجھنے لگی تھی۔ وہ اپنے ساتھ لالٹین لائے تھے لیکن اسے تپائی سے تھوڑی دور رکھ دیا تھا۔ روشنی دیکھتے ہی پتنگوں کا جھنڈ ٹوٹنے لگتا تھا۔

''ابھی کھانے میں کچھ دیر ہے، کچھ پیو گے؟''

''کیا ہے؟''

''رم ہے، وسکی ہے... تھوڑی برانڈی بھی پڑی ہے۔ پچھلے سال جو کچھ ساتھ لایا تھا، سب کچھ ویسا ہی پڑا ہے۔''

وہ کپڑے بدل کر آئے تھے... کرتا، پاجامہ اور اوپر سے شال۔ آنکھوں میں عجیب سی شانتی تھی، جیسے دن بھر کی کھودا کھادی کے بعد اب چھٹکارا ملا تھا۔ داڑھی کے سفید کالے بالوں پر ایک ڈھلی ہوئی چمک تھی... کالج کے دنوں کی کھلی تازگی مند پڑ گئی تھی لیکن اس کی جگہ پر بڑھاپن کا وقار آ گیا تھا... ایک تپی ہوئی روشنی، جو دیہہ کے بھیتر نہیں اس کے ساتھ الگ سے جڑی جان پڑتی تھی۔

ہم کچھ دیر چپ چاپ پیتے رہے۔ ہم صرف ہوا کو سن سکتے تھے جو پیڑوں سے چھنتے ہوئے ہمارے پاس آتی تھی۔ اتنی اونچائی پر رہنے کا یہ سکھ تھا۔ اوپر کی آوازیں سنائی دیتی تھیں، بھیتر سب

چپ رہتا تھا۔ دھیرے دھیرے سارا آکاش تاروں سے بھر آیا تھا۔ ایک ہلکی سی روشنی چاروں اور پھیلی تھی، پیڑوں پر، لان پر، کانچ پر... ہوا میں جھولا اپنے آپ اپنی ہی خماری میں جھول رہا تھا۔

"اس بار تو کچھ دن رہیں گے؟" میں نے ان کی اور دیکھا۔

"دیکھو، سوچ کر تو یہی آیا تھا۔"

"یہاں آکر واپس لوٹنا کیسا لگتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

وہ کچھ دیر چپ بیٹھے رہے۔

"وہاں میرا گھر ہے... گرہستی کے ساتھ چلنے میں سے کا پتا نہیں چلتا۔" وہ ہنسنے لگے۔ "یہاں آکر پتا چلتا ہے، ہم اپنے سے کتنی دور نکل آئے۔"

"یہ شاید سب کے ساتھ ہوتا ہے،" میں نے کہا۔

"ہاں، لیکن وہ آدمی جو دو جگہوں پر رہتا ہے، اس کے ساتھ شاید سب سے زیادہ۔ یہاں آتے ہی مجھے سے پوری زندگی بالکل پرائی جیسی جان پڑتی ہے... جیسے اسے کوئی دوسرا آدمی جی رہا تھا۔ اور جب میں وہاں جاتا ہوں تو کچھ دنوں کے بعد یہ سوچنا بھی عجیب لگتا ہے کہ یہاں بھی کوئی سیبوں کا باغیچہ ہے... کوئی ایسی جگہ ہے جہاں تم اور اماجی اور ڈاکٹر سنگھ اور مہرا صاحب رہتے ہیں..." انھوں نے رم کا گھونٹ لیا، میز کی تپائی پر رکھتے ہوئے میری اور دیکھا۔ "کبھی تو سمجھ میں نہیں آتا، کون سی زندگی اصلی ہے، یہ یا وہ..." وہ کچھ دیر چپ رہے، پھر دھیرے سے کہا، "یا دونوں میں سے کوئی نہیں۔"

ان کی باتوں میں کوئی بے چینی نہیں تھی۔ وہ شانت تھے۔ دونوں شہروں کے بیچ آتے جاتے ایک یاتری... تیرتھ یاتری؟ ان کی یہ بے نیازی ہی مجھے بے چین کر دیتی تھی۔

"کیا یہاں آنا آپ کو اچھا لگتا ہے؟"

"واپسی کا ٹکٹ جیب میں ہو، تب آدمی کہیں بھی رہ سکتا ہے۔ لیکن یہ اصلی رہنا نہیں ہے۔"

"اصلی رہنا کیا ہے؟"

"یہ تو تمھیں معلوم ہونا چاہیے۔ تم سب کچھ چھوڑ کر یہاں آئے ہو۔ کم سے کم تمھارے من میں تو کوئی شک نہیں ہونا چاہیے۔"

Scanned with CamScanner

''پیچھے چھوڑنے کے لیے اگر کچھ نہ ہو تو؟''

''پھر یہاں کیوں رہتے ہو؟ آخر یہاں رہنے کا فیصلہ بھی تو تم نے لیا تھا؟''

''صرف اتفاق سے'' میں نے کہا۔ ''اگر اسٹیٹسمین میں میں نے مسز مہرا کا اشتہار نہ دیکھا ہوتا تو میں آج یہاں نہ بیٹھا ہوتا۔''

''جو بھی ہو، یہاں تمھیں دیکھ کر ہمیشہ حیرانی ہوتی ہے۔''

''حیرانی کیسی؟''

''تمھارا مہرا صاحب کے ساتھ رہنا... تمھاری کبھی نیچے جا کر رہنے کی اچھا نہیں ہوتی؟''

''نیچے؟''

''نیچے دنیا میں!''

''اور یہ دنیا نہیں ہے؟''

وہ ہنسنے لگے۔ ''ہاں ہے تو! ایک ریٹائرڈ افسر، ایک بوڑھی جرمن جادوگرنی، ایک جوکر قسم کے ڈاکٹر... ایک میں absenty landlord!... ایسی دنیا کہاں ملے گی؟''

''اور آپ! آپ نے کبھی یونیورسٹی میں سوچا تھا، فلاسفی چھوڑ کر سیب کا باغیچہ لگائیں گے؟''

''کیوں، سیب اچھے نہیں لگتے؟ جس نے پہلی بار سیب کھایا تھا، گیان اُسے ہی ملا تھا... ساری فلاسفی کیا وہیں سے شروع نہیں ہوتی؟''

اگر وہ ہنسے تھے تو اندھیرے میں ہنسی دکھائی نہیں دی، لیکن آواز وہی تھی جسے میں یونیورسٹی کے کافی ہاؤس میں سنا کرتا تھا... ایک روکھے سے مزاحیہ انداز میں ڈھکی ہوئی، اداس اتنی نہیں جتنی بے نیاز، دنیا کی ماساؤں کے بیچ اپنے کو الگ رکھتی ہوئی...

''اگر گیان ایسا ہوتا ہے تو یہاں رہ کیوں نہیں جاتے؟'' میں نے کہا۔

''میں تمھاری طرح اکیلا نہیں ہوں، نہ پتنی، نہ بچے... ہر سکھ کا مول چکانا پڑتا ہے!''

''آپ کس سکھ کی بات کر رہے ہیں؟''

''گھر والوں کا سکھ، دنیا میں رہنے کا سکھ۔ آدمی کیا ساری مارکاٹ ان سکھوں کے لیے نہیں کرتا؟''

Scanned with CamScanner

"جسے آپ گیان کہتے ہیں، وہ بھی کیا اسی مرگھاٹ کے بھیتر سے نہیں آتا؟"

"جب آتا ہے تب تک بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے... تب آدمی اس کے قابل نہیں رہتا، وہ اپنے چہنے سے سکھ نہیں، اس کی راکھ اٹھانے آتا ہے..."

میں نے گلاس سے سر اٹھایا۔ کیا وہ اپنی بات کر رہے تھے؟ یا ہم سب کی؟ لیکن اس سے کیا کوئی فرق پڑتا تھا کہ راکھ کس کی ہے؟ کہاں سے آ کر کس پر بیٹھ جاتی ہے؟

ہوا چلی تو پیڑ کی پتیاں کھڑکھڑانے لگیں۔ ایک ٹھنڈی سی تھرتھراہٹ اندر سہرنے لگی۔ میرے بھیتر ایک عجیب سی بے بسی آ گئی تھی۔ لگتا تھا جیسے بیچ کے برسوں کی ایک ادیکھی چھایا سی ہم دونوں کے بیچ آ کر بیٹھ گئی ہے... اور ہم اس کا کچھ نہیں کر سکتے۔

"ایک بات بتاؤ... تم نے بیاہ کیوں نہیں کیا؟" ان کا سوال اتنا اچانک تھا کہ میں کچھ ہکبکا سا گیا۔

"مجھے خود نہیں معلوم... کچھ چیزیں نہیں ہوتیں، بس!"

"کبھی سوچا بھی نہیں؟"

"نہیں۔"

"کیا کوئی کبھی کمی محسوس نہیں ہوتی؟ کوئی ابھاو؟"

"جو چیز کبھی نہیں ہوئی اس کا ابھاو کیسا؟ رشک سا ضرور محسوس ہوتا ہے..."

"رشک کیسا؟ دوسروں کے سکھ سے؟"

"نہیں، سکھ سے نہیں... کچھ لوگ سکھی نہیں ہوتے لیکن ان میں کچھ ایسا ہوتا ہے جسے دیکھ کر ہم اپنے کو بہت چھوٹا سا محسوس کرتے ہیں۔ وہ کسی دوسرے سیارے کے باسی جان پڑتے ہیں... پہلے جب میں مسز مہرا کو دیکھتا تھا، تو مجھے لگتا تھا، انھوں نے مجھے یہی دیکھنے کے لیے بلایا تھا۔"

"کیا دیکھنے کے لیے؟"

"اپنے کو..." میں نے اندھیرے میں کچھ ٹٹولتے ہوئے کہا۔ "انھیں دیکھ کر مجھے اپنے پر ہی کچھ شرم سی آنے لگتی تھی..." مجھے نہیں معلوم میں کیا کہنا چاہ رہا تھا، لیکن مجھے اس کی چنتا نہیں تھی، بلکہ خوشی تھی کہ جو دھند میرے بھیتر تھی سے کاٹا جا سکتا ہے، اسے اپنے شبدوں سے ہی چھیدا جا سکتا ہے۔ "کچھ لوگ شاید ایسے ہی ہوتے ہیں... انھیں دیکھ کر اپنا کیا گزرا سب کچھ بنجر سا جان پڑتا ہے۔"

وہ چپ بیٹھے رہے۔ گلاس اٹھایا، پھر اسے رکھ دیا۔

"تم جانتے ہو... آخری بار وہ یہاں آئی تھیں۔"

میں نے کچھ چونک کر انھیں دیکھا۔ "مسز مہرا آئی تھیں... اکیلی؟ کب کی بات ہے؟"

"تب ان کے صرف ٹیسٹ ہوئے تھے، بیماری کا کچھ پتا نہیں تھا... یا شاید انھیں معلوم تھا لیکن مجھے بتایا نہیں تھا۔ ہاں، اکیلی ہی آئی تھیں۔ وہ اکثر مہرا جی کے ساتھ آتی تھیں... اس دن انھیں اکیلا دیکھ کر مجھے کچھ اچنبھا ضرور ہوا تھا۔"

"کچھ بتایا تھا انھوں نے آپ کو؟"

"پہلے تو ہنستی رہیں، جیسی ان کی عادت تھی... کہنے لگیں، ایک بار میں اسکول دیکھنا چاہتی تھی، کتنا بن گیا ہے... تب اس کا صرف ایک کمرہ بن کر تیار ہوا تھا۔"

"کیا انھیں کچھ شبہ ہو گیا تھا؟"

"کس بارے میں؟"

"اپنی بیماری کے..."

"ہو سکتا ہے... لیکن ان کے چہرے سے کچھ پتا نہیں چلتا تھا۔ میں نے انھیں بھیتر آنے کے لیے کہا، لیکن وہ باہر کھڑے کھڑے باتیں کرتی رہیں... ادھر ادھر کی چھٹ پٹ باتیں... لیکن ان کا دھیان کہیں اور تھا۔ جب جانے لگیں تو انھوں نے مجھے کچھ عجیب نگاہوں سے دیکھا... جیسے اتنی دور مجھ سے کچھ پوچھنے آئی تھیں لیکن آخری قدم لے نہیں پا رہی تھیں۔"

"کیا جاننا چاہتی تھیں؟"

"مجھے نہیں معلوم... لیکن جب کسی آدمی کو پتا چل جائے اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے، تو وہ دوسروں کی آنکھوں سے اپنے کو دیکھنے لگتا ہے... شاید وہ کچھ بھی جاننا نہیں چاہتی تھیں، میرے پاس صرف اس لیے آئی تھیں کیونکہ میں انھیں برسوں سے جانتا تھا... کیا تم سے کچھ نہیں کہا؟ تم تو انھی کے پاس رہتے تھے؟"

"ہاں... لیکن جب میں آیا تو وہ زیادہ سے تیا کے ساتھ بتانے لگی تھیں... اپنی بٹیا کے پاس۔ آج جب میں ان دنوں کے بارے میں سوچتا ہوں تو لگتا ہے کہ انھوں نے مجھے اسی لیے بلایا تھا کہ مہرا

Scanned with CamScanner

صاحب کو میرے سپرد کر کے وہ زیادہ سے زیادہ دن اپنی بٹیا کے ساتھ بتا سکیں۔''

''لیکن کیوں؟''

اس کا کوئی جواب تھا؟ آخری دنوں میں ہم کیا کرتے ہیں، کس سے بچنا چاہتے ہیں، اس کا راز کیا اپنے ساتھ نہیں لے جاتے زمین کے نیچے... جہاں انھیں سننے والا کوئی نہیں؟

چاروں اور سناٹا تھا۔ تاروں کی سفید، گھٹی سی روشنی پیڑوں پر گر رہی تھی جو ساکت کھڑے تھے۔ کبھی کوئی پنچھی پھڑک کر اوپر ہوا میں چکر لگاتا ہوا نیچے گھاٹی کی طرف اُڑ جاتا۔ جھینگروں کی لگاتار تان کے سوا کچھ بھی سنائی نہیں دیتا تھا۔

اچانک روشنی کا ایک چھوٹا سا دائرہ دھیرے دھیرے پاس آیا۔ تب دونوں کا دھیان ٹوٹا۔ سامنے لالٹین لیے ٹنکو کھڑا تھا۔

''کھانا لگا دوں یا ابھی دیر ہے؟''

''بس آتے ہیں!'' زنجن بابو کچھ دیر کھوئے سے بیٹھے رہے، پھر ایک لمبی سانس لی۔ کچھ کہنا چاہا، پھر بیچ میں رک گئے۔ ''چلو ہیٹر چلتے ہیں، باتیں بعد میں ہوں گی۔''

ہیٹر کمرے میں آگ جل رہی تھی۔ سوکھی لکڑیوں سے لپلپاتی لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔ ٹنکو نے کھانا پہلے سے ہی پروس دیا تھا... رسوئی گھر وہاں سے کچھ دور تھا۔ جب اندھیرے میں بھاگتا ہوا وہ روٹی لے کر آتا تھا تو لگتا تھا، ہم دنیا کے کسی چھور پر بنی قدیم گپھا میں بیٹھے ہیں۔ زنجن بابو اپنے باغیچے کے بارے میں بتاتے رہے — سیبوں کی الگ الگ قسمیں، ان کے پیڑوں کی رکھوالی، پہاڑی چوکیداروں کی کاہلی، مالیوں کی شراب خوری...

''شروع کے برسوں میں تو میں اتنا نراش ہو جاتا تھا کہ سب کچھ چھوڑ چھینک کر اپنے شہر لوٹ جانے کو من کرتا تھا۔ لیکن پھر سوچتا تھا... وہاں جا کر بھی کیا کروں گا؟ یونیورسٹی کی حالت کو دیکھتے ہی دل دہلنے لگتا تھا... کیا ساری زندگی وہاں پڑھاتے ہوئے گزار سکوں گا، جس میں میرا خود وشواس نہیں...''

''لیکن یہاں؟ یہاں آپ کو وہ وشواس مل گیا جو آپ چاہتے تھے؟''

''یہاں کم سے کم یہ سنتوش تو رہتا ہے کہ میں اپنے کو دھوکا نہیں دے رہا۔ ویسے بھی صبح سے شام تک اتنا کام رہتا ہے کہ اپنے بارے میں سوچنے کا ایک پل نہیں مل پاتا۔ رات کو جب بستر پر لیٹتا

ہوں تو یہ بڑی نعمت جان پڑتی ہے۔"

آگ کی پیلی لپٹوں میں ان کا چہرہ تھکا اور مرجھایا سا جان پڑتا تھا حالانکہ عمر میں وہ مجھ سے پانچ سال ہی بڑے تھے۔ پرانے دوستوں کے چہرے خود ہمیں اپنے ہونے کے کھنڈروں کی یاد دلاتے ہیں... چہرے کی جھریاں، سفید ہوتے بال، ماتھے پر کھنچی تیوریوں کے گل کوچے... جن کے چوراہوں پر ہم ان سے نہیں، خود اپنی گزری ہوئی زندگی کے پرتوں سے ملاقات کر لیتے ہیں...

کچھ دیر ہم چپ چاپ دیوار میں دھنسی انگیٹھی پر لکڑیوں کو سلگتا دیکھتے رہے۔ لپٹوں کی لمبی چھائیں دیوار پر ناچ رہی تھیں۔ باہر ہوا کے چلنے سے انگیٹھی کی چمنی سے سی سی کی عجیب بھوتنی سی گونج سنائی دے رہی تھی۔ اچانک کچھ سوچتے ہوئے انھوں نے میری اور دیکھا۔ "مجھے ایک خیال آیا ہے... پتا نہیں تم اس کے بارے میں کیا سوچو گے..."

میں نے مسکراتے ہوئے ان کی اور دیکھا۔ "پینے کے بعد ہمیشہ مولک خیال دماغ میں آتے ہیں... بتائیے کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

"تم یہاں آ کر کیوں نہیں رہ جاتے؟... میں تو آٹھ نو مہینے یہیں رہتا ہوں۔"

میں نے تجسس سے ان کی اور دیکھا۔ "اور مہرا صاحب، ان کا کیا ہوگا؟"

"تم ان کی رکھوالی کرنے تھوڑے ہی آئے ہو!"

"ایسا ہی سمجھ لیجیے... مسز مہرا نے مجھے یہاں اسی لیے بلایا تھا۔"

"اور جب وہ نہیں رہیں گے... تب...؟"

"تب کی بات اور ہے... پھر جوان کی بیٹی طے کریں گی ویسا ہوگا... ہو سکتا ہے وہ یہاں آ کر رہیں۔"

انھوں نے سر ہلایا۔ "اب نہیں آئیں تو بعد میں آ کر کیا کریں گی، جب یہاں ان کا کوئی نہیں ہوگا۔"

"وہ یہاں آ کر کیوں نہیں رہنا چاہتیں؟ یہاں پر بھی تو پریکٹس کر سکتی ہیں؟" میں نے ان کی اور دیکھا۔ وہ تھکی آنکھوں سے انگیٹھی پر جلتی لکڑیوں کو دیکھ رہے تھے۔

"مجھے نہیں معلوم۔" انھوں نے سر ہلایا۔ "جب کوئی ایک بار گھر چھوڑ دیتا ہے تو واپس لوٹنا آسان نہیں ہوتا۔"

Scanned with CamScanner

کچھ دیر ہم چپ چاپ اپنی پلیٹوں کے آگے بیٹھے رہے۔ اچانک وہ بہت مصروف انداز میں اٹھے۔ ’’کافی دیر ہو گئی۔ چلو میں تمھیں گیسٹ ہاؤس دکھا دیتا ہوں۔ آج تم واپس نہیں جاؤ گے۔‘‘

وہ مجھے گیسٹ ہاؤس تک چھوڑنے آئے تھے۔ میں نے انھیں منع کیا پر وہ نہیں مانے۔ وہ ٹارچ جلا کر راستہ دکھاتے ہوئے آگے آگے چل رہے تھے۔ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ ہلکی پیلی چاندنی میں سب کچھ دکھائی دے رہا تھا۔ سوچی ملی ہوئی جیسی دیودار کی شاخیں، بانج کی چھتنار تلے جھولتا رسی کا جھولا... جھاڑیوں کی فینس جس کے پار پوری گھاٹی پھیلی تھی۔ کچھ بھی سنائی نہیں دیتا تھا... سب کچھ ساکت... رات کی خاموشی کو توڑتی دور کہیں کتوں کی چیخیں ہی سنائی دے جاتی تھیں۔

گیسٹ ہاؤس کے گیٹ کے سامنے آ کر میں رک گیا۔ برآمدے میں ایک دھندلی سی بتی جل رہی تھی۔ ’’اب آپ لوٹیے، میں چلا جاؤں گا۔‘‘

وہ تذبذب میں کھڑے رہے۔ وہ شاید مجھ سے کچھ کہنا چاہتے تھے، بیتی ہوئی شام کو کسی کنارے تک لانے کے لیے... لیکن یہ ہوتا کہاں ہے؟

’’اچھا ہوا تم آ گئے!‘‘ انھوں نے کچھ جھجکتے ہوئے کہا، جیسے تسلیم کرنے میں کوئی شرم ہو، پھر جلدی سے اپنی بات کو موڑ دیا۔ ’’دو کمبل اور رضائی رکھ دی ہے۔ اور ضرورت تو نہیں پڑے گی؟‘‘

’’برف تو نہیں گرنے والی؟‘‘

وہ ہنسنے لگے۔ ’’تو میں چلتا ہوں... صبح ٹنکو چائے لے آئے گا۔‘‘

ان کے جانے کے بعد بھی میں دیر تک برآمدے میں کھڑا رہا۔ ہوا میں پیڑوں کی سرسراہٹ سنائی دے رہی تھی۔ کبھی کوئی پنچھی اڑتا تو اندھیرے میں اس کی پھڑپھڑاہٹ ایک چرخی سی گھومنے لگتی، پھر سب کچھ شانت ہو جاتا۔

کمرے میں آیا تو سب سے پہلے نظر پلنگ پر پڑی۔ وہ کچھ اتنا صاف اور کنوارا سا جان پڑتا تھا جیسے اب تک اسے کسی نے چھوا نہ ہو، لیٹنے کی بات تو دور کی رہی۔ سرہانے پر صاف ستھرا تولیہ، پائینتی پر کمبل... پاس ہی ایک تپائی پر پانی کا جگ اور گلاس رکھے تھے۔ ساتھ میں سٹا ہوا باتھ روم تھا جس میں تازے فینائل کی گندھ آ رہی تھی۔ اس سے پرے دوسرا کمرہ، جو بند پڑا تھا۔ گیسٹ ہاؤس سے کہیں بڑھ کر ساری عمارت ایک لاگ کیبن جیسی جان پڑتی تھی، لکڑی کے تختوں سے بنی ہوئی، سفید

Scanned with CamScanner

اور مختصر، جہاں ایک چیز بھی غیر ضروری نہیں لگتی تھی۔

سوائے میرے... میرا اپنا وہاں ہونا ہی کچھ غیر ضروری سا جان پڑ رہا تھا مجھے۔ میں لیٹ گیا۔ نیند دیر تک نہیں آئی... کوئی پھانس سی بستر چبھو رہی تھی۔ یہ اُن کا اسکول تھا، یاد آیا، جسے ادھورا چھوڑ کر وہ چلی گئی تھیں۔ وہ آخری بار یہاں آئی تھیں کیا دیکھنے؟... مجھے یہاں دیکھتیں تو دیکھ کر ہنسنے لگتیں۔ تم وہیں آتے ہو جہاں سے میں چلی جاتی ہوں... وہ ہنسی تھی یا اُلاہنا... جیسے ہم ان کے سمے کی تلچھٹ پر اپنی بچی ہوئی زندگی کو کتر رہے ہوں، سمے کو چکھ رہے ہوں، میرا ساتھ، پر جیوی، جن کا اپنا ہونا دوسرے کے نہ ہونے کی دیوار پر ٹکا رہتا ہے۔

میں اور زیادہ کمرے میں نہیں رہ سکا، باہر چلا آیا۔

برآمدے کے باہر ہلکی پیلی سی چاندنی پھیلی تھی۔ جھاڑیوں پر جگنو اڑ رہے تھے — بھٹکتے تاروں سے ہوا میں تیرتے ہوئے۔ نرنجن بابو کی کاٹیج بہتی ہوئی دھند میں ساکت سی کھڑی تھی، کھلتی ہوئی، چھپتی ہوئی۔ تاریخ سے پہلے کی کسی گپھا سی، غمگین، سمے کی چھاتی پر اُدھر میں ٹنگی ہوئی۔ جنگل کی جڑی بوٹیوں کے بیچ میں پیڑ ساکت کھڑے تھے۔ صرف رسی کا جھولا دھیرے دھیرے جھونکے لے رہا تھا، اپنے خالی پن میں خود کو جھلاتا ہوا... میں بستر آ کر کمبل لپیٹ کر سو گیا۔ اس بار نیند کا انتظار نہیں کرنا پڑا۔ وہ خود چلی آئی تھی۔ صبح آنکھ کھلی تو چاروں سمت دھوپ کھلی تھی۔ گھاس، جھاڑیاں، پیڑوں کی پتیاں اوس میں چمک رہی تھیں۔ پتا نہیں کب ننکو چائے کی کیتلی ٹی کوزی میں دبا کر میز پر چھوڑ گیا تھا۔ چائے پی کر میں باہر چلا آیا۔ نرنجن بابو شاید بہت پہلے اپنے سیبوں کے باغیچے میں چلے گئے تھے۔

سارا گھر سونا پڑا تھا۔

دیوار کے نیچے ایک پتھر کی بنچ تھی۔ میں کچھ دیر وہیں بیٹھا رہا۔ پچھلی رات کی باتیں دھیرے دھیرے پاس آنے لگیں۔ باتوں کے بیچ کتنی ویران خاموشیاں چھپی تھیں۔ نرنجن بابو ان کے پیچھے رہتے تھے۔ میں اس دیوار کو کبھی نہیں لانگھ پاتا تھا۔ پر اس کے پیچھے وہ کیسے رہتے ہوں گے — اس کا تجسس بنا رہتا تھا۔

وہ کوئی سنت سنیاسی نہیں تھے۔ پوری ہری بھری گرہستی تھی۔ میری طرح اکیلے نہیں تھے۔ یونیورسٹی میں من چاہی نوکری کر سکتے تھے۔ پھر کیسے یہاں آنے کا فیصلہ لے لیا؟ یہ ابھی تک میرے

Scanned with CamScanner

لیے راز بنا تھا۔ کیا بھیتر کوئی ایسا کشٹ تھا جو کسی کو نہیں بتاتے تھے، جسے چپ چاپ جھیلتے یہاں چلے آئے تھے؟ پر اوپر سے تو دکھائی نہیں دیتا تھا۔ صرف چہرے پر کبھی کبھی چھایا سی آتی تھی۔ کیا کچھ ایسا تھا جسے وہ پیچھے چھوڑ آئے؟ نیچ کی دنیا میں جس کے بارے میں مجھے کچھ بھی معلوم نہیں تھا؟ مجھے ڈاکٹر سنگھ کی بات یاد آ گئی۔ تم یہاں ایسی عمر میں آئے ہو جب سب کا سب کچھ بیت چکا ہے۔ اور جو باقی بچا ہے وہ... وہ کیا ہے؟

کیا اسی کی تھاہ پانے لوگ اتنے اوپر چلے آتے ہیں، جہاں کھڑے ہو کر اپنی بیتی ہوئی زندگی کے کھنڈروں کو دیکھ سکیں؟

سورج دھیرے دھیرے آکاش کے بیچ چلا آیا تھا۔ نیچے کی ساری گھاٹیاں دھوپ میں جھلملا رہی تھیں۔ گاؤں کی جھونپڑیوں سے دھوئیں کی نیلی دھاریاں اوپر اٹھ رہی تھیں، سفید بادلوں میں گھلتی ہوئی جولا وارث سے گھاٹی کے اوپر منڈلا رہے تھے۔

میں دھیرے دھیرے اپنے کو گڑھوں سے بچاتا ہوا اسی ڈھلان سے نیچے اترنے لگا جس پر چڑھ کر کل شام اوپر آیا تھا۔

1.6

گھر لوٹا تو پتا چلا، ڈاکٹر سنگھ میری غیر موجودگی میں آئے تھے۔ مرلی دھر نے بتایا کہ بہت دیر مہرا صاحب کے کمرے میں بیٹھے رہے۔ کتنی دیر؟ میں نے پوچھا تو اس نے کچھ نہیں کہا، صرف چپ چاپ میں سر ہلا دیا۔ میرے لیے کوئی سندیش چھوڑ گئے تھے؟ میں نے پوچھا تو اسے کچھ یاد آیا۔ جیب سے ایک مڑا تڑا کاغذ کا ٹکڑا نکالا... اس پر جو لکھا تھا وہ ڈاکٹر سنگھ کا نام تھا اور کچھ نہیں... باقی کاغذ خالی پڑا تھا۔

مہرا صاحب کا بھی کوئی نشان دکھائی نہیں دیا۔ کاٹیج کے دروازے بند تھے۔ برآمدے کی کرسیاں خالی پڑی تھیں۔ اپنے کوارٹر کی اور لوٹا تو بجری کے فٹ پاتھ پر لید کا لوندا دکھائی دیا، دھوپ میں سوکھتا ہوا۔ سیٹھ سیاستین ہی وہاں اپنے ہونے کا سندیش پیچھے چھوڑ گیا تھا۔

میں سوچنے لگا، ڈاکٹر سنگھ کے پاس کیسے پہنچا جائے؟ مرلی دھر کو بھیج کر خبر لی جا سکتی تھی۔ اس کا کوئی فائدہ تھا؟ اگر کہنے لائق کوئی خبر ہوتی تو وہ پرچی پر نہ لکھ جاتے؟ لیکن اگر کوئی خبر نہیں تھی تو پرچی

پر اپنا نام چھوڑ کر جانے کی کیا ضرورت تھی؟ شاید وہ مجھے کچھ بتانا چاہتے تھے لیکن ڈرانا نہیں چاہتے تھے۔

کیسا ڈر؟ کس سے؟

ان کی کوٹھی دھوپ میں چمچما رہی تھی۔ وہاں سب دروازے بند پڑے تھے۔ کھڑکیوں کے شیشے چمک رہے تھے۔ پیچھے کی طرف، لک جھک جنگل کی مانند میں، مرلی دھر کے کوارٹر سے دھواں نکل رہا تھا۔ اس کے نیچے کھڈ کی کھوہ میں کہیں بھیڑوں بکریوں کی سیاتی چیخیں سنائی دے جاتی تھیں۔ جب باہر سب کچھ اتنا صاف ہو تو بھیتر ڈر کی دھکدھکی عجیب سنائی دیتی ہے — ایک ٹمٹماتے ٹونکے کی طرح، جو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔

میں نے جو صد بنور کر دروازہ کھٹکھٹایا۔ بھیتر کوئی آواز نہیں تھی۔ بیچ کے بڑے کمرے کی بتی جل رہی تھی۔ دن کے سمے میں بھی ان کی آدھی کانچ دھوپ میں نہاتی تھی، باقی کمرے اندھیرے میں ڈوبے رہتے تھے۔ میں کبھی دن کے سمے ان کے ساتھ نہیں بیٹھا تھا۔ کبھی کبھی جب وہ کسی کام سے بلوا بھیجتے تھے تو باہر برآمدے میں بیٹھ کر بات ہوتی تھی۔ مجھے پتا بھی نہیں چلتا تھا کہ میرے آنے سے پہلے وہ کیا کر رہے تھے، میرے جانے کے بعد کیا کریں گے۔ میرے لیے وہ رات کی مخلوق تھے جو دن کے اجالے میں اجنبی نہیں تو انجانے سے جان پڑتے تھے۔ یہ پہلی بار تھا جب میں بنا بلائے ان کی دن کی دنیا کے بند دروازے کو کھٹکھٹا رہا تھا۔

کوئی باہر نہیں آیا، کسی نے دروازہ نہیں کھولا۔ جیسے خالی گھر کے دروازے بند رہتے ہیں، ویسے ہی میں خالی باہر کھڑا رہا۔ میں پیچھے مڑ کر برآمدے کی سیڑھیاں اتر رہا تھا کہ مجھے لگا جیسے کوئی دروازے کے پیچھے کھڑا ہے جسے میں نہیں دیکھ سکا تھا لیکن جو مجھے جاتا ہوا دیکھ رہا تھا۔

یا یہ صرف میرا وہم تھا؟ اس ڈر کی چھایا جسے ڈاکٹر سنگھ کی پرچی خالی جگہ پر پیچھے چھوڑ گئی تھی؟ میں رکا نہیں، سیدھا چلتا گیا، جیسے بدشگونی کی چھایا سے چھٹکارا پانے کا یہی سب سے بہتر شارٹ کٹ ہو۔

بیڈمنٹن کورٹ پہنچ کر میں ٹھٹک گیا۔ یاد آیا، یہ وہی جگہ ہے جہاں میں ان سب سے پہلی بار ملا تھا۔ اس شہر میں میرا پہلا دن جہاں ایک اٹیچی میں میں اپنا سارا ماضی ساتھ لے آیا تھا اس سے چھٹکارا پانے کے لیے نہیں، صرف ایک پڑاؤ پانے کے لیے — ایک خالی بنچ پر بیٹھ کر جیسے کوئی یاتری

Scanned with CamScanner

اپنے پیچھے بچی ہوئی راہ کا جائزہ لینے کے لیے رک جاتا ہے۔ کورٹ کے کنارے وہ بنچ بھی خالی پڑی تھی۔ کچھ پرانے پیلے پتے ہوا میں اڑ کر اس پر آ بیٹھے تھے۔ سب کچھ اتنا شانت، اتنا ساکت تھا کہ نیچے پھیلے ہوئے جنگل کے نیلے سرمئی درزوں سے نکلی مَن، سناٹے کی آہٹیں ہی سنائی دیتی تھیں... ان کی کاٹج اور میرے کوارٹر کے بیچ ہوا کے نادیدہ پل سے گزرتی ہوئی۔ وہ جگہ جہاں کچھ دیر پہلے خوف کی چھاؤں گری تھی وہ کہیں بہت دور نکل گئی تھی۔ میرا 'میں' دھیرے دھیرے مجھ سے بچ کر وہاں چلا آیا جہاں بیڈمنٹن کا کورٹ تھا، دوپہر کی ڈھلتی دھوپ میں ڈوبا ہوا۔ کورٹ کے باہر گری ہوئی چڑیا کو میں نے پہلے دن ان کے ہاتھ میں رکھا تھا اور وہ مجھے ہکا بکا دیکھ رہی تھیں، جیسے مردہ وہ نہیں، میں تھا جو پیچھے رہ گیا تھا۔ ایک مردا ئیور، جو کھاتا ہے پیتا ہے، دیکھتا ہے، لیکن جیتا نہیں... نہیں، جیتا ہے، لیکن جیتی روح کی طرح نہیں۔ نہیں، مردہ نہیں، لیکن ایک ایسے اندیشے میں ڈوبا ہوا جسے ایک دن مسز مہرا نے انا جی کے سامنے ظاہر کیا تھا۔ وہ زمین میں دبنے سے پہلے ایک ٹیسٹ لینا چاہتی تھیں، یہ جانچنے کے لیے کہ وہ سچ مچ مردہ ہیں یا تھوڑی سی جیوت، یا تھوڑی سی مردہ ہیں پر سچ مچ جیوت... یا کچھ بھی نہیں۔

کیا وہ میرا ٹیسٹ لے رہی تھیں، یہ جاننے کے لیے کہ میں ان کے پاس کتنا مردہ ہو کر آیا ہوں؟ کتنا جیوت؟ شاید انھیں معلوم تھا کہ ان کے پتی کے پاس وہی آدمی رہ سکتا ہے جو اپنے کو چھوڑ کر، خالی ہو کر آیا ہو۔ انھوں نے ضرور مجھ میں کچھ دیکھا ہوگا کہ یہ آدمی امتحان میں صحیح اتر سکتا ہے... ایک ایسا امیدوار جس کے پیچھے لوٹنے کی کوئی امید نہیں دکھائی دیتی تھی۔

مجھے پتا نہیں چلا میں کب اپنی کوٹھری کے برآمدے میں بیٹھ گیا۔ میں شاید کافی دیر تک بیٹھا رہا تھا۔ دھوپ میں آنکھ لگ گئی تھی — دوپہر کی جھنجھناتی نیند، سونے نہ سونے کے دو کناروں کے بیچ بہتی ہوئی، مجھے دو سیاروں کے بیچ بہاتی ہوئی۔ ایک وہ جو یہاں آنے سے پہلے میری زندگی تھی، جس کی چھایائیں اپنا کنارہ چھوڑ کر میرے کنارے آ لگی تھیں۔ اور تب مجھے لگتا کہ یہ دھوپ، یہ ہوا، یہ بیڈمنٹن کا کورٹ ایک دوسرا سیارہ ہے۔ دونوں ایک ساتھ بہہ رہے ہیں۔ ندی پر برف کے لوندوں کی طرح جب وہ ایک دوسرے سے ٹکراتے تو جھٹکے سے میری نیند کھل جاتی۔ مجھے لگتا جیسے میں جاگتے ہوئے جی رہا تھا، وہ نیند میں الٹا بہتا ہوا میرے پاس آ رہا تھا — کچھ میرے جیسا، پر ہوبہو میرے جیسا نہیں، مجھ سے الگ... میرے بھیتر کے ہر اندھیرے کونے کو، جہاں میں چھپ کر بیٹھا تھا، چیرتا پھاڑتا ہوا، اوپر

Scanned with CamScanner

سخ پر کھینچا ہوا... بیڈمنٹن کورٹ کی بیچ پر، جہاں اڑتے ہوئے پتوں کے بیچ میں بیٹھا تھا۔

میں اپنی کوٹھری میں لوٹ آیا۔ جیسا تھا ویسے ہی پلنگ پر لیٹ گیا۔ کچھ دیر بعد کسی نے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نے جلدی سے اپنی نوٹ بک اور پنسل نکالی۔ سوچا، انھوں نے بلایا ہے، لیکن جب دروازہ کھولا تو مرلی دھر کا لڑکا جنسی دکھائی دیا۔ وہ کھانے کی تھالی لایا تھا۔

"باہر کھائیں گے یا بھیتر لگا دوں؟"

"تمھارے بابو کہاں ہیں؟"

"وہ صاحب کے پاس ہیں۔"

میں نے شک سے اس کی اور دیکھا۔ میلے، پہاڑی، گول مٹول چہرے پر کچھ دکھائی نہیں دیا جس سے ان کے بارے میں اندازہ لگ سکے۔

میں نے بتی کھولی اور اسے بھیتر آنے دیا۔ کھانا میز پر لگا کر جب وہ جانے لگا تو میں نے اسے روک لیا۔ "دیکھو، جب مرلی دھر آئے تو اس سے کہنا، میں نے بلایا ہے۔"

اس کے جانے کے بعد بھی میں دیر تک برآمدے میں بیٹھا رہا۔ کاٹیج کی بتیاں جل رہی تھیں لیکن کہیں کوئی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ ایک بار اچھا ہوئی کہ ڈاکٹر سنگھ کے گھر جا کر ان سے پوچھوں لیکن میں گیا نہیں۔ کوئی فکر کی بات ہوتی تو وہ ضرور خبر کرتے۔ میں دیر تک مرلی دھر کے انتظار میں بیٹھا رہا۔ اس رات وہ نہیں آیا۔

دوسرے دن بھی نہیں۔ نہ تیسرے دن۔ مجھے لگا، وہ دونوں ہی مجھے بھول گئے ہیں، جیسے میں وہاں ہوں ہی نہیں۔ نوٹ بک کے پنے خالی رہے۔ میں ان میں تاریخیں ڈالتا جاتا جن میں خالی دنوں کی سفیدی تیزی سے سرکتی جاتی۔ پہلی بار اپنے مکان میں مجھے ایک عجیب ڈر نے پکڑ لیا، جیسے کوئی ایسا بھید ہے جو میرے سوا سب کو معلوم ہے۔ میں باہر ٹہلنے نکلتا تو لگتا جیسے کھنڈ کی کھوہ، جنگل کی سائیں سائیں، پہاڑوں کی ڈھلانوں سے کوئی چیز سر اٹھا کر مجھے دیکھ رہی ہو، ہنس رہی ہو... میرے پیچھے پاؤں پر پاؤں رکھ کر آ رہی ہو۔ لیکن جوں ہی میں مڑ کر دیکھتا تو کوئی نہیں، کچھ بھی نہیں... جھٹ سے کوئی پیچھے ہٹ جاتا اور خالی تاریخوں کے بیچ ٹھٹکا سے پہلے کی طرح بہنے لگتا۔

شاید یہ چوتھا دن رہا ہوگا کہ میں نے اچانک فیصلہ لے لیا۔

Scanned with CamScanner

کوٹھری کی سیلن اور سناٹے سے باہر نکل آیا۔ اپنی کوٹھری سے اترنے والی پگڈنڈی سے نیچے اترنے لگا جو جھاڑ جھنکاڑ کے بیچ بل کھاتی ہوئی سیدھی بازار کے بیچ گزر کر نیچے گاؤں کی اور جاتی تھی۔

ڈاکٹر سنگھ کی کلینک بازار کے بیچ ہوتے ہوئے بھی اس سے الگ جان پڑتی تھی۔ بازار کی ہموار سڑک سے سیڑھیاں اتر کر جانا پڑتا تھا۔ اوپر سے دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے کسی بھونچال یا لینڈ سلائیڈ سے مین روڈ کا ایک حصہ نیچے دھنس گیا ہو، جبکہ ایسا کچھ نہیں تھا۔ دو دکانوں کے بیچ اپنی کلینک بنانے کی بجائے ڈاکٹر سنگھ نے لوہے کی ریلنگ لگوائی تھی، جس کے نیچے سیڑھیاں اتر کر جب مریض ان کے ویٹنگ روم میں جاتے تھے تو لگتا تھا جیسے وہ بازار کے نیچے کسی وسعت میں چلے آئے ہوں۔ وہیں کچھ کرسیاں، بنچیں اور ٹیبل لگے رہتے تھے۔ سامنے ایک پردہ لگا تھا، جس کے پیچھے ڈاکٹر سنگھ اپنی کیبن میں چھپے بیٹھے رہتے تھے اور اس کے آگے راوت جی۔

راوت جی اسٹول پر آلتی پالتی بیٹھے رہتے تھے۔ جب پہلی بار مسز مہرا مجھے ڈاکٹر سنگھ کے پاس لائی تھیں تب بھی وہ ویسے ہی بیٹھے تھے۔ ان کی دھوتی کے پھیلاؤ میں اسٹول ڈھکا رہتا تھا اس لیے پتا نہیں چلتا تھا کہ وہ اسٹول پر بیٹھے ہیں یا فرش پر۔ میں انھیں وہاں دیکھنے کا اتنا عادی ہو گیا تھا کہ جب کبھی وہ بازار میں ملتے تو لگتا جیسے وہ اسٹول پر بیٹھے چلے آ رہے ہیں۔ ان کی جیسی چھوٹی قد کاٹھی تھی ویسا ہی لگا بندھا کام تھا۔ پردے کے پیچھے سے جیسے ہی مریض باہر نکلتا ویسے ہی وہ نئے مریض کا نمبر بولتے۔ کوئی لائن سے باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ ان کے ماتھے پر تلک اور کندھے پر پڑی پیلی شال سے لگتا جیسے پردے کے پیچھے کوئی ڈاکٹر نہیں، دیوتا بیٹھے ہوں جن کا درشن صرف ان کی مہربانی سے کیا جا سکتا ہے۔ پردے پر انھوں نے ایک تختی سے اپنی تحریر میں اصول بھی لکھے تھے: **Rules and Regulations**۔ پورے دس ہندی میں، لیکن آخری لائن انگریزی میں:

Please bear with us

نیچے انھوں نے اپنے دستخط ایک ایسی لپی میں کیے تھے کہ اس میں سامنت سنگھ راوت کا نام ایک ایسی تلی کی طرح دکھائی دیتا تھا جو دو چوہوں کے بیچ بھاگ رہی ہو۔

مجھے دیکھتے ہی انھوں نے سارے اصول توڑ دیے۔ مجھے ہاتھ کے اشارے سے پردے کے

پیچھے جانے کے لیے کہا۔ میں نے ہاتھ سے ہی منع کر دیا، پر وہ کہاں ماننے والے تھے۔ کافی دیر تک ہم دونوں کے بیچ — مریضوں کے آر پار — خاموش اشاروں کا پینٹو مائم چلتا رہا۔ آخر ہار کر وہ اپنی جگہ بیٹھ رہے، میں اپنی جگہ پر۔ مریضوں میں زیادہ تر لوگ گاؤں کے جان پڑتے تھے۔ مردوں کے کپڑے لگ بھگ ایک جیسے تھے — تنگ مہری کا پاجامہ، لمبی قمیض یا بش شرٹ، اوپر چھاتی پر لپٹی ہوئی چادر۔ کچھ رئیس سے لگنے والے مریضوں نے چوکور سائز کی بھوری ٹوپی بھی پہن رکھی تھی۔ سب کے جوتوں پر دھول کی تہیں جمع تھیں، جن کے پیچھے ان کا اصلی رنگ چھپ گیا تھا۔ وہ تلہٹی میں بسے گاؤں سے یہاں آئے تھے۔ کچھ لوگوں نے یہاں آنے سے پہلے بازار سے خریداری کی تھی۔ انھوں نے اپنے بھرے ہوئے جھولوں کو بغل میں دبا رکھا تھا۔ بورڈ پر لکھے اصولوں میں سے شاید سب سے زیادہ تکلیف دہ اصول سگریٹ نوشی کی مناہی تھی، شاید اسی لیے ہر تیسرا آدمی باہر چھجے پر سگریٹ بیڑی پینے نکل جاتا تھا۔

وہ چھجا ہی میرا اصلی ویٹنگ روم تھا۔ بھیتر کے دم گھوٹتے ماحول سے چھٹکارا پانے کے لیے میں اکثر وہاں آکر بیٹھ جاتا تھا۔ بازار کے باہر نکلا ہوا وہ چھجا جھولے کا کھٹولا سا جان پڑتا تھا — ٹھیک ہوا کے بیچ ٹنگا ہوا۔ نیچے گھاٹی کا ہرا چمکیلا وستار دکھائی دیتا تھا۔ لمبے دیوداروں کے جھرمٹ، گاؤں کی جھونپڑیاں، کھیت۔ موٹر روڈ پر اڑتی ہوئی ٹرکوں کی دھول۔ جب بھی بازار کے بیچ سے کوئی دھڑدھڑاتا ٹرک یا لاری یا روڈویز کی بس نکلتی تو ایسا لگتا جیسے جھولے کا ڈبا اوپر اٹھنے والا ہو، جس میں ڈاکٹر سنگھ، ان کے مریض اور راوت جی، سب بیٹھے ہوں... ہوا میں اڑتی ہوئی ایک اوپن ایر کلینک... بازار اور پہاڑی کے بیچ خلا میں لٹکی ہوئی۔

"کیا سب مریض چلے گئے؟" راوت جی میرے سامنے کھڑے تھے۔ میں نے ان کی اور دیکھا۔

"کب کے... میں نے سوچا، آپ بھی چلے گئے۔ آئیے میرے ساتھ!"

میں ان کے ساتھ بھیتر چلا آیا۔ پردے کے پیچھے آخری مریض باہر نکل رہا تھا۔ ساری بنچیں، کرسیاں خالی پڑی تھیں، جیسے فلم شو کے بعد سنیما کا ہال دکھائی دیتا ہے... خالی اور اجاڑ۔ راوت جی نے پردہ اٹھایا۔ دوسرے پل میں ڈاکٹر سنگھ کے سامنے کھڑا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ ہنسے نہ مسکرائے... کچھ سوچنے لگے، جیسے میرے وہاں آنے کا کارن کھوج رہے ہوں۔

Scanned with CamScanner

"بیٹھو،" انھوں نے کہا، مانو میں بھی ان کا مریض ہوں۔ کچھ دیر تک وہ چپ رہے پھر کہا، "یہاں کیسے؟"

"آپ کچھ دن پہلے مہرا صاحب کو دیکھنے آئے تھے؟"

"آیا تو تھا، تم وہاں نہیں تھے۔"

"میں نرنجن بابو کے گھر رہ گیا تھا... لوٹ کر پتا چلا، آپ آئے تھے۔"

وہ چپ بیٹھے رہے۔ ہاتھ میں کالا فاؤنٹین پین اپنے پیڈ پر گھماتے رہے، جس پر وہ نسخے لکھتے تھے۔ پھر کچھ یاد آیا۔ پین کو وہیں پیڈ پر رکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ میز کے پیچھے ایک کونے کی دیوار پر سوئچ دبایا۔ نیچے بیسن تھی، اس کے اوپر تکونی شکل کا شیشہ تھا، جس میں ان کا چہرہ جھانک رہا تھا۔ صبح کی ڈاڑھی کی نیلی چھاؤں دھیرے دھیرے بڑھتی ہوئی دونوں گالوں پر سرک آئی تھی۔ انھوں نے بیسن کی ٹونٹی کھولی اور صابن سے اپنے ہاتھ دھونے لگے... ایک بار، دو بار، خوب رگڑ رگڑ کر مجھے ہمیشہ حیرانی ہوتی تھی کہ ہر ڈاکٹر اپنے ہاتھوں کو اتنی مستعدی سے کیوں دھوتا ہے۔ مریض کو چھوا نہیں کہ ہاتھ دھونے کی جلدی رہتی ہے... کیا جراثیم سے چھٹکارا پانے کے لیے وہ ایسا کرتے ہیں؟

تولیے سے ہاتھ پونچھتے ہوئے وہ بولے، "گھر سے ہی آ رہے ہو؟"

میں چونک گیا، جیسے وہ اپنے سے ہی بول رہے ہوں، لیکن نہیں... شیشے میں کہیں انھیں میں بھی دکھائی دے رہا ہوں گا۔ وہ اسی سے پوچھ رہے تھے۔

"ہاں! سیدھا گھر سے..." میں نے جیب سے پرزہ باہر نکالا، جیسے وہ ان کا پرسکرپشن رہا ہو۔ "آپ اسے مرلی دھر کے پاس چھوڑ گئے تھے؟"

"مجھ سے کیا پوچھنے آئے ہو؟"

"ان کے بارے میں... کیا سوچتے ہیں آپ؟"

وہ مڑ گئے لیکن بیٹھنے کے بجائے اپنے کمرے کی کھڑکی کھول دی۔ مجھے حیرانی ہوئی کہ کھڑکی کے باہر ایک چبوترہ تھا جس کے چاروں طرف لوہے کی ایک ریلنگ لگی تھی۔ پیچھے آکاش میں پہاڑیاں سر اٹھائے کھڑی تھیں جن پر گزری ہوئی دھوپ کی ایک ہلکی پیلی روشنی چمک رہی تھی۔

"یہ میری آرام گاہ ہے،" انھوں نے کہا۔ "یہاں بیٹھتے ہیں۔" وہ بیچ بیچ ایک ہوائی ہنڈولا سا

جان پڑتا تھا، ایک جھروکے کی طرح باہر نکلا ہوا، ہرے شیڈ سے ڈھکا ہوا۔ نیچے ایک چوکی تھی اور بید کی کرسیاں۔ "مریضوں کے جانے کے بعد میں یہیں بیٹھتا ہوں..."

وہ میرے ساتھ بیٹھے تھے، سامنے نہیں۔ یہ اچھا ہی تھا کہ میں انھیں دیکھ نہیں سکتا تھا۔

"اب بتاؤ، کیا پوچھنا چاہتے ہو؟"

"کیسے ہیں مہرا صاحب؟"

"ایک روٹین چیک اپ، اور کچھ نہیں۔"

میں دھیان سے ڈاکٹر سنگھ کے چہرے کی اور دیکھنے لگا۔ وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ اگر کچھ تھا، تو میں اسے پڑھ نہیں سکتا تھا۔

"آپ کو کوئی چنتا کی بات دکھائی دیتی ہے؟"

"کیسی چنتا؟ مجھے کچھ بھی ایسا دکھائی نہیں دیتا جس کے لیے تم چنتا کرو۔"

"آپ کو ان میں کوئی تبدیلی نہیں دکھائی دیتی... کچھ ایسا جو پہلے نہیں تھا؟"

"میں شریر کو دیکھتا ہوں۔ ننگی آنکھ سے نہ دکھائی دے تو ایکسرے سے دیکھا جا سکتا ہے... لیکن من کے بھیتر جو ہوتا ہے اسے دیکھنے کا کوئی آلہ ابھی ایجاد نہیں ہوا... تم جان سکتے ہو؟"

ڈاکٹر سنگھ کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ چبوترے کی ریلنگ کے پاس چلے آئے۔

"یہاں آؤ۔"

میں ان کے پاس چلا آیا۔ ٹھنڈی ہوا میں پیڑوں کی پھنگیاں کانپ رہی تھیں۔ بازر کی آوازیں ایک عجیب گنگناہٹ میں نیچے سے اٹھ رہی تھیں... آدھی دھوپ، آدھے اندھیرے کے ڈانواڈول اجالے میں چٹانیں کسی طلسماتی، حول کے پکشی سی جان پڑتی تھیں۔ اپنے پتھریلے پنکھوں کے ساتھ ہوا میں جمی ہوئی...

"دیکھتے ہو..." انھوں نے دھیرے سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا... "ان چٹانوں کو... یہ پتھار جو پہاڑوں کے بیچ چلا گیا ہے، جانتے ہو یہ سب سمندر کے نیچے تھا اور جہاں ہم کھڑے ہیں وہاں پتا نہیں کتنے جل جنتو میری کلینک کے چاروں طرف دوڑتے پھرتے تھے... کہاں ہیں اب وہ سب؟ کیا تم ان کے جینے، ان کے ہونے کا ایک بھی سراغ دیکھ سکتے ہو؟ کہاں چلے گئے سب؟ کہاں ہیں وہ؟"

Scanned with CamScanner

وہ ایک پل رکے... پھر ایک اچکتی سی آواز اوپر اٹھی۔ ''وہ سب یہاں ہیں... لیکن ہم انھیں دیکھ نہیں سکتے! تمھیں معلوم ہے ان چٹانوں کی اندرونی پرتوں میں کتنے فوسل جمع ہیں؟ مرے ہوئے جانوروں کے استھی پنجر ہی مدت بعد چٹانوں کا روپ دھارن کر لیتے ہیں۔ جیو اور بے جان میں کوئی فرق نہیں... ایک بہت بڑی کایا کلپ، میٹا مورفوسس۔ ہر چیز بدل جاتی ہے، لیکن رہتی وہی ہے جیسی لاکھوں سال پہلے تھی۔ شیکسپیئر کے ڈرامے دیکھے ہیں؟ کیسے ایک ایکٹر اسٹیج پر الگ الگ شکل میں آتا ہے... ہمیں لگتا ہے وہ کوئی دوسرا ہے جسے ہم دیکھ رہے ہیں، جبکہ دوسرا وہی ہے جو پہلے ایکٹ میں آیا تھا۔ جسے تم تبدیلی کہتے ہو وہ سب کچھ کے بھیتر بہتی ہوئی لیلا ہے... رام لیلا!''

وہ ہنس رہے تھے یا صرف مجھے چڑا رہے تھے جیسی ان کی عادت تھی۔ میں انھیں دیکھ نہیں سکتا تھا... جب وہ بول رہے تھے، پہاڑ اندھیرے میں چھپ گئے تھے۔ جنگل کے آر پار ایک دھند بھرا وستار پھیلا تھا جہاں دو چار بتیاں جگنوؤں سی ٹمٹما رہی تھیں۔ چیڑوں کی سوئیاں ایک چمکیلی سی دھند میں کسی اکیلے سامراج کا حصہ جان پڑتی تھیں... اس طرح جھکی ہوئی جیسے وہ بھی ڈاکٹر سنگھ کی آواز کو اپنے دھیان میں سن رہی ہیں...

جس لمحے ڈاکٹر سنگھ ابدیت کی بات کر رہے تھے ٹھیک اس لمحے سارا جنگل ایک الگ بھیس بدل کر عجیب آکاروں میں ڈھل گیا تھا۔ وہاں نہ پتھر تھے، نہ پہاڑ، نہ پیڑوں کی جھرمٹ... صرف اندھیرا، اندھیرے کا گاڑھا نیلا وستار...

''کچھ دکھائی دیتا ہے؟'' ڈاکٹر سنگھ کی آواز سنائی دی۔ ''جہاں کچھ دکھائی نہیں دیتا اسی کے بھیتر اوجھل کچھ ہو رہا ہے... کل صبح اٹھ کر دیکھو گے تو تمھیں حیرانی ہوگی، جنگل کے بھیتر تمھاری آنکھوں سے اوجھل کتنا کچھ ہو رہا تھا جس کی تم کلپنا بھی نہیں کر سکتے! یہ ڈراما ہر روز ہوتا ہے... صرف باہر نہیں، بلکہ آدمی کی دیہہ کے بھیتر... بلکہ وہاں سب سے زیادہ... گلتی ہوئی ہڈیاں، رنگ بدلتی خون کی چاپ، دل کے خانے میں دھڑکتا ہوا شور... ایک کایا کے بھیتر کتنی سانسوں کے سانپ پھنکارتے ہوئے بھاگتے ہیں، کوئی اندازہ لگا سکتا ہے؟ اور آپ مجھ سے پوچھتے ہیں، مہرا صاحب کے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟''

وہ چپ ہو گئے... پھر ایک لمبی خاموشی کے بعد بولے، ''ستر برس کے ڈھانچے میں کتنا کچھ سوکھ گیا ہے، بدل گیا ہے، بہہ گیا ہے... یہ میں آپ کو بتا سکتا ہوں؟ شاید بتا سکتا، اگر انھیں کوئی بیماری

ہوتی... کوئی بخار، کسی طرح کا دکھ درد، کوئی نیس، کوئی ٹیومر... تب ان میں سے کسی کو پکڑ کر ان کے بھیتر جھانک سکتا تھا... کون سی جگہ ہے جہاں روڑا اٹک گیا ہے... کیسے اسے نکالا جاسکتا ہے... لیکن اگر ایسا کچھ نہ ہو، سب کچھ شانت اور ہموار ہو... تب کوئی دروازہ نہیں جسے کھول کر آپ ان کے بھیتر داخل ہو سکیں۔ کیا آپ سوچتے ہیں کہ ایکسرے کی تصویریں جسم کے بھیدوں کو پاسکتی ہیں؟ نہیں جی، یہ سب سے بڑا ایلوژن ہے... آپ کو لگتا ہے سب کچھ نارمل ہے، اور یہ سب سے بڑی چھلنا ہے... کیونکہ سچ بات یہ ہے کہ نارمل کچھ بھی نہیں ہوتا... پیدا ہونے کے بعد کے لمحے سے ہی آدمی اس حالت سے دور ہو جاتا ہے جسے ہم 'نارمل' کہتے ہیں... نارمل ہونا جسم کی خواہش ہے، اصلیت نہیں... جسم کا آخری سندیش صرف موت کے سامنے کھلتا ہے، جیسے وہ بلی کی طرح جبڑوں میں دبا کر شونیہ میں غائب ہو جاتی ہے... جیسے ایلس کے سامنے چیشائر بلی غائب ہو جاتی تھی... صرف اس کی مسکراہٹ دکھائی دیتی رہتی ہے...'' ڈاکٹر سنگھ ہنسنے لگے... ور تب بھی ہنستے رہے جب اسی لمحے راوت جی پردہ کھول کر اچانک نمودار ہو گئے، جیسے وہ بھی کسی حیران کن دنیا کے باسی ہوں۔

''جی، میں جاؤں یا ابھی...؟'' راوت جی نے کچھ ہچکچاتے ہوئے کہا۔

''آپ ابھی تک گئے نہیں؟'' ڈاکٹر سنگھ نے احساسِ جرم کے سے انداز میں راوت جی کو دیکھا، جس میں ایک ہلکی سی چڑ بھی دبی تھی۔ ''آپ چلیے، کلینک میں بند کر دوں گا۔ اور دیکھیے، آپ گھوڑے پر بیٹھ کر ہی جائیے... آج میں پیدل ہی گھر جاؤں گا۔''

راوت جی نے اپنی ٹوپی کو ٹھیک سے سر پر جما دیا۔ جانے سے پہلے پوچھا: ''کچھ نمکین چاہیے تو بازار سے لے آؤں؟''

''نہیں... اب کچھ نہیں۔ ہم بھی کچھ دیر بعد چلتے ہیں۔''

راوت جی کے جانے کے بعد سب کچھ ہلکا سا ہو گیا۔ چبوترے کے باہر ہوا میں دھند چھٹ چلی تھی... بازار کی آوازیں بہت پہلے اندھیرے میں ڈوب گئی تھیں... صرف جھینگروں کی لگاتار تان جنگل کے کسی اندرونی استھل سے اٹھ رہی تھی، سناٹے کو اور بھی گھور، گھنا بناتی ہوئی۔

ڈاکٹر سنگھ نے اپنی میز کی دراز سے ایک فلاسک باہر نکالا۔ دو گلاس۔

انھوں نے فلاسک سے برانڈی میرے گلاس میں ڈالی... جو تھوڑی سی بچی رہ گئی تھی اسے

Scanned with CamScanner

اپنے گلاس میں ڈالتے ہوئے میری اور دیکھا... ''اب تو ٹھیک ہو؟ جب تم میری کلینک آئے تو تمھارا چہرہ دیکھ کر میں ڈر گیا تھا...'' انھوں نے گلاس میں سے ایک لمبا، گہرا گھونٹ لیا... ایک گہری سی سانس اوپر آئی۔ ''تم نے بہت بڑی غلطی کی۔''

میں نے تعجب سے انھیں دیکھا۔ ''کیسی غلطی؟''

''تم یہاں آئے، سو تو ٹھیک تھا... لیکن جب مسز مہرا ہی نہیں رہیں، اس کے بعد تم چلے جاتے... اس سب سے بچ جاتے۔''

''کس سے بچ جاتا؟''

''وہ جو پیچھے چھوڑ گئی ہیں...'' انھوں نے پھر ایک لمبا گھونٹ لیا، رومال سے منہ پونچھا۔ ''میں نے تم سے کہا تھا نا، انھوں نے کیوں بلایا تھا؟ وہ جاننا چاہتے ہیں، انھیں یہاں اور کتنے دن رہنا ہے...''

میں نے ان کی اور دیکھا۔ ''کیا وہ کہیں جا رہے ہیں؟''

وہ ہنسنے لگے۔ ''یہاں سے کوئی اور کہاں جا سکتا ہے؟''

''اپنی بیٹی کے پاس،'' میں نے کہا

''بیٹی بھی تو یہیں رہتی ہے... اس دنیا میں!'' انھوں نے اوپر آکاش میں دیکھا جہاں چاروں طرف تاروں کے ٹمٹماتے جھرمٹ، نچھتر منڈل، گرہ لوک چمک رہے تھے۔ ''نہیں، ان کا مطلب اس دنیا سے نہیں تھا!''

ایک عجیب شبہے نے مجھے پکڑ لیا۔ ''پھر کس سے تھا؟''

''شاید اپنی آخری چیزوں سے۔'' ان کا لہجہ بہت کومل سا ہو آیا۔ ''ہوٹل کا کمرہ چھوڑنے سے پہلے جیسے ہم ایک بار ٹٹول لیتے ہیں، وارڈ روب میں کوئی کپڑا تو نہیں چھوٹ گیا، کوئی انڈر ویئر، میلا کچیل رومال... باتھ روم میں شیو کا سامان... ہم کچھ بھی ایسا پیچھے نہیں چھوڑ دینا چاہتے جس کے لیے بعد میں شرم محسوس ہو۔ تم سے بھی کچھ کہا ہے؟''

''نہیں، اس بارے میں کچھ بھی نہیں۔''

''ہو سکتا ہے... انھوں نے اپنے کام الگ الگ لوگوں کو سونپ دیے ہیں... تمھیں جیسے اپنا ماضی لکھاتے ہیں ویسے مجھ سے اپنے مستقبل کے بارے میں پوچھنا چاہتے ہیں... جس کے پنّے کورے

پڑے ہیں۔"

"لیکن کیوں؟"

"پیٹرن" ڈاکٹر سنگھ مسکرائے۔ "ترتیب! وہ ایک ترتیب دیکھنا چاہتے ہیں۔ اپنے بیٹے اور ان بیٹے کے بیچ۔ تم تو جانتے ہو، وہ ایک اونچے افسر رہے ہیں۔ جب تک کسی فائل پر ان کے دستخط نہیں ہو جاتے وہ ویلڈ (valid) نہیں ہوتا... وہ یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ آخری فائل پر ان کے نہیں، کسی اور کے دستخط ہوتے ہیں... جس کے بنا پر پیٹرن ادھورا رہتا ہے!"

وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ فلاسک اور دونوں گلاس بیسن کے نیچے رکھ کر نل کی دھار چھوڑ دی... انھیں ویسے ہی رگڑ رگڑ کر دھونے لگے جیسے کچھ دیر پہلے اپنے ہاتھ دھو رہے تھے۔

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ "اچھا، میں چلتا ہوں۔"

انھوں نے تولیے سے ہاتھ پونچھتے ہوئے مجھے دیکھا۔ "کہاں جاؤ گے؟"

"گھر!" میں نے کہا۔

وہ کچھ سوچتے رہے، پھر میرے پاس آئے۔ کندھے پر دیر سے ہاتھ رکھا۔

"تمھیں کچھ دکھانا چاہتا تھا۔"

وہ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے چبوترے پر لے آئے۔

"دیکھو، سامنے کیا دکھائی دیتا ہے؟"

دھند بیچ بیچ چھٹ گئی تھی، ہر پہاڑی سے الگ سر اٹھائے کھڑی تھی۔ اناڈی کا نج اندھیرے میں ٹمٹما رہی تھی جیسے کوئی تارا آکاش سے گرتا ہوا ٹیلے پر جا اٹکا تھا۔ اس کے اوپر پہاڑی کے بازو پر کہیں نرنجن بابو کا باغیچہ دھند میں لپٹا تھا... اور ان دونوں کے بیچ کہیں میرا صاحب کا گھر تھا، جس کے ہونے کا آبھاس صرف ان تین چمنیوں سے لگتا تھا جو میری کوٹھری سے اتنی دیو ہیکل جان پڑتی تھیں مگر یہاں سے صرف ماچس کی تیلیوں سی دکھائی دیتی تھیں، جنھیں ہوا کا جھونکا اپنے ساتھ کبھی بھی اڑا کر لے جا سکتا تھا۔

اچانک میری گھومتی نگاہیں ایک خالی جگہ پر ٹھٹک گئیں جس کے چاروں طرف صرف پیڑوں کی فینس دکھائی دیتی تھی... ایک چوکور سا سفید، سنگ مرمری چکتا... تاروں کی ساکت روشنی میں چمکتا ہوا...

Scanned with CamScanner

"وہ کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"سمٹری،" ڈاکٹر سنگھ کی آواز پیچھے سے سنائی دی۔ "یہی ایک ایسی جگہ ہے جو ہر طرف سے دکھائی دیتی ہے — شہر کی سب سے پرانی آرام گاہ۔"

وہ ہنس رہے تھے۔ میں انھیں نہیں سن رہا تھا۔ میں کسی اور دن میں چلا گیا تھا۔ وہ میرے آگے کھڑی تھیں۔۔ وہ اپنے رومال سے آنکھیں پونچھ رہی تھیں...

"کیا بات ہے، چپ کیوں کھڑے ہو؟"

"کچھ نہیں... مجھے کچھ یاد آ گیا تھا۔"

"سمٹری کو دیکھ کر؟ تمھارا یہاں کون ہے... جسے یاد کرتے ہو؟"

"کوئی نہیں... صرف ان کی ہنسی جو نیچے جا رہی تھی۔"

کچھ دیر بعد انھوں نے کہا، "چلیں؟"

"چلیے،" میں نے کہا۔

1.7

پچھلی رات دیر تک نیند نہیں آئی۔ اندھیرے میں دھائیں دھائیں کی آواز سنائی دیتی رہی، جیسے کوئی دور پہاڑی پر چاند ماری کر رہا ہو۔ باہر برآمدے میں آیا تو پایا کہ آواز انا جی کی کاٹیج کی طرف سے آ رہی ہے... کیا وہ بندوق لے کر کسی بھیڑیے کو بھگا رہی تھیں، جو کبھی کبھار اپنے کھانے کی کھوج میں پہاڑی سے نیچے اتر آتے تھے؟

انا جی اکیلی رہتی تھیں۔۔ اکیلے گھروں کے اپنے ڈر ہوتے ہیں۔ ان کی کوئی حد بندی نہیں ہوتی۔ کوئی باؤنڈری نہیں جو انھیں روک سکے۔ کوئی بھی قلانچیں مارتا ہوا کمرے میں آ سکتا تھا، انا جی کی نیند کو جھنجھوڑ سکتا تھا، بستر سے اٹھا کر خود بستر پر لیٹ سکتا تھا، جیسے وہ سارے گھر کا مالک ہو... انا جی بندوق لے کر جانوروں کو تو ڈرا سکتی تھیں، لیکن کیا ڈر کو بھگا سکتی تھیں جو باہر نہیں، گھر کے خالی کونوں میں دبکا رہتا تھا؟

کس سے ڈرتی تھیں انا جی؟

Scanned with CamScanner

بہت سال پہلے انھوں نے یہ کاٹیج ایک بنگالی آئی سی ایس افسر سے خریدی تھی۔ وہ پوجا کی چھٹیوں میں یہاں آکر رہتے تھے۔ ان کی کوئی اولاد نہیں تھی، اسی لیے جب ان کی پتنی کی موت ہوئی تو انھوں نے کاٹیج کو بیچ کر کلکتہ میں ہی رہنے کا فیصلہ کیا۔ میری ہی طرح اماجی بھی اشتہار پڑھ کر اس شہر میں آئی تھیں۔ فرق اتنا ہی تھا کہ میں کسی پرائے کی حفاظت کے لیے بلایا گیا تھا، وہ اپنی حفاظت کے لیے آئی تھیں۔ ''جانتے ہو، میں جب بنگالی بابو سے ملی، انھوں نے کیا کہا؟'' اماجی ہنس کر بتاتی ہیں... ''مجھ سے پوچھنے لگا، میڈم، کیا آپ بھوت پریتوں میں وشواس کرتی ہیں؟ میں نے کہا، نو بابا، آئی لیفٹ دیم بیک ہوم!'' وہ ٹھہاکا مار کر ہنس پڑیں۔ بنگالی بابو کیا سچ سچ اماجی کو کچھ بتانا چاہتے تھے اور بڑھیا کی پاگلوں کی سی ہنسی دیکھ کر چپ سادھ گئے تھے؟

اس بات کو برسوں بیت گئے... اور آج؟ آج تو اماجی خود ایک جیتی جاگتی 'اسپرٹ' جان پڑتی ہیں۔

ہاتھ میں بندوق، پیروں پر چسکی، سر پر اسکارف، جو دور سے صافے جیسا دکھائی دیتا تھا... ان مہاراجاؤں کی یاد دلاتا ہوا، جن کے محلوں میں وہ رہ چکی تھیں۔

گورنس؟ رکھیل؟ یا صرف ایک ہوشیار، چالاک جرمن عورت، جس نے اپنے سفید رنگ کے جوہر سے کچے کنوارے نوجوانوں کو کام کلا میں ٹریننگ دی ہوگی۔ ٹریزر، مسٹریس... شاید دونوں ہی۔ صرف اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ وہ خود کسی کو کچھ نہیں بتاتی تھیں۔ ان کے ماضی کے دروازوں پر لال جھنڈی لگی رہتی تھی، وہاں کوئی نہیں جا سکتا تھا۔ اگر کوئی جا سکتا تھا تو شاید صرف مسز مہرا، جو سب دروازوں کو پار کر کے کھٹری میں لیٹی تھیں۔

میں برآمدے سے نکل کر باہر چلا آیا۔ چاروں طرف چاندنی پھیلی تھی— صاف ستھری، شیتل، شانت۔ گھنے اجلے جنگل کی اندرونی تہوں سے ایک نشیلی، ماس جیسی سانس سی اٹھ رہی تھی۔ مجھے پتا بھی نہیں چلا، کب چلتے چلتے میں مہرا صاحب کی کاٹیج کے پیچھے چلا آیا، جہاں سے مرلی دھر کا کوارٹر دکھائی دیتا تھا۔ وہاں اب بھی روشنی جل رہی تھی۔ ہنسی اور باتوں کی آواز اس سناٹے کو توڑتی ہوئی پاس آرہی تھی۔ میں کوٹھری کے پاس آیا تو بھیتر کی آوازیں کچھ ماند پڑ گئیں۔ ادھ کھلے دروازے سے کسی نے باہر جھانکا اور جلدی سے منھ پیچھے کر لیا۔ میں الٹے پاؤں لوٹنے ہی والا تھا کہ مرلی دھر دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ مجھے دیکھ کر کچھ ہکبکا سا گیا۔

"بابو، آپ؟"

"ایسے ہی مرلی دھر..." میں نے اپنی جھینپ مٹانے کے لیے کہا، "باہر سیر کرنے نکل آیا تھا۔ تم نے کچھ سنا؟"

اس کے معصوم چہرے پر ہلکی سی چمک آئی۔

"یہ بندوق کی آواز؟ یہ اناباری چلاتی ہیں... پچھلے سال بندروں نے ان کا سارا باغ اجاڑ ڈالا تھا... گولی نہیں ہے بابو جی، اناپھو کی بندوق چلاتی ہیں، ڈرانے کے لیے۔ بھیتر آیئے، دیکھیے، کون آیا ہے!"

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، وہ نشے کی خوشی میں میرا ہاتھ کھینچ کر بھیتر ڈیرے میں لے آیا۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں حقے، بیڑی، چلم کے ملے جلے دھوئیں کے پیچھے ننکو کا چہرہ دکھائی دیا... مجھے دیکھ کر وہ اتنا ہی حیران ہوا جتنا میں اسے دیکھ کر۔

"ننکو... تم یہاں کیسے؟"

"جی، آج ہی گاؤں سے لوٹا ہوں... بیٹی نے آج یہیں روک لیا۔"

"داماد نے نہیں؟" میں نے مرلی دھر کی اور دیکھا۔ اس کے پیلے، پہاڑی دانت ایک خوشی کی مسکراہٹ میں چمک رہے تھے۔

"اچھا ہوا آپ آگئے،" اس نے کہا، "میں تو کل خود آپ کے پاس آنے والا تھا۔"

"کس لیے مرلی دھر؟"

"آپ بیٹھیے، میں بتاتا ہوں..."

مرلی دھر کوئی بھی بات کہنے سے پہلے اس کا اسٹیج تیار کرتا تھا۔ شاید یہ بات اس نے اپنے مالک مہرا صاحب سے سیکھی تھی۔ مہرا صاحب کہانیاں سناتے تھے، مرلی دھر انھیں اسٹیج کرتا تھا۔ وہ بھیتر جا کر ایک دھلا ہوا گلاس اور پیتل کی تھالی لے آیا، جس پر چھوٹی چھوٹی بالشت جتنی بھنی ہوئی مچھلیاں رکھی تھیں۔

"یہ میں اپنے گاؤں سے لایا تھا... ان لوگوں کو یہاں نصیب نہیں ہوتیں۔ صاحب کے لیے بھی لایا ہوں،" ننکو نے کہا۔

"تو مچھلی بابو کھاتے ہیں؟"

"جی، ان کو بہت پسند ہیں... جب گاؤں سے لوٹتا ہوں تو سب سے پہلے پوچھتے ہیں، مچھلیاں اور سنترے کی بوتل لایا ہوں؟"

"سنترا؟" میں نے اس کی اور دیکھا۔

مرلی دھر ہنس پڑا، لیکن ننکو بھگت کی مسکراہٹ اس کی سفید مونچھوں میں تلّی کی طرح دبکی تھی۔

"سنترے کا رس بابو جی!" مرلی دھر نے اپنے پلنگ کے نیچے سے بوتل نکالی اور میرے گلاس کو آدھا بھر دیا۔

"پی کر دیکھیے... تب آپ کو اس کے زور کا پتا چلے گا۔"

میرے اچانک آ نکلنے سے پہلے وہ شاید اسی کا زور آزما رہے تھے۔ میں نے گلاس کو اٹھایا۔ سونگھنے کی نوبت ہی نہیں آئی، اس کی تیکھی، تیز گندھ کو برداشت نہ کرتے ہوئے میں نے چھوٹا سا گھونٹ لیا۔ وہ دونوں چمکتی آنکھوں سے میرے چہرے کو ایسے تاک رہے تھے جیسے کسی بم کے پھٹنے کا انتظار کر رہے ہیں۔ بڑی مشکل سے میں ایک مری ہوئی مسکراہٹ چہرے پر لا پایا۔ "زور تو کافی ہے، مرلی دھر!" میں نے کہا۔

"آپ نے کیا سوچا تھا؟ EI.جی کی بندوق کی طرح پھوکی ہوگی؟"

پردے کے پیچھے سے ایک چنچل کھلکھلاہٹ سنائی دی... مرلی دھر کی عورت رادھا کھی کھی کر کے ہنس رہی تھی۔

کچھ ہی دیر بعد میں بھول گیا، میں کہاں بیٹھا ہوں۔ کوارٹر کے دھوئیں اور گندھ اور بوجھل سانسوں کے بیچ، میں دھیرے دھیرے اس دنیا کو پیچھے چھوڑ آیا جو چوبیس گھنٹے میرے ساتھ رہتی تھی۔ وہ کہیں اندھیرے نالے میں جا لگی تھی۔ اس کی جگہ جنگل کے اندھیرے گرم تہہ خانے سے کوئی پراچین جیو آتما باہر نکل آئی تھی... میرا اپنا ہی بچا کھچا... جس کے سر، پیر، دھڑ کے الگ الگ حصوں کو دیکھ کر کیا کوئی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ اس کی اصلی شکل کیسی رہی ہوگی؟ کون ہوں میں، ان سب کے بیچ بیٹھا ہوا، لالٹین کی مدھم روشنی میں شراب پیتا ہوا، اپنے کو کھو کر نئے سرے سے اپنے کو کھوجتا ہوا... کیا میں وہی ہوں جو کچھ دن پہلے ڈاکٹر سنگھ کی کلینک سے ڈوبتے سورج کو اندھیرے میں ڈوبتا ہوا دیکھ رہا تھا؟ اس سے پہلے کہ میں سنترے کے سترنگی سیلاب میں بہہ نکلوں، میں نے سر اٹھایا۔

"مجھ سے کچھ پوچھنا تھا مرلی دھر؟"

مرلی دھر چپ بیٹھا رہا۔ ننکو نے اس کی اور دیکھا۔ "جو کہنا ہے بابو سے کہہ دے... چھپانے سے کیا فائدہ؟"

مرلی دھر نے اپنا ایک ہاتھ فرش پر رکھا، اس کے سہارے میرے قریب جھک آیا۔ "صاحب جی کو کچھ ہو رہا ہے۔" وہ اپنی چمکتی آنکھوں سے مجھے گھور رہا تھا۔

میں کچھ حیران سا ہو گیا۔ "کیا ہو رہا ہے مرلی دھر؟"

"انھیں پہلے کبھی ایسے نہیں دیکھا تھا۔"

"کیسے نہیں دیکھا تھا؟" میں نے کچھ جھنجلاہٹ میں آ کر کہا، "صاف کیوں نہیں کہتے؟"

"بابو، میں انھیں بچپن سے جانتا ہوں، لیکن جیسے وہ اب ہیں، ویسا کبھی نہیں دیکھا تھا... میم صاحب کے مرنے کے بعد بھی وہ ایسے نہیں تھے۔ آدھی رات کو اٹھ کر مجھے بلاتے ہیں... کہتے ہیں، باہر جا کر دیکھوں، کون دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے... میں سارے احاطے کا چکر لگا کر آتا ہوں تو دیکھتا ہوں، وہ برآمدے کی کرسی پر بیٹھے ہیں... مجھے دیکھ کر حیران سے ہو کر پوچھتے ہیں، اتنی رات میں ان کے پاس کیوں آیا ہوں؟ بھول جاتے ہیں کہ انھوں نے ہی مجھے بلایا تھا..."

لالٹین کی روشنی میں اس کا چہرہ، بھولے، ڈرے ہوئے بچے سا، میری اور تاک رہا تھا۔

"یہ ان کی عمر ہے، مرلی دھر... گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔"

"میں گھبراتا نہیں بابو جی! ساری زندگی ان کے ساتھ گزار ڈالی... ان کو نہیں جانوں گا؟ لیکن اس بار بات کچھ اور ہے... مجھے لگتا ہے... وہ کہیں اور چلے گئے ہیں۔"

"کیا کہتے ہو مرلی دھر... کہاں چلے گئے ہیں؟"

ننکو نے ایک اُسانس لے کر گلاس سے گھونٹ لیا۔ دونوں کی آنکھیں مجھے دیکھ رہی تھیں۔

"وہ اب یہاں نہیں ہیں، بابو جی!" مرلی دھر کی آواز روہانسی ہو گئی۔

مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آیا، وہ کیا کہہ رہا ہے، کس رو میں بہہ رہا ہے۔

"یہاں نہیں ہیں... تو کہاں ہیں؟"

"مجھے معلوم نہیں... کبھی کبھی میرے پاس سے ایسے گزر جاتے ہیں جیسے میں کوئی کھمبا یا کھونٹا

Scanned with CamScanner

ہوں۔ مجھے اس دیکھا کر کے ایک سیدھ میں چلتے جاتے ہیں، جیسے انھیں پہلے سے معلوم ہے، کہاں جانا ہے، لیکن یہ بھول گئے ہوں کہ وہاں کیسے پہنچا جا سکتا ہے۔''

مرلی دھر چپ ہو گیا... جیسے اسٹیج کے پیچھے چلا گیا ہو۔ جب کچھ دیر بعد لوٹا تو آواز ایک دم دھیمی پڑ گئی تھی۔ ''ایک بات کہتا ہوں بابو جی... ہمارے گاؤں میں نوراتری کے دنوں میں ایک سادھو آتے تھے... دن رات بڑ کی گھنی چھایا میں بیٹھے رہتے تھے۔ گاؤں کے لوگ باری باری سے شام کی بیلا میں سوکھا سیدھا لے جاتے تھے۔ ایک رات میری باری تھی... جب میں آٹا، دال، نمک، تیل کی تھالی ان کے پاس لایا تو میں نے دیکھا...'' مرلی دھر اچانک چپ ہو گیا۔ ننکو نے بھمک کر آنکھیں کھولیں۔ ''کیا دیکھا تو نے؟''

''میں تھالی وہیں چھوڑ کر چلا آیا... کچھ دیر چل کر پیچھے مڑ کر دیکھا تو بڑ کی ٹہنیوں اور آگ کی لپٹوں کے بیچ جو دھواں اٹھ رہا تھا، اس کی روپ کایا بالکل بابا کی طرح دکھائی دے رہی تھی... لیکن بابا جی وہاں کہیں نہیں تھے۔''

کچھ دیر سناٹا رہا، پھر ننکو بولا، ''ایسا ہوتا ہے... لوگ چلے جاتے ہیں، لیکن اپنا روپ پیچھے چھوڑ جاتے ہیں... ہمیں پتا بھی نہیں چلتا، وہ ہیں بھی یا نہیں۔ جب مرنے کی گھڑی آتی ہے تو وہ ایک بار پھر بھمک کر اٹھتے ہیں، بالکل راکھ تلے دبے کوئلے کی طرح۔ ہمارے دادا تو سڑک پر چلتے آدمی کو دیکھ کر ہی بھانپ لیتے تھے کہ وہ زندہ ہے یا صرف اس کی ٹھٹھر چھایا چلی جا رہی ہے...''

ہوا سے کوٹھری کا دروازہ بار بار کھڑک جاتا تھا... جیسے اس کی کاٹھ کی کایا کانپ رہی ہو۔ دور جھاڑیوں میں جھینگروں کی آوازوں کی لہریں چاندنی کی اجلی فضا میں بہتی ہوئی سنائی دے جاتی تھیں...

''مجھے تو اتا بائی کو دیکھ کر بھی کچھ ایسا ہی لگتا ہے... ان کے سامنے سے گزرتے ہی میرے بھیتر ایک کپکپی سی چھوٹنے لگتی ہے۔'' مرلی دھر نے کان سے بیڑی نکالی اور اسے دیا سلائی کی جلتی نوک میں جھلسانے لگا... جب تک وہ تڑ تڑ کر کے جلنے نہیں لگی۔ ''جب میں چھوٹا تھا تو ان کے گھر کے سامنے سے دوڑتا ہوا نکل جاتا تھا، اس ڈر سے کہ کہیں وہ مجھے بلا نہ لیں!''

''کیوں، ایسا کیا دیکھتے تھے ان میں؟''

''ان کی سفید چمڑی تو نہیں؟'' ننکو نے مسکراتے ہوئے کہا: ''بھلا اس سے کیا ڈرنا؟ وہ تو پیدا

ہوتے ہی ان کے ساتھ آئی تھی... اصلی ڈر تو تب لگتا ہے، جب ماں کے پیٹ سے ہم ایک روپ میں نکلتے ہیں اور دھرتی ماتا پر پیر رکھتے ہی دوسرا روپ دھارن کر لیتے ہیں... برسوں بعد ہمیں یاد بھی نہیں رہتا کہ پیدا ہونے پر ہم کیسے لگتے تھے، اور اب کیسے بن گئے ہیں..."

"کیا آدمی اتنا بدل جاتا ہے؟" میں نے ہنستے ہوئے ننکو کو دیکھا۔

"جی، کیوں نہیں۔ جو آدمی پیدا ہوتا ہے، وہ کیا وہی ہوتا ہے جو مرتا ہے؟ نہیں بابو جی... وہ کوئی دوسرا ہوتا ہے، جس کے لیے ہم روتے ہیں!"

موت... ایک ماتر چیز جس کے بارے میں ہم بے فکر ہوتے ہیں... کیا وہ بھی آدمی کو آخری موقعے پر دھوکا دے سکتی ہے؟ ہم یہ بھی نہیں جان پاتے، وہ اپنے ساتھ کسے لے گئی ہے؟... کیا اسے جسے ہم جانتے تھے، یا کسی اور کو، جسے جاننے کی کبھی مہلت نہیں ملی؟

"کیا تمھاری بی بی جی بھی اسی طرح گئی تھیں، مرلی دھر؟"

"میم صاحب؟"

اس کے چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ چلی آئی، جیسے مسز مہرا کا نام کوئی جادو منتر تھا جس نے زبان پر آتے ہی بھیتر کے کون سے بند دروازے بھڑ بھڑا کر کھول دیے تھے...

"وہ الگ تھیں۔ میں نے ان کے جیسا کوئی نہیں دیکھا۔ آپ کو معلوم ہے کہ جب میں یہاں آیا تھا تو اتنا ہی چھوٹا تھا جتنا یہ..." اس نے اپنے بیٹے کے دھول سے بھرے بالوں کو سہلاتے ہوئے کہا، جو ننکو بھگت کی گود میں سر ٹکا کر سو رہا تھا۔ "ان دنوں میرے بابا صاحب کی کوٹھی میں کام کرنے آتے تھے... گاؤں سے دو کوس کی دوری سے یہاں آتے تھے۔ تب نوکروں کے لیے یہ کوارٹر نہیں بنا تھا جہاں آج آپ بیٹھے ہیں۔ ایک بار وہ بیمار پڑے اور کئی دنوں تک کوٹھی نہیں جا سکے۔ ایک دن گاؤں میں اچانک کھلبلی سی مچ گئی... سب اپنے اپنے جھونپڑوں سے باہر نکل آئے... ایک چھوٹی سی بھیڑ ہمارے گھر کے آگے کھڑی تھی۔ جب پولیس کا چھاپہ پڑتا تھا تبھی ایسا ہوتا تھا... لیکن وہاں پولیس کا نام ونشان نہیں... بھیڑ کے بیچوں بیچ میم صاحب گھوڑے پر بیٹھی تھیں۔ میں آج بھی ان کا چہرہ ویسے ہی یاد کر سکتا ہوں، جیسے آپ کو دیکھ رہا ہوں... بابا کا حال پوچھنے آئی تھیں۔ جب انھیں پتا چلا، وہ بیمار ہیں، تو ہماری کوٹھری میں گئیں اور کچھ دیر بعد ہم نے دیکھا، وہ انھیں اپنے ساتھ لے جا رہی ہیں..."

Scanned with CamScanner

"کہاں؟ اپنے ساتھ؟"

"اپنے ساتھ نہیں... اپنے گھوڑے پر... لگام پکڑ کر میم صاحب آگے آگے اور گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھے بابا پیچھے پیچھے..."

"گھوڑا نہیں... پیارا سا ٹٹو تھا۔" ننکو کے پیلے، بیڑی سے سنے دانت باہر نکل آئے۔ "سب اسے پونی پیارا کہہ کر بلاتے تھے۔ گاڑھا بھورا رنگ، بڑی بڑی سی بھولی آنکھیں، ماتھے پر سفید چتی بندی، جیسے مندر سے تلک کا ٹیکا لگوا کر آیا ہو۔ میم صاحب جب اس پر بیٹھ کر ہمارے صاحب کے گھر آتی تھیں تو اس کا سارا جسم پسینے سے شرابور ہوتا تھا... اتنی چڑھائی کے بعد اس کی بوٹی بوٹی تھرکنے لگتی تھی... آتے ہی وہ اس کی لگام میرے ہاتھوں میں پکڑا دیتیں... مجھے دیکھتے ہی وہ پیار سے ہنہناتا تھا۔ اسے پتا چل جاتا تھا کہ اب اس کو ٹھنڈا پانی اور گڑ کی بھیلیاں ملیں گی..."

ننکو ایک تان میں بولے جا رہا تھا، جیسے آنکھیں کھولے کوئی سپنا دیکھ رہا ہو۔

"ننکو، کیا وہ نرنجن بابو سے ملنے اکثر آتی تھیں؟"

مجھے لگا، میرے سوال کا اس کے سپنے سے کوئی دور کا واسطہ بھی نہیں بیٹھتا تھا۔ لیکن ہوا اس سے الٹا ہی... میری بات کو سن کر اس کا سپنا ٹوٹا نہیں، صرف دوسری سمت میں چلنے لگا۔

"پونی سے اترتے ہی وہ جھولے پر چڑھ جاتی تھیں... آپ نے تو جھولا دیکھا ہے۔ اتنے اونچے جھونٹے لیا کرتی تھیں کہ بیچارا بڑ کا پیڑ تھر تھر کانپنے لگتا تھا... بالکل ایسے..." ننکو نے اپنا جسم پیڑ کی مدرا میں ایک ایسے زاویے میں موڑ کر کچھ اتنی زور سے ہلایا کہ اس کی گود میں لیٹا منسی فرش پر نیچے لڑھک گیا اور زور سے چیخنے لگا۔ لیکن جب اس نے منہ کھول کر ننکو کو پیڑ کی طرح جھولتے دیکھا تو چپ ہو گیا، جیسے اس نے کسی پریت کو دیکھ لیا ہو۔ پیڑ، پیڑ پر جھولتا جھولا، جھولے پر بیٹھی مسز مہرا... ننکو کی چمکتی، نشے میں ڈوبی آنکھوں میں وہ سب ایک جلوس کی طرح گزر رہے تھے۔

تبھی ہم ہوش میں آئے۔ ہوا میں گھنٹی کی آواز کھن کھن کرتی ہوئی پاس آ رہی تھی۔ یہ وہی گھنٹی تھی جسے مہرا صاحب تب بجایا کرتے تھے جب مرلی دھر اپنے کوارٹر میں ہوتا تھا۔

ہم ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ باہر کچھ بھی نہ تھا۔ کوئی ہلچل نہیں۔ گھاس کا میدان، پھولوں کی کیاریاں، جھاڑیاں، سب ایک سکوت کے عالم میں سوئے سے بے جان پڑے تھے۔ صرف مہرا صاحب

Scanned with CamScanner

کی کانچ کی ساری بتیاں جل رہی تھیں۔

مرلی دھر نے جلدی سے اپنی قمیض پہنی اور لالٹین لے کر لمبے قدموں سے کانچ کی طرف جانے لگا۔

ہم سب کھلے دروازے کی دہری پر سانس روکے کھڑے تھے... میں، ننکو، جسی کا ہاتھ پکڑے رادھا، ہر کوئی اندیشوں میں گھرا انتظار کر رہا تھا۔

کچھ دیر بعد جب مرلی دھر لوٹا تو اس کے چہرے پر تعجب تھا... ہم سب کو دیکھ کر، جو دروازے کی چوکھٹ پر مورتیوں کی طرح کھڑے تھے۔ پھر ایک چھوٹی سی مسکان اس کے تانبئی چہرے پر چلی آئی۔

''ڈر کی کوئی بات نہیں۔ تیا بی بی آئی ہیں۔''

مرلی دھر کچھ دیر تک مسکراتا رہا، پھر ہماری بے چینی پر ترس کھا کر بولا، ''بس لیٹ تھی، اسی لیے اتنی دیر ہو گئی۔ ابھی قلی کے ساتھ بس اسٹینڈ سے آرہی ہیں۔''

1.8

ان کا اس طرح اچانک ہمارے شہر میں آنا سب کو یاد رہ گیا، کیونکہ تبھی سے گرمی کے دن شروع ہوئے، حالانکہ گرمیوں کا موسم کب کا بیت چکا تھا۔ سارا شہر دن بھر دھوپ کے بخار سے تپتا رہتا۔ نیچے گھاٹی کے چراگاہ سوکھنے لگے، جس کے کارن گاؤں سے بھیڑ بکریاں گھاس چرنے اوپر آجاتی تھیں، ان کے گلے میں بندھی گھنٹیوں کی اُنیندی آوازیں پہاڑیوں کے بیچ گونجتی رہتیں۔ کبھی کبھی وہ جھاڑیوں کے بیچ چوری چپکے سے گھس جاتیں اور مرلی دھر کو انھیں اپنی لاٹھی سے باہر کھدیڑنا پڑتا۔

وہ دن اس لیے بھی یاد رہ گئے ہیں کیونکہ ان ہی دنوں شہر میں پانی کا بڑا سنکٹ پڑا تھا۔ نل کی پائپیں سوکھ گئی تھیں۔ کیاریوں میں لگے پھول پودے سوکھ گئے تھے اور لان کی گھاس کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے وہاں آگ کے انگارے برسے ہوں... جگہ جگہ کالے، جھلسے چکتے دکھائی دیتے تھے۔ بھوکے ڈنگر بھیتر بھی آجاتے تو شاید ہی ان کی بھوک ہمارے لان کی مری، جھلسی گھاس سے مٹ پاتی۔

لیکن شاید ہر پتا اپنے میں وردان لے کر آتی ہے... ان ہی دنوں میں جیا کو جاننے لگا۔

Scanned with CamScanner

حالانکہ میں ان سے پہلے بھی مل چکا تھا، لیکن اصل جاننے کی شروعات پانی کی ایمرجنسی کا سامنا کرنے سے ہوئی... ہم سب کو بالٹیاں لے کر نیچے نالے پر جانا پڑتا تھا، جو سوکھا گیا سے اب بھی بہہ رہا تھا، حالانکہ اس کی دھار تھرمامیٹر کے پارے سی بالکل پتلی اور ہلکی دکھائی دیتی تھی۔ یہ نالا کالج کے نیچے کھنڈ کے بھیتر چٹانوں کے بیچ سے بہتا ہوا نیچے جاتا تھا۔ تیز دھار کی رگڑن سے اس کے آس پاس کے پتھر بالکل چکنے اور چمکیلے ہو گئے تھے۔ بہت پہلے وہاں جنگل کے چھوٹے بڑے جانور اپنی پیاس بجھانے آیا کرتے تھے۔ آج بھی وہاں لکڑہاروں اور چرواہوں کو کسی تیندوے یا لکڑبگھے کے نشان دکھائی دے جاتے تھے۔ کہتے ہیں کسی انگریز گاڈون نے اس نالے کو کھوجا تھا... تب اس نالے کا نام گاڈون نالہ، اور بعد میں سے کی رگڑن سے 'گنڈی نالا' بن کر رہ گیا تھا۔

اسی گنڈی نالے سے ہم سب کو بالٹیوں، ہنڈیوں، برتنوں میں پانی بھر کر اوپر لے جانا پڑتا تھا۔ اس میں کالج، آؤٹ ہاؤس، گیسٹ ہاؤس، سبھی کے نواسیوں کو ایک جٹ ہو کر کام کرنا پڑتا تھا۔ اماجی کو پانی الگ بالٹی سے بھجوایا جاتا تھا، جس کی ڈیوٹی بنیا نے مرلی دھر کو سونپی تھی۔

سب لوگ انھیں 'تیا' یا 'تیا بٹیا' کہہ کر بلاتے تھے۔ شاید بچپن سے ہی ان کا یہ نام آج تک ان کے ساتھ چلا آیا تھا۔ وہ کبھی باغ میں مالی کے ساتھ دکھائی دیتیں... پودوں کی کیاریوں سے ویڈز چھانٹتی ہوئی، کبھی بیڈمنٹن کورٹ کی بنچ پر کچھ پڑھتی ہوئی، یا شام کے سے مہرا صاحب کے ساتھ سیر کے لیے جاتی ہوئی... جب بھی وہ میرے کمرے کے سامنے سے نکلتیں، دو چار منٹ کے لیے پاس رک جاتیں۔ ہمیشہ کہتیں کہ کبھی وہ فرصت سے آکر بیٹھیں گی...

فرصت کی گھڑی تب آئی جب پانی آنا بند ہو گیا۔ وہ صبح ہی دونوں ہاتھوں میں بالٹیاں لے کر میرے دروازے کو کھٹکھٹا تیں... چلیے، وہ سب آپ کے انتظار میں کھڑے ہیں۔ میں آدھی نیند میں انھیں دیکھتا۔ سلیٹی رنگ کی شلوار قمیص اور ربڑ کے جوتے، اور سر پر سفید کینوس کی کیپ... وہ ان گرل گائیڈوں کی طرح دکھائی دیتیں، جنھیں میں اپنے اسکول میں دیکھتا تھا۔ باہر دیکھتا تو مرلی دھر، اس کی بیوی رادھا، لڑکا ہنسی دھر اور پونچھ ہلاتی کالی دکھائی دیتے۔ میں بھی جلدی سے کپڑے بدل کر باتھ روم سے اپنے حصے کی خالی بالٹیاں، جگ اور لوٹے لے کر ان کے ساتھ جلوس میں شامل ہو جاتا۔

ہم ایک ٹولی بنا کر پگڈنڈی سے گزرتے ہوئے نیچے سنسان بیہڑ میں اترتے جاتے، جیسے کسی

پہاڑی بھم پر جا رہے ہوں۔ جنگل کے سناٹے میں ہمارے برتنوں کی آواز کچھ ویسے ہی ڈراونی سنائی دیتی جیسے گاؤں والے بن میں چھپے آدم خور باگھ کو باہر نکالنے کے لیے نگاڑا بجاتے ہیں۔ چلتے چلتے مرلی دھران سے ہنسی میں کہتا، "بنیا، یہ آپ کی کرامات ہے۔"

"میری کیسے؟" وہ کرتے کی آستین سے منھ کا پسینہ پونچھتے ہوئے کہتیں۔

"آپ اپنے ساتھ نیچے سے گرمی لائی ہیں... آپ سے پہلے تو موسم بہت اچھا تھا..."

"پھر میں چلی جاؤں، مرلی دھر؟"

وہ ہنسنے لگتیں... چلتی جاتیں اور ہنستی جاتیں... اور تب ان کے چہرے کو دیکھ کر مجھے لگتا کہ وہ اپنے ساتھ نیچے سے گرمی ہی نہیں، وہی مسز مہرا کی ہنسی بھی لے آئی ہیں۔ اور تب مجھے کچھ حیرانی سی ہوتی کہ اگرچہ مسز مہرا ان کی سگی ماں نہیں تھیں، تیا کی ہنسی میں انھی کا خون ملا دکھائی دیتا تھا... وہی بھولا، بھلکڑی کا سا بھاؤ جو بعد کے دنوں میں دکھ درد کی سوکھی پپڑی میں جم گیا تھا... وہ اپنے اور ان کے چہرے کو ساتھ لے کر چلتی تھیں... جیسے مسز مہرا کے آخری دنوں کی دہشت تیا کے چہرے پر پہلے سے ہی موجود ہو، لیکن ہنستے ہوئے انھیں پتا بھی نہیں چلتا تھا کہ کوئی دوسرا چہرہ ان کے چہرے پر بیٹھا ہے — جسے سب دیکھتے ہیں، صرف وہی نہیں۔ شروع کے دنوں میں مجھے یہ کچھ عجیب سا لگتا تھا، ایک چہرے کو دو حصوں میں بٹا ہوا دیکھنا   جیسے ایک حصے میں دھوپ چمک رہی ہو، دوسرا اندھیرے میں پڑا ہو... نہ پورا اندھیرا ہو، نہ پوری روشنی، دونوں کے بیچ ایک چھتری سی چھاؤں   لیکن بعد کے دنوں میں میں اس کا عادی ہو گیا، جیسے ان کی دوسری چیزوں کا بھی، جن میں ان کا 'بولنا' مجھے سب سے انوکھا جان پڑتا تھا۔

کیا اس لیے کہ شروع کے دنوں میں وہ ہمیشہ مجھ سے چلتے ہوئے بولتی تھیں؟ جب مرلی دھر کی فوج آگے نکل جاتی اور ہم پیچھے چھوٹ جاتے... تب وہ اپنی دھن میں مجھے کچھ بتانے لگتیں... اکھڑی ہوئی سانسوں کے بیچ کبھی ان کا ایک شبد سنائی دیتا، کبھی دوسرا... دھنی ہوئی روئی کے پھاہوں سا۔ اس سے پہلے کہ میں ایک کو پکڑ پاتا، دوسرا سامنے سے نکل جاتا، فلموں کے ان سب ٹائٹلوں کی طرح جو پڑھنے کے بیچ ہی آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں لیکن آواز پھر بھی سنائی دیتی رہتی ہے، جسے سنتے ہوئے میں یہ بھی بھول جاتا کہ وہ مجھ سے کیا کہہ رہی ہیں... ایک دو بار تو میں ان کے پاس آ کر پوچھ لیتا، آپ کیا

کہہ رہی ہیں، لیکن جب میں نے دیکھا کہ وہ میرے 'کیا' سے چڑ سی جاتی ہیں، تب مجھے لگا، وہاں سمجھنا اتنا ضروری نہیں ہے جتنا سننا، کیونکہ جب ہم کسی کو اتنا کم جانتے ہوں، تب لفظوں کے معنی اتنی اہمیت نہیں رکھتے جتنی ان کی آواز...

اسی لیے جب وہ بولتے بولتے آگے نکل جاتیں تو بھی مجھے لگتا رہتا کہ جب تک ان کی آواز کا سرا میرے ہاتھ میں ہے، میں ان کے ساتھ ہوں، حالانکہ ہوا اور برتنوں کی کھنکناہٹ اور سانسوں کی بدحواسی کے بیچ میں کچھ بھی نہ سمجھ پاتا، وہ مجھ سے کیا کہہ رہی ہیں۔ اور شاید انھیں بھی یہ معلوم تھا، کیونکہ جب وہ ٹھٹک کر پیچھے دیکھتیں تو انھیں پتا چلتا کہ اب تک وہ اپنے سے ہی بول رہی تھیں، اور اس سے انھیں کوئی کھسیاہٹ نہیں ہوتی تھی... وہ شانت بھاؤ سے کھڑی ہو جاتیں، اور جب میں ان کے پاس پہنچتا تو وہ مجھے دیکھنے لگتیں۔

ان کا دیکھنا... یہ ایک اور چیز تھی جو مجھے سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ کیا ان کی آنکھیں ہمیشہ سے ایسی ہی تھیں — دیکھتی ہوئی، نہ دیکھتی ہوئی؟ میرے پاس پہنچتے ہی ان کی آنکھیں جھپ جھپانے لگتیں، جیسے وہ مجھے پورا نہ دیکھ پا رہی ہوں، جیسے ان کی نگاہوں کے فوکس میں جتنا میں گھرتا ہوں، اس سے زیادہ باہر چھٹک جاتا ہوں، کسی خراب فوٹو کی طرح، جس کا فریم سے باہر کوئی نہ کوئی انگ چھوٹ جاتا ہے، آدھی بانہہ، ایک چوتھائی سر، کٹا ہوا کندھا۔

لیکن شاید یہ ان کی آنکھوں کا دوش نہیں، میرے من کا ہی بھرم تھا — وہ مجھے پورا ہی دیکھتی تھیں، جیسا میں تھا، میں ہی ان کے سامنے اپنے کو چھوٹا ہوا پاتا تھا... یہ نہیں کہ جیسا وہ مجھے دیکھ رہی ہیں، ویسا میں نہیں تھا، بلکہ ان کے دیکھتے ہی میں وہ ہو جاتا تھا جو میں کہیں پیچھے چھوڑ آیا تھا... جس کے بارے میں وہ کچھ بھی نہیں جانتی تھیں۔ اسی لیے ان کی آنکھیں مجھے اتنی کشٹ دیتی ہوئی جان پڑتی تھیں۔ مجھے لگتا، وہ مجھے دیکھ اتنا نہیں رہیں جتنا سوکھ رہی ہیں، جس کا اس سے کوئی سمبندھ نہیں جو وہ بول رہی ہیں۔

لیکن کیوں؟ اس سے انھیں کیا ملتا تھا؟ کیا وہ اپنے سے کوئی تجربہ، کوئی آزمائش کر رہی تھیں، جس کا مجھے کوئی پتا نہیں تھا؟ کیا یہ ایک طرح کا ٹیسٹ تھا، جب کوئی کودنے سے پہلے ندی میں اپنا پیر رکھتا ہے، یہ جانچنے کے لیے کہ وہ کتنی گہری ہے، اس کے بھیتر کتنی دور تک جا سکتا ہے، بنا کوئی آہٹ

Scanned with CamScanner

کیے، ایک ایک قدم آگے بڑھتا ہوا؟ جبکہ میں اس سے بالکل بےخبر رہتا کہ وہ کتنا قریب آ گئی ہیں، کتنے پاس سے مجھے ٹوہ رہی ہیں، مجھے، یعنی اس آدمی کو جو سنتری میں ان کے ساتھ کھڑا، مسز مہرا کو نیچے جاتا ہوا دیکھ رہا تھا۔

کون ہے یہ آدمی؟... اور مجھے اپنے پر شرم سی آنے لگتی، جیسے وہ مجھے نہیں، میرے کسی لُنج پُنج انگ کو دیکھ رہی ہوں... اور پوچھنا چاہتی ہوں، آپ کو کیا ہوا؟ لیکن آخری قدم بڑھنے سے پہلے پیچھے ہٹ جاتیں۔

میں نالے پر پہنچتے ہی راحت کی سانس لیتا، جب وہ مجھ سے الگ ہو جاتیں۔ مرلی دھر سب کے برتن بالٹیاں جمع کر کے جھرنے کے نیچے رکھ دیتا، وہ گڑ گڑ کر کے بھرتے جاتے اور کچھ دیر بعد جب لبالب بھر جاتے تو وہ اور جسّی اور رادھا انھیں اٹھا کر اوپر چلے جاتے۔ ہم جھرنے کے پاس بیٹھے ان کے لوٹنے کا انتظار کرتے رہتے تھے۔ ان کے لوٹنے کے انتظار کی ایک ایسی ہی گھڑی میں ایک دن انھوں نے مجھ سے ایک عجیب بات پوچھی... انھوں نے میری اور دیکھا بھی نہیں، جھرنے کے پانی میں اپنا ہاتھ چھپ چھپاتے ہوئے بولیں، "آپ کیا سوچتے ہیں، مہرا صاحب کی طبیعت اتنی ہی سیریس ہے جتنا ڈاکٹر سنگھ بتاتے ہیں؟"

انھوں نے 'مہرا صاحب' کہا، 'بابو جی' نہیں، جس میں رشتے کی اپنائیت نہیں، یک کلینکل قسم کا سوکھا پن تھا...

"ڈاکٹر سنگھ نے آپ کو کیا بتایا تھا؟"

"ان کی بات چھوڑیے، آپ کیا سوچتے ہیں؟ آپ تو ان کے ساتھ دن رات رہتے ہیں۔"

وہ اب بھی سر جھکائے بہتے پانی میں ہاتھ بلو رہی تھیں۔ نالے کی گڑ گڑاہٹ کے علاوہ کچھ بھی سنائی نہیں دیتا تھا... مجھے لگا، وہ دھیرے دھیرے مجھے کسی اندھیرے گڑھے کی طرف دھکیل رہی ہیں۔

"مجھے نہیں معلوم، سیریس سے ان کا کیا مطلب ہے..."

"انھیں چھوڑیے، آپ کو کیا لگتا ہے؟"

بھیتر کے غصّے کو دبا کر میں نے کہا، "آپ اتنے دنوں بعد آئی ہیں، کیا آپ کو ان میں کوئی انتر نہیں دکھائی دیتا؟"

ان کے ہاتھ پتھر کے نیچے ٹھہر گئے۔ پانی اوپر سے بہتا رہا، بھاری ہوا میں گڑبڑ کی آواز سنائی دیتی رہی۔

"میرے آتے ہی وہ خوش دکھائی دینے لگتے ہیں، اس لیے یہ جاننا مشکل ہو جاتا ہے کہ میرے آنے سے پہلے کیسے تھے..." ان کی آواز بہت دھیمی ہو آئی۔ "مجھے پتا بھی نہیں چلتا، بیچ کے دنوں میں ان کے ساتھ کیا گیا بیتا ہے..."

"آپ یہاں کچھ دن رہ کیوں نہیں جاتیں؟" میں نے ہمت کر کے پوچھا۔ "انھیں بھی اچھا لگے گا۔"

اس بار انھوں نے سر اٹھایا۔ سورج ان کے بالوں پر گر رہا تھا جس سے سارا چہرہ سلگتا سا جان پڑتا تھا۔

"آپ تو یہاں ہیں..." ایک لمحہ رک کر کہا۔ "آپ کو چاچی نے اسی لیے تو بلایا تھا۔"

ان کے لہجے میں ایک ہلکا سا طنز تھا، لیکن مسز مہرا کے لیے ان کے منھ سے 'چاچی' کا لفظ سن کر میں انھیں دیکھنے لگا۔

"میری بات الگ ہے... آپ جو ان کے لیے ہو سکتی ہیں، دوسرا کوئی نہیں!"

انھوں نے سر ہلایا، نامنظوری میں، لیکن کہا کچھ نہیں۔

یہی چیز مجھے اکھرتی تھی... وہ کبھی نہیں بتاتی تھیں، کون سی چیز انھیں ٹھیک نہیں لگی، صرف ان کے چہرے سے پتا چل جاتا تھا کہ جو میں نے کہا وہ اس سے بہت دور ہے جو انھوں نے مجھ سے پوچھا تھا۔ انھیں میری صلاح کی ضرورت نہیں تھی... پھر وہ مجھ سے کیا جاننا چاہتی تھیں؟

"آپ کو یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟" انھوں نے میری اور دیکھا۔

"نہیں... تکلیف کیسی؟" میں کچھ حیرت میں پڑ گیا۔

"میں اتنی دور رہتی ہوں، اس لیے کچھ پتا نہیں چلتا۔ آپ اپنی چٹھیوں میں بھی کچھ نہیں لکھتے۔ صرف بابو جی کا ہیلتھ بلیٹن بھیجتے ہیں..."

"اس شہر میں کچھ ایسا نہیں ہوتا، جو آپ کو لکھا جا سکے۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"بابو جی آپ کو بہت تنگ تو نہیں کرتے؟" ایک شرمیلی سی مسکان ان کے چہرے پر تیر رہی تھی۔

Scanned with CamScanner

''کرتے تو ہیں...'' میں نے کہا، ''جب یہ بھول جاتے ہیں کہ میں بھی یہاں رہتا ہوں... دن پر دن بیتتے چلے جاتے ہیں اور مجھ سے ملنا بھی انھیں یاد نہیں رہتا۔''

ایک کالی سی چھایا ان کے چہرے پر اتر آئی۔

''کیوں... چاچی تو کہتی تھیں، آپ سے بابو گھنٹوں باتیں کرتے رہتے ہیں؟''

''یہ ان کے موڈ کی بات ہے... کبھی کبھی تو بہت سے دن گزر جاتے ہیں اور مجھے بلاتے بھی نہیں۔''

''کیا کرتے ہیں؟''

''دن میں کیا کرتے ہیں، یہ تو مرلی دھر ہی جانتا ہے... شام کو باغ کی سیر کر لیتے ہیں... کبھی کسی دن ڈاکٹر سنگھ آ جاتے ہیں...''

''اور آپ؟''

''میں؟'' میں نے ان کی اور دیکھا۔

''آپ ایسے خالی دنوں میں کیا کرتے ہیں؟''

میں کیا کرتا ہوں، کیا انھیں بتا سکتا ہوں ہر خالی دوپہر کا لیکھا جوکھا؟ اس کے لیے مجھے آدھی زندگی کا بیورا دینا ہوگا جو بنا ان کے دیکھے کہیں اور بیتی تھی۔ یہ آسان نہیں تھا۔ دوسروں کے معمولی سوالوں کا جواب دیتے ہے ہم اچانک دوسروں کی آنکھوں میں اپنے کو دیکھنے لگتے ہیں، جہاں ہر چیز غیر معمولی ہے... اور گئی بیتی بھی۔ میں ہنسنے لگا۔ ''کچھ بھی نہیں... وہ میری چھٹی کے دن ہوتے ہیں۔''

کچھ دیر تک کوئی کچھ نہیں بولا صرف تالے کی آواز سنائی دیتی رہی۔

''آپ کے یہاں کوئی دوست نہیں ہیں؟'' انھوں نے میری اور دیکھا۔ ''چاچی کہتی تھیں، نرنجن بابو اور آپ ایک ساتھ کالج میں پڑھتے تھے۔''

''صرف ایک سال کے لیے... جب میں یونیورسٹی میں آیا، وہ ایم اے فائنل میں تھے... ہمارے سبجیکٹ بھی الگ الگ تھے... لیکن ان سے ملنا برابر ہوتا رہتا تھا۔''

''وہ کبھی یہاں نہیں آتے؟''

ان کے لہجے میں کچھ ایسا تھا... تیکھا پن، یا صرف ہلکی سی بے چینی، کہ میں چونک سا گیا۔

''نہیں، یہاں بہت دنوں سے نہیں آئے۔''

Scanned with CamScanner

"آپ کبھی ان سے ملتے ہیں؟"

"ایک بار میں ان کے گھر گیا تھا... وہ مجھے اپنا گیسٹ ہاؤس بھی دکھانا چاہتے تھے..."

"گیسٹ ہاؤس؟" انھوں نے میری طرف تجسس سے دیکھا۔

"وہ جو پہلے اسکول بنا تھا... آپ نے تو دیکھا ہوگا؟"

انھوں نے سر ہلایا، کہا کچھ نہیں... چہرے پر پسینے کی بوندکیاں چمک رہی تھیں۔ کہیں دور سے کوّے کی کائیں کائیں سنائی دے رہی تھی، دوپہر کے سناٹے کو چھیدتی ہوئی۔

"کیا ناناجی بھی آپ کے ساتھ گئی تھیں؟"

"کہاں؟"

"نرنجن بابو کے گھر؟"

"نہیں... وہ اب اتنی چڑھائی نہیں چڑھ سکتیں۔"

"اسکول کا آئیڈیا ناناجی کا ہی تھا... وہ یہاں کے بچوں کو جرمن پڑھانا چاہتی تھیں۔" ایک اجلی سی مسکراہٹ میں ان کا چہرہ دمکنے لگا۔

"میں جب چھوٹی سی تو، ناناجی کی چھڑی پکڑ کر آگے آگے چلتی تھی... ہر شام سیر کرتے ہوئے انھوں نے مجھے بھی جرمن سکھائی تھی... میں جب کسی چیز کا صحیح جرمن نام بتا دیتی تو وہ چیڑ کی ایک سوئی پتی اپنی اسکرٹ میں رکھ لیتیں۔ سیر کے بعد ہم دونوں ان سوئی پتیوں کو گنا کرتے تھے... جتنی پتیاں نکلتیں، اتنی ٹافیاں مجھے دیا کرتی تھیں... ان دنوں وہ مجھے 'نانی' کہہ کر ہی بلاتی تھیں۔ چاچی اگر روکتیں نہیں تو وہ نام میرا بائی اسکول تک چلا جاتا..."

ان کے پیروں پر پانی بہہ رہا تھا۔ اس کی جھر جھر کے بیچ ان کے شبد بھی کہیں پتھروں پر گرتے پڑتے سنائی دیے جاتے تھے۔

"آپ کبھی ان کے گھر جاتے ہیں؟"

"پہلے جتنا نہیں... وہ کبھی کبھی اپنے پھاٹک کے سامنے دکھائی دے جاتی ہیں تو بھیتر بلا لیتی ہیں۔ کسی دن جب ان کا موڈ ہوتا ہے تو پیانو بجاتی ہیں... وہ سب سے اچھے دن ہوتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے، مسز مہرا کے جانے کے بعد وہ بہت اکیلی رہ گئی ہیں..."

Scanned with CamScanner

پہلی بار مسز مہرا کے الجھاؤ کی بات منھ پر آئی تھی۔ ان کا نہ ہونا چپکے سے ہمارے بیچ آ بیٹھا تھا۔ وہ جیسے اسے چھپانے کے لیے اپنے ہاتھوں سے چھپ چھپ کرتے ہوئے اپنا منھ دھونے لگیں۔ نیچے جھکنے سے ان کا جوڑا ہلکے سے کھل گیا تھا، گردن سیدھی کرکے انھوں نے اسے کس کر باندھ دیا۔ پہلی بار میں نے دیکھا، ان کا ماتھا کتنا اونچا ہے، جس پر ابھی سے ریکھائیں پڑنا شروع ہو گئی تھیں۔

جھرنے سے منھ اوپر اٹھایا تو بھیگے چہرے پر ایک اجلی سی مسکراہٹ چمک رہی تھی، جیسے انھیں کوئی پرانی بات یاد ہو آئی ہو۔ "کیا وہ اب بھی بندروں پر گولیاں چلاتی ہیں؟ شروع میں جب وہ یہاں آئی تھیں تو انھیں جانوروں سے بہت ڈر لگتا تھا..." وہ ہنسنے لگیں۔ ان کی ہنسی کا ڈھنگ کچھ نرالا تھا... جب انھیں کوئی لمبی کتھا بتانی ہوتی تو جملوں کے درمیان آرہے وقفوں کو وہ ہنسی سے پُر کر لیتی تھیں۔ وہ رک جاتیں اور اپنی یاد کے بھیتر مسکرانے لگتیں۔ "آپ نے پنکی کو تو دیکھا ہوگا... اس کے ایک بوڑھے دادا تھے، جنھیں ماما جی بہت پیار کرتی تھیں۔ ایک دن وہ اسے اپنے ساتھ سیر پر لے جا رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد پیچھے مڑ کر دیکھا تو دادا جی غائب۔ بہت کھوج بین کرنے کے بعد پتا چلا کہ اسے ایک بگھیرا پکڑ کر لے گیا تھا، جو بہت دنوں سے اس کی تاک میں تھا۔ ان دنوں اس شہر میں بگھیروں کے لیے کتے کباب کی طرح ہوتے تھے۔ ذرا سی آنکھ ہٹی نہیں کہ انھیں نگل جاتے تھے۔ ایک پل سڑک پر، دوسرے پل ندارد... اسی لیے تو وہ اسے کبھی باہر نہیں نکلنے دیتیں..."

میں ان کے چہرے کو دیکھتا رہا... دھوپ چھائی چہرہ... ہوا اور پانی میں ایک عجیب سی آبھا میں چمکتا ہوا۔ "آپ جب سے آئی ہیں، ان سے ملیں نہیں؟"

"ایک بار گئی تھی۔ ان کے گیٹ پر لال جھنڈی دیکھ کر لوٹ آئی... لگتا ہے، وہ مجھ سے کچھ ناراض ہیں۔"

"آپ سے؟" میں نے انھیں دیکھا۔ "آپ کو معلوم نہیں، جب آپ یہاں نہیں تھیں، کتنی باتیں کرتی تھیں آپ کے بارے میں۔"

"مجھے معلوم ہے..." انھوں نے سر ہلایا۔ "اس سے کچھ بنتا نہیں۔"

ہنسی کی جگہ ان کے چہرے پر عجیب سا خالی پن چلا آیا تھا۔ کوئی پرانی پھانس نکل آئی تھی — پرانی پیڑا کے بھیتر لٹکتی ہوئی۔

''ناراض نہیں... بھلا مجھ سے ناراض ہو کر انھیں کیا ملے گا... میں ہی ان کی خالی جگہ کو نہیں بھر سکتی!''

''کیسی خالی جگہ؟'' میں نے انھیں دیکھا۔

''چاچی جو اپنے پیچھے چھوڑ گئی ہیں... آپ کو نہیں معلوم، ان کے جانے سے کتنی جگہیں خالی ہو گئی ہیں۔ کیا میں ان سب کو بھر سکتی ہوں؟''

پیلی، مدھم دھوپ میں ان کا سوال منڈلاتا رہا۔

''آپ نے کبھی نہیں سوچا کہ آپ یہاں رہ سکتی ہیں؟''

''یہاں؟'' انھوں نے دھیرے دھیرے چاروں طرف دیکھا۔ دوپہر کی دھوپ، بہتا ہوا نالا، پانی میں بھیگتی چٹانیں... آخر ان کی نگاہیں مجھ پر ٹھہر گئیں۔ مجھے ایسے دیکھنے لگیں جیسے پہلے کبھی نہ دیکھا ہو... اس بار ان کی آنکھیں جھپ جھپ نہیں کر رہی تھیں، ایک ٹک مجھ پر ٹکی تھیں ''کس کے لیے؟''

ان کی آواز اتنی دھیمی تھی کہ مجھے لگا، یہ میرا بھرم ہے کہ وہ بولی ہیں۔ ایک سانس تھی جو بولتے ہی ان کے شبدوں کو پونچھ گئی تھی...

دور سے برتنوں کی کھنکھناہٹ سنائی دی... ہماری بات بیچ میں رہ گئی۔

مرلی دھر خالی بالٹیوں کو لے کر آیا تھا۔

''بیالی بی، آپ کو صاحب جی بلاتے ہیں...''

''مجھے؟''

''جی۔'' مرلی دھر نے بنا ان کی اور دیکھے خالی بالٹیاں پانی میں ڈال دیں۔

وہ اٹھ کھڑی ہوئیں، کچھ ہچکچاہٹ سے میری اور دیکھا۔

''آپ جایئے... میں مرلی دھر کے ساتھ برتن لے کر آتا ہوں،'' میں نے کہا۔

وہ کچھ نہیں بولیں۔ بالوں کو پیچھے سمیٹا، اسنیکرز کے تسمے باندھے، ان پر چپکی گھاس اور کیچڑ کو پتھر سے کھرچ کر صاف کر دیا اور پھر نالے کے اوپر جاتی والی پگڈنڈی چڑھنے لگیں۔ ان کے پیروں کی تھپ تھپ کرتی بھاری آواز سناٹے میں سنائی دیتی رہی۔

Scanned with CamScanner

1.9

وہ آواز مجھے رات کو بھی سنائی دیتی تھی، جب میں اپنے کمرے میں لیٹا ہوا نیند کا انتظار کرتا تھا۔ مجھ سے دور جاتی ہوئی، میرے پاس آتی ہوئی۔ گرمی کے وہ دن مجھے اسی لیے یاد رہ گئے ہیں کہ میں انجانے ہی ان کی آنکھوں سے اپنے کو دیکھنے لگا، اور مجھے اپنے بارے میں بہت کچھ پتا لگا، جیسے کسی مہمان کو اپنا گھر دکھاتے سے ہم بھی اپنے گھر کی چیزوں کو نئی آنکھوں سے دیکھنے لگتے ہیں۔ وہ کسی مورتی کو چھوتا ہے تو شہر کی وہ گلی کھل جاتی ہے جہاں ہم نے اسے خریدا تھا، یا جب وہ ہماری شیلف سے کتاب اٹھا کر پنے پلٹنے لگتا ہے تو ہمارے سامنے اُس دن کا پتا کھل جاتا ہے جب ہم نے کسی پیڑ کے نیچے اسے پہلی بار پڑھا تھا۔ اس کی نگاہوں میں ہمیں گھر کی رسی بسی چیزیں نہیں، کھوئی ہوئی دنیا کے کھنڈر دکھائی دینے لگتے ہیں۔ ان کی آنکھوں سے اپنے کو دیکھنا ان کی طرف سے دیکھا جانا نہیں تھا، بلکہ اپنے سے چھوٹ کر اپنی بیتی ہوئی دنیا میں آنے جیسا تھا، جہاں سب کچھ پہلے جیسا تھا، پھر بھی سب بدلا سا جان پڑتا تھا۔

مہرا صاحب مجھے سب سے بدلے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ میری آنکھ ان کے چہرے پر پڑ جاتی تو مجھے وہ دن یاد آجاتے جب میں نے پہلی بار انھیں دیکھا تھا، جب میں شروع میں یہاں آیا تھا — ہنس مکھ، اپنے اوپر اعتماد سے بھرے ہوئے۔ وہ شام کو اپنی بیٹی کے ساتھ سیر کے لیے نکلتے تو انھیں دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ ان پر عمر کا بوجھ ہے، یا بیماری کا کوئی اندیشہ... بٹیا ان کے ساتھ ساتھ چلتی تھی لیکن نہ تو ان کا ہاتھ پکڑے ہوتی، نہ ہی ان کے کندھے کو کوئی سہارا دیتی تھی۔ وہ باغ کا ایک چکر لگاتے، پھر دوسرا، پھر تیسرا... جب تک کالج اندھیرے میں نہ چھپ جاتی اور آکاش میں تارے نہ نکل آتے۔ کسی دن وہ اکیلے ہی باہر نکل آتے۔ میرے کوارٹر کے سامنے سے گزرتے تو اپنی چھڑی سے میرے دروازے کو کھٹکھٹاتے... جب تک میں باہر آتا، وہ برآمدے کی سیڑھیوں پر ہی بیٹھ جاتے۔ میں انھیں بھیتر آنے کے لیے کہتا تو سر ہلا کر انکار کر دیتے۔ میں ان کے لیے کرسی لاتا تو وہ اسے اندیکھا کر دیتے۔ آخر ہار کر میں ان سے تھوڑا ہٹ کر سیڑھی پر ہی بیٹھ جاتا۔

”کیوں گورنر صاحب... دیکھتا ہوں، جب سے بٹیا آئی ہے، آپ مجھے بھلا بیٹھے!“

گورنر! میں چونکنے لگا۔ مدت بعد انھوں نے مجھے اس نام سے بلایا تھا... شروع کے دنوں میں، جب مسز مہرا زندہ تھیں، وہ مجھے اسی نام سے بلاتے تھے... اس نام کی شروعات بھی عجیب ڈھنگ سے

ہوئی تھی۔ ایک شام میں ان سے بات چیت کرنے کے بعد ہی نوٹ بک اٹھا کر جانے لگا تو انھوں نے مجھے روک لیا۔ اس دن میرے کام سے کچھ زیادہ ہی خوش جان پڑتے تھے۔ "تم ہر شام مجھ سے سوال پوچھتے ہو، آج میں تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں... بتاؤ، ان عورتوں کو کیا کہا جاتا ہے جنھیں بچوں کی دیکھ بھال کے لیے رکھا جاتا ہے؟" جب میں سوچ نہیں پایا، تب وہ بولے، "گورنس... ٹھیک ہے نا؟" وہ لمحہ بھر رکے، بڑے سنیہہ سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے، "اور تمھیں کیونکہ ایک بوڑھے کی سیوا کرنے کے لیے رکھا گیا ہے... تو کیا ہے تم؟ گورنر! ہمارے شہر میں دونوں ہی ہیں، اماجی گورنس، تم گورنر!"

مدت بعد میں نے انھیں اس طرح ہنستے ہوئے دیکھا تھا۔ پرانے دنوں کی ہنسی، جس میں مسز مہرا جیوت تھیں اور میں نیا نیا آیا تھا... اور تب مجھے آبھاس ہوا تھا، ہمارا گزرا زمانہ کوئی ایک جگہ ٹھہرا ہوا اسٹیشن نہیں ہے، جو ایک بار گزرنے کے بعد غائب ہو جاتا ہے، وہ یاترا کے دوران ہمیشہ اپنے کو الگ الگ چہروں سے دکھاتا رہتا ہے۔ ان دنوں مہرا صاحب کو دیکھ کر لگتا تھا کہ جو گزرا سے ان کی پتنی کے ساتھ قبر میں دب گیا تھا، اسی کا ایک حصہ تیا کے ساتھ لوٹ آیا تھا۔ میں جب بھی انھیں اپنی کھڑکی سے باہر لان کے پیڑوں کے نیچے چلتا ہوا دیکھتا تو لگتا جیسے باپ بیٹی کسی دوسرے زمانے سے اتر کر گھڑی دو گھڑی کے لیے ہمارے شہر آ گئے ہیں... کہ وہ ہمیشہ وہاں نہیں رہیں گے — اور جب نہیں رہیں گے... تو میرے لیے وہ شہر کچھ اور خالی ہو جائے گا۔

کیسی عجیب بات ہے، سکھی دنوں میں ہمیں دشگونی کی چھایا سب سے صاف دکھائی دیتی ہے، جیسے ہمیں وشواس نہ ہو کہ ہم سکھ کے لیے بنے ہیں۔ ہم اسے چھوتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں کہ کہیں ہمارے چھونے سے وہ میلا نہ ہو جائے، اور اس ڈر سے اسے بھی کھو دیتے ہیں جو ودھاتا نے ہمارے حصے کے لیے رکھا تھا۔ دکھ سے بچنا مشکل ہے، پر سکھ کو کھو دینا کتنا آسان ہے، یہ میں نے ان دنوں جانا تھا۔

جب مہرا صاحب میرے دروازے کی کنڈی کھٹکھٹا کر سیڑھی پر بیٹھ جاتے تو مجھے لگتا، وہ بھی کوئی سکھ اپنے ساتھ لائے ہیں، جو میرے ساتھ بانٹنا چاہتے ہیں۔ لیکن سیدھے کچھ نہیں کہتے تھے، الٹے میری زندگی میں داخل ہو کر اس میں تھوڑا سا اجالا بھر دینا چاہتے تھے۔ ہنس کر پوچھتے، "کیوں

Scanned with CamScanner

گورنر صاحب، کلکتے سے کباڑی نے اس بار آپ کو کون سی ردّی بھجوائی ہے؟"

میں انھیں وہ کتابیں دکھاتا تو وہ سیڑھیوں پر ہی پاؤں پھیلا کر رائل سائز کی السٹریٹڈ کتابوں کے پنّے الٹتے پلٹتے رہتے۔ ایک بار ان کے ہاتھ میں پرانی مایا سبھیتا کی کتاب پڑ گئی تو دیر تک وہ مجھ سے ازٹک لوگوں کے بارے میں پوچھتے رہے۔ کیا وہ سچ مچ منش ماس کھاتے تھے؟ کینی بل ازم! وہ منھ کھول کر اپنے نقلی دانت تھوڑا سا کھسکا دیتے۔ نہیں، نہیں وہ ریچول تھا، میں انھیں سمجھانے کی کوشش کرتا... دیوتاؤں کو بلی دی جاتی تھی، اور بعد میں اس کا پرساد ویسے ہی بانٹا جاتا تھا جیسے کالی دیوی پر بکرے کی بلی دینے کے بعد اس کا 'بھوگ' دیا جاتا ہے۔ "منش ماس بھوگ؟" انھوں نے کچھ حیرانی سے پوچھا۔ "نہیں،" میں نے کہا، "وہ اسے مرچ مسالوں میں پکاتے تھے، جس سے آدمی کے گوشت کی گندھ اس کے نیچے دب سکے..." انھوں نے ہامی میں سر ہلاتے ہوئے کہا، "تم ٹھیک کہتے ہو... تبھی تو میکسی امریکی بھوجن اتنا تیز ہوتا ہے۔ ایک بار میرے ایک دوست مجھے ایک میکسیکن ریستوراں میں لے گئے... کھانا کھاتے ہوئے میری آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ ویٹر نے مجھے دیکھا تو آکر پوچھا، صاحب، آپ کو کوئی صدمہ پہنچا ہے؟ ارے بھلے مانس، منش ماس کا مسالا کھاؤ گے تو صدمہ نہیں پہنچے گا؟"

ان کا سر اب بھی حیرانی میں ہل رہا تھا اور آنکھیں کتاب کی ایک فوٹو پر جمی تھیں۔ کچھ دیر بعد وہ سوچتے ہوئے کہنے لگے، "ایک بار میری پوسٹنگ بنگال میں ہوئی تھی۔ جس ضلعے میں میں مجسٹریٹ تھا وہاں ایک ندی بہتی تھی۔ کنارے پر ہی ایک شومندر تھا، اور کچھ فاصلے پر تانترکوں کے سمادھی استھل دکھائی دیتے تھے... میرے ایک بنگالی دوست نے بتایا کہ بنکم چٹرجی نے کپال کنڈلا ناول وہیں رہتے ہوئے لکھا تھا۔ ہو سکتا ہے، وہ وہیں مجسٹریٹ رہے ہوں جہاں میں تھا۔" انھوں نے ہنستے ہوئے میری اور دیکھا، جس میں تھوڑا غرور بھی چھپا تھا۔

"کیوں نہیں ہو سکتا!" میں نے کہا۔ "آپ نے پتا نہیں چلایا؟"

"ارے پتا کیا چلاتا؟ میں نے تو تمھارے بنکم بابو کا نام بھی پہلی بار سنا تھا... ناول بھی بہت بعد میں پڑھا، جو بی بی کی کتابوں میں پڑا تھا۔"

"بی بی؟"

Scanned with CamScanner

میں انھیں دیکھتا رہا۔ وہ دھرتی پر آ گئے۔ ''تیا کی ماں... جب میں دورے پر رہتا تھا، وہ بھی کتابیں پڑھا کرتی تھیں۔''

پہلی بار انھوں نے اپنی پہلی پتنی کا ذکر کیا تھا... وہ بھی بھولے سے... انجانے میں... جیسے کوئی چلتے چلتے اچانک بند دروازے کے آگے چلا آتا ہے اور وہ مدت بعد کھل جاتا ہے، اپنے آپ، بنا کنڈی کھٹکھٹائے... جیسے اسے پیروں کی آہٹ پہلے سے ہی معلوم ہو۔ وہ پیچھے ہٹ گئے... میری طرف دیکھ... سوکھی سی مسکراہٹ چہرے پر چلی آئی۔

''تیا بہت چھوٹی تھی جب وہ چلی گئیں۔ میں نے تمھیں کبھی نہیں بتایا؟''

''جی نہیں... ان کے بارے میں کچھ بھی نہیں۔''

انھوں نے کتاب بند کر دی اور خالی آنکھوں سے اپنی کاٹیج کو دیکھنے لگے جو شام کی دھوپ میں چمک رہی تھی۔ دیودار کی جھکی شاخیں ہلکی ہوا میں ڈول رہی تھیں۔

''تم میرے ساتھ بات چیت کے جو نوٹس بناتے ہو، کہاں رکھتے ہو؟''

مجھے کچھ اچرج ہوا۔ ''اپنی میز کی دراز میں... کیوں؟''

''نہیں... ایسے ہی۔'' ان کی آواز میں ایک کالا سا اندیشہ آ بیٹھا تھا۔

''کیا آپ انھیں دیکھنا چاہیں گے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں نہیں، میں انھیں دیکھ کر کیا کروں گا؟'' وہ کچھ ٹھٹکا سے گئے۔ پھر میری اور دیکھ کر دھیرے سے پوچھا، ''تیا نے تو کبھی ان کے بارے میں تم سے نہیں پوچھا؟''

''نہیں... لیکن...''

''لیکن کیا؟''

''انھیں معلوم تو ہے۔'' میں نے کہا۔

''معلوم ہونا ایک بات ہے، پڑھنا بالکل دوسری بات... میں جو من میں آتا ہے، بکتا جاتا ہوں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ دوسرے لوگ اسے پڑھیں۔''

کیا وہ اپنی بیٹی کو دوسرے لوگوں میں گنتے ہیں؟... یا کوئی دوسری بات ہے جو انھیں ستا رہی ہے؟ کیا وہ سوچتے تھے کہ وہ جو کچھ مجھے اپنی بیتی ہوئی زندگی کے بارے میں بتاتے ہیں، اس میں

Scanned with CamScanner

دوسروں کا حصہ نہیں ہے؟ اگر ایسا ہے تو مجھے کیوں بتاتے ہیں؟ ہو سکتا ہے کچھ لوگ پرایوں کو جتنی آسانی سے اپنے بھید بتاتے ہیں، اتنا اپنے لوگوں کو نہیں۔ اپنے لوگوں کا جھنجھٹ دل کو کانٹوں سا چبھتا ہے۔ جو لوگ تمھیں پیار کرتے ہیں، وہ تمھیں کبھی معاف نہیں کرتے۔

کیا انھیں اپنی بیٹی سے اسی لیے اتنا ڈر لگتا تھا؟

لیکن جب میں کھڑکی سے ان دونوں کو دیکھتا تو وہاں مجھے ڈر کی کوئی پرچھائیں نہیں دکھائی دیتی تھی۔ وہ اپنی باتوں میں اتنے مشغول دکھائی دیتے تھے کہ جب چپ رہتے تھے تو بھی لگتا تھا جیسے ان کے بیچ کچھ بہہ رہا ہے جسے صرف وہ ہی سن پاتے ہیں۔ تیا کے لمبے، چھریرے جسم کے سامنے مہرا صاحب بہت چھوٹے دکھائی دیتے تھے۔ جھکی ہوئی کمر، جو زمین کے متوازی چلتی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ تیا کی باتیں سننے کے لیے وہ جب اپنا سر اٹھا کر کھڑے ہو جاتے تو مجھے وہ ایک اسکول کے لڑکے کی طرح دکھائی دیتے تھے جو قابل رحم حالت میں کسی بڑے کی پھٹکار سنتا ہوا کھڑا رہتا ہے۔ پر یہ لمحے سو بھاگیہ سے زیادہ ٹکتے نہیں تھے۔ وہ دونوں پھر چلنے لگتے تھے... چلتے ہوئے ہونٹوں، اشارہ کرتے ہوئے ہاتھوں اور سننے والی آنکھوں کے بیچ چلتی ہوئی ایک فلم، جسے دیکھ کر مجھے بہت پرانے دن یاد آجاتے، جب مہرا صاحب اپنی پتنی کے ساتھ اسی لان پر گھوما کرتے تھے... وہ ان کا ہاتھ پکڑ کر دھیرے دھیرے کیاریوں سے بچ کر چلتیں کہ پتا بھی نہیں چلتا تھا، کون ان کے ساتھ چل رہا ہے، کس کا ہاتھ ان کے ہاتھ میں ہے۔ وہ مجھے ان لوگوں کی یاد دلاتی تھیں جو سوتے ہوئے چلتے ہیں۔ فرق اتنا ہی تھا کہ ان کی آنکھیں پھٹی پھٹی سی کھلی رہتی تھیں، نہ جانتے ہوئے، وہ کیا دیکھ رہی ہیں۔

ان دنوں مجھے ایک عجیب سی بات پتا چلی، کوئی ان کھوجا سا سچ، سچ بھی پورا نہیں، ایک ادھورا سا آبھاس، جو ہمارے بھیتر گانٹھ کی طرح موجود رہتا ہے، لیکن کھلتا دوسروں کے چھونے سے ہے... یہ چھونا ہی تجربہ ہے جو دریافت سا جان پڑتا ہے... دریافت بڑا لفظ ہے لیکن کھلتا وہ ایک راز کی طرح ہی ہے... ان دنوں جب میں مہرا صاحب کو تیا کے ساتھ گھومتا ہوا دیکھتا اور شام کی پیلی دھوپ پیڑوں سے چھن کر بیڈمنٹن کورٹ پر پھیلی ہوتی اور میری کھڑکی کے سامنے سے وہ دھیرے دھیرے گزرتے ہوئے دکھائی دیتے تو مجھے اچانک لگتا کہ بیتا ہوا کچھ بھی نہیں ہے۔ سب کچھ ویسا ہی ہے جیسا کچھ سال پہلے لگتا تھا، جب مسز مہرا اس دھرتی پر موجود تھیں، اور اتنی بوڑھی نہیں ہوئی تھیں، میں کسی دوسرے

Scanned with CamScanner

شہر میں جیون بتا رہا تھا۔ ایک ایسا علاقہ جہاں سب کچھ پہلے سے ہی ہو چکا ہے، لیکن ابھی ہمارے اوپر سے نہیں گزرا ہے۔ ہم جیتے نہیں، اس کی نقل کرتے ہیں جو کہیں پہلے سے ہی کیا جا چکا ہے... جیسے میں میرا صاحب کا جیون بنی کاپی میں اتارتا تھا۔ پھر سے؟ وہ کیا کچھ بھی نہیں ہے؟ نہیں، وہ ہے، وہ صرف ایک جگہ ٹھہرا رہتا ہے... وہ یاد کی جگہ ہے — جیسے یہ لان، یہ دھوپ، کالج کی چھت پر ڈولتے ہوئے دیودار کے پیڑ... سے وہاں وہاں ہے جہاں جہاں سے ہم بیتے ہیں   ہمارے بھیتر کا گواہ اسٹیشن، جو ہماری ہر بدائی کا گواہ ہونے پر بھی خود ایک جگہ ٹھہرا رہتا ہے...

دو دنوں سے برابر پانی برس رہا ہے۔ بارش کی جھر جھر کمرے کے اندر سنائی دیتی ہے، پر دروازہ کھول کر باہر دیکھو تو دھند کے پردے کے پیچھے کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا۔ جہاں پہلے پیڑوں، دیواروں کی بھری پڑی قطار دکھائی دیتی تھی، اب وہاں ان کے صرف دھندلے سے پریت دکھائی دیتے ہیں، کہرے کے پیچھے کھڑے کنکال۔ اب بالٹیوں، بٹلوئیوں کو لے کر نالے پر نہیں جانا پڑتا تھا۔ پانی کے نالے اپنے آپ گھروں میں گھس آتے تھے۔ میری کوٹھری اور کالج کے بیچ پانی کے اتنے چوبچے جمع ہو گئے تھے کہ بیڈمنٹن کورٹ ایک چھوٹا سا سوئمنگ پول دکھائی دیتا تھا۔ بانج کے پتے، ٹوٹی ٹہنیوں، کائی اور کبھی کبھار کوئی جنگلی بچھو اس پر تیرتے دکھائی دے جاتے تھے۔

دور دور تک کوئی جیتا جاگتا انسان نہیں دکھائی دیتا تھا۔ مجھے کبھی کبھی لگتا کہ باہر کی دنیا سے میرا ناتا ٹوٹ گیا ہے۔ کالج کی بتیاں دن میں بھی جلی رہتیں لیکن بھیتر کوئی دکھائی نہیں دیتا تھا... صرف بتیوں کی چھایا بیڈمنٹن کورٹ کے گندلے پانی پر دیوں کی طرح ڈبڈباتی رہتی۔ پھر کبھی اچانک ایک دوسری چھایا دکھائی دیتی — مرلی دھر پانی میں چھپ چھپ کرتا، ایک ہاتھ میں چھاتا، دوسرے میں کپڑے سے ڈھکی ٹرے لاتا ہوا دکھائی دیتا۔ پہلے پانی میں اس کی دوڑتی چھایا دکھائی دیتی، اور اس کے ترنت بعد وہ خود پوری طرح سامنے ہوتا... میں جلدی سے ٹرے اس کے ہاتھ سے لے کر کمرے میں رکھ آتا اور وہ باہر برآمدے میں اپنے گودڑ کمبل کو لپیٹ کر بیٹھ جاتا۔

''بابو جی، آپ کے کمرے میں آگ جلا دوں؟'' وہ اپنی بیڑی سلگا کر کہتا۔

میں منع کر دیتا۔ جاڑے کے دن بہت دور تھے، اور ویسے بھی وہ جس طرح آرام سے آلتی

پالتی مار کر بیٹھا تھا اس سے یہی لگتا کہ 'آگ جلانے' کی بات محض دکھاوا ہے... اس موسم میں کھانا لے آیا، یہی کیا کم ہے؟

ہم برآمدے میں بیٹھے ہوئے شام کی دھند میں بارش کا گرنا دیکھتے رہتے۔ مرلی دھر کے منہ سے کبھی کبھی ایک دکھ بھری 'سی سی' جیسی سیٹی سنائی دیتی۔

''تمھاری طبیعت تو ٹھیک ہے، مرلی دھر؟''

''کہاں بابو جی... اس موسم میں کبھی کبھی گھٹنوں میں سُول سا درد اٹھتا ہے۔''

میں سمجھ جاتا، اس 'سُول سے درد' کا کیا مطلب ہے۔

''تھوڑی سی برانڈی لو گے مرلی دھر؟... شاید اس سے کچھ آرام ملے۔'' میں تھاہ لینے کی کوشش کرتا۔

''آرام تو اب کیا ملے گا بابو جی... لیکن آپ لیں تو تھوڑی سی میں بھی لے لوں گا۔''

میں بھیتر جاتا اور دو گلاسوں میں برانڈی ڈال کر برآمدے میں لے آتا۔

''آپ کا کھانا ٹھنڈا ہو جائے گا— اسے ہاٹ پلیٹ پر رکھ آتا ہوں۔'' وہ مستعدی سے اٹھ کر بھیتر گیا۔ اس کی ٹانگوں کا درد لگتا تھا، کچھ دیر کے لیے مٹ گیا تھا۔

جب وہ باہر آیا، میں نے اس کا گلاس اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ میرے کہنے پر بھی وہ پاس والی کرسی پر نہیں بیٹھا— وہیں اپنے گودڑ کمبل کو آدھا بچھا کر، آدھا لپیٹ کر بیٹھ گیا۔ بارش کی جھڑی اب اندھیرے میں نہیں دکھائی دے رہی تھی۔ صرف اس کے گرنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

''اب پانی کے یہ جلوس نہیں نکلنا پڑے گا!'' مرلی دھر نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''اب آپ آرام سے صبح سو سکتے ہیں۔''

''دیکھو، ایسا کب تک رہتا ہے!''

''آپ گھبرائیے نہیں... ایک بار جھڑی شروع ہو جائے تو جلدی رکتی نہیں... یہاں ہم لوگ اسے ہچکی بارش کہتے ہیں... ہچکیوں میں چلتی ہے— دو دن بند، پھر شروع، بند، پھر شروع... ایک بار جب نیتا بی جی آئی تھیں تو بیچاری ان ہچکیوں کے بیچ میں اٹکی رہیں... جب جانے کو ہوتیں، ہچکی شروع ہو جاتی!'' وہ ہنس رہا تھا۔

''کب کی بات ہے؟''

''بہت سال پہلے کی... وہ جب آئی تھیں تو یہیں ٹھہرتی تھیں جہاں آپ رہتے ہیں۔''

''یہاں، اس کوٹھری میں؟'' میں نے کچھ تعجب سے اسے دیکھا۔

''جی... صاحب جی بہت منع کرتے، لیکن انھیں یہاں اکیلے میں رہنا اچھا لگتا تھا۔ کہتی تھیں، یہاں سب کے ساتھ رہ کر بھی الگ رہ سکتی ہیں... مجھے ہمیشہ ان کی کچھ باتیں عجیب جان پڑتی تھیں۔''

''کیسی باتیں؟''

''باتیں تو خاص کچھ نہیں۔ مجھے صرف یہ لگتا تھا کہ وہ یہاں کی نہیں ہیں... اس گھر کی نہیں ہیں... مجھ سے ہمیشہ ایسے باتیں کرتیں جیسے میں ان کا نہیں، صاحب جی اور اماں جی کا آدمی ہوں، اور وہ باہر کی ہیں۔ مجھ سے اپنا کام بھی نہیں کراتی تھیں، سب کام خود کرتی تھیں... لیکن اب نہیں...''

مرلی دھر کی آنکھیں اندھیرے میں گرتی بارش پر ٹنگ گئیں۔ ''اماں جی کے جانے کے بعد وہ کچھ بدل سی گئی ہیں۔ پہلے گھنٹوں باہر گھوما کرتی تھیں، کلب کی لائبریری میں بیٹھی رہا کرتی تھیں... مجھے جا کر انھیں بلانا پڑتا تھا... اب جب سے صاحب جی اکیلے رہ گئے ہیں تو زیادہ سے انھی کے ساتھ بتاتی ہیں...''

''لیکن وہ تو پھر بھی اکیلے رہتے ہیں، جب وہ چلی جاتی ہیں،'' میں نے کہا۔

''اکیلے کہاں؟ آپ جو یہاں رہتے ہیں۔ آپ پر بہت بھروسا کرتی ہیں...''

''لیکن میں باہر کا آدمی ہوں... صاحب جی کو ان سے جو سہارا ملے گا، مجھ سے نہیں۔''

''کیا کہتے ہیں آپ؟'' مرلی دھر کی آواز بھرا آئی گئی۔ ''آپ بتایئے، کیا اماں جی آپ کو باہر کا آدمی سمجھتی تھیں؟''

''وہ اب کہاں رہیں، مرلی دھر؟''

''وہ یہیں ہیں بابو جی... گھر کا کوئی آدمی گھر تھوڑے ہی چھوڑ دیتا ہے...''

میں نے اس کی اور دیکھا... جہاں سے اس کی آواز آئی تھی وہاں کچھ نہیں تھا، صرف بارش کے بھیگے اندھیرے میں اس کے ہونے کا آبھاس دکھائی دیتا تھا۔ کیا وہ بھی ایسی تھیں، صرف ہونے کا آبھاس دیتی تھیں، پر دکھائی کہیں نہیں دیتی تھیں؟

Scanned with CamScanner

اچانک مرلی دھر کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

''ایک بات پوچھوں، بابو جی؟ آپ کا کوئی پیچھے ہے؟''

''پیچھے؟''

''میرا مطلب ہے.. جہاں سے آپ آئے ہیں، جس کی ذمے داری آپ پر ہو؟''

''نہیں... کیوں پوچھتے ہو مرلی دھر؟''

''اس لیے کہ اگر کوئی نہیں ہے تو آپ یہیں کیوں نہیں رہ جاتے؟''

''یہیں تو رہ رہا ہوں...''

''میرا مطلب ہے، ہمیشہ کے لیے۔''

کیا اس نے بہت پی لی ہے؟ لیکن اس کی بات میں چھلاوا نہیں تھا.. صرف ایک بھولی سی امید تھی

''کوئی ہمیشہ رہتا ہے، مرلی دھر؟''

''آپ نہیں رہنا چاہیں گے؟''

''کیا ہوگا اس سے؟''

''آپ نہیں جانتے... بہت کچھ! اس کا پتا ابھی سے نہیں لگ سکتا...'' مجھے لگا جیسے اندھیرے میں مرلی دھر کی آنکھیں مجھے گھور رہی ہیں، کسی اور اندھیرے کو چھیدتی ہوئی، جسے میں نہیں دیکھ سکتا تھا۔

باہر بارش کی تیزی ڈھیلی پڑ گئی تھی، لیکن پیڑوں کی جھکی ٹہنیوں سے جھرتی ہوئی بوندوں کی ٹپ ٹپ سنائی دے رہی تھی۔

''آپ کی دارو نے دوا کا اثر کیا ہے... ساری تکلیف جاتی رہی۔''

میں سمجھ گیا، وہ کیا چاہتا ہے۔ میں بھی یہی چاہتا تھا کہ وہ کچھ اور دیر میرے پاس بیٹھا رہے۔ بارش کی اس ٹھٹھرتی شام میں میں اکیلے کمرے میں ان شبدوں کے ساتھ نہیں رہنا چاہتا تھا جو اس نے کہے تھے، جواب بھی کہیں ہوا میں ٹھہرے تھے، اور جو اس کے جاتے ہی مجھ پر ٹوٹ پڑیں گے۔

''تھوڑی سی اور لے لو مرلی دھر... بارش رکتے ہی چلے جانا۔''

وہ کچھ نہیں بولا، صرف کہیں چھاتی کے کھوکھل سے ایک سیڑھی سی ہونکار باہر آئی۔ جب میں اس

Scanned with CamScanner

کے پاس اس کا گلاس دینے آیا تو اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

''اُدھر دیکھیے ذرا۔''

مجھے پتا نہیں چلا وہ مجھے کیا دکھانا چاہ رہا تھا، لیکن میری آنکھیں اس اور مڑ گئیں جہاں اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا تھا۔ ہوا میں اڑتی سفید دودھیا دھند کے پیچھے کاٹیج کی روشنیاں جھلملا رہی تھیں... اپنی الگ اکیلی دنیا میں ٹمٹماتی ہوئی۔

''آپ نے دیکھا، بابو جی؟'' وہ رک گیا، میرا ہاتھ چھوڑ دیا، ایک لمبی سی سانس، نشے میں لدی پھندی، پھنکارتی ہوئی باہر آئی۔ ''آپ سوچ سکتے ہیں، وہاں کوئی رہتا ہے؟ کون رہتا ہے؟ صاحب جی؟ اور جب صاحب جی نہیں رہیں گے... تب؟''

''تب کیا؟'' ایک ٹھنڈی سی جھرجھری میرے بھیتر رینگنے لگی۔

''آپ سوچتے ہیں، بنیا یہاں رہیں گی؟'' وہ ہنسنے لگا — ایسی پھنکارتی سی ہنسی جو کبھی نہیں سنی تھی، جو اپنے جسم سے الگ چھٹک کر کہیں اکیلے میں اپنے آپ ہنستی دکھائی دیتی تھی۔ ''جس طرح اتانی زمین کے نیچے دبی ہیں... یہ مکان بھی ایک دن کہیں نیچے دبا رہ جائے گا... ہمیشہ کے لیے! کیا آپ یہ چاہیں گے؟''

پہلی بار مجھے سچ مچ ڈر سا لگا، اس سے نہیں جو وہ کہہ رہا تھا، بلکہ اس بھیڑ آواز سے جو کسی اندھیرے مستقبل کی کھوہ سے باہر آتی سنائی دیتی ہے — پہاڑوں کی لینڈ سلائیڈ کی طرح، جس کی گڑگڑاہٹ پہلے سنائی دیتی ہے، گرتا ٹوٹتا دھنستا بعد میں۔

اس نے آگے کچھ نہیں کہا... اس لیے نہیں کہ وہ جو کہنا چاہتا تھا، چک گیا بلکہ جو بچ گیا تھا، وہ بنا کہے ہی بہہ گیا۔ ہمیں پتا بھی نہیں چلا، بارش گرتی کب کی بند ہو گئی ہے۔ اوپر آکاش میں تارے نکل آئے تھے، بادلوں کے روئی سے پھاہوں کے بیچ ہیروں سے چمکتے ہوئے۔ مرلی دھر یکدم اٹھ کھڑا ہوا... بارش کی گرتی بوندوں کی لے ٹوٹنے پر، مانو اس کی باتوں کی رو بھی ٹوٹ گئی۔ ''میں چلتا ہوں، بابو جی...'' وہ جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا، کمبل کو ایک دو بار جھاڑ کر اپنے بدن پر لپیٹ لیا، اور چھتری کو ہلاتا ہوا، لمبے ڈگ بھرتا ہوا اندھیرے میں گم ہو گیا۔

مرلی دھر کے جانے کے بعد بھی دیر تک میں برآمدے میں بیٹھا رہا۔ کاٹیج کی بتیاں بجھ گئی

Scanned with CamScanner

تھیں۔ ایک غیرزمینی سی روشنی میں سارا جنگل نہا رہا تھا۔ چیڑوں کی لمبی پھننگیوں پر تاروں کا جھلملا سا ٹنک رہا تھا۔ نیچے کھائی سے برسے ہوئے بادل ہلکے ہوکر اوپر اٹھ رہے تھے۔

میں بھول گیا، مرلی دھر نے کیا کہا تھا۔ میں یہ بھی بھول گیا کہ میں وہی تھا جو بھی کچھ دیر پہلے تھا۔ لگتا تھا، جیسے ساری قدرت ڈھلے ہوئے بادلوں اور تاروں کی روشنی میں اپنے پرانے پہچانے آکاروں کو چھوڑ کر کسی نئے اوتار میں ظاہر ہو رہی ہے، جہاں روپ وہی رہتا ہے، پہچان بدل جاتی ہے... کیا آدمیوں کے ساتھ بھی ایسا ہوتا ہے، جیسے جیسے وہ پہچانی دنیا کے آکاروں سے چھوٹ کر موت کے دوسرے کنارے تک پہنچتے ہیں؟

1.10

دوسرے دن بادلوں کا نام نشان نہیں تھا۔ دھلی دھلی روپہلی روشنی میں سارا جنگل چمک رہا تھا۔ چیڑوں کے بیچ دھوپ چاندی کے چھلوں سی بکھری تھی... دوپہر ڈھلتے ہی مرن دھر کا بیٹا جنسی اپنی کالی کے ساتھ بھاگتا ہوا میرے کمرے میں آیا اور زور زور سے میرا دروازہ کھٹکھٹانے لگا۔

"آپ کو بلایا ہے... جلدی!" اس نے ہنستے ہوئے کہا، "میم صاحب آئی ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ جیسے آیا تھا، ویسے ہی مڑ گیا... کالی کو کچھ نراشا ہوئی۔ وہ میرے ساتھ کچھ دیر کھیلنا چاہتی تھی، لیکن جب اس نے جنسی کو الٹے پاؤں لوٹتے دیکھا تو وہ بھی پان جیسی زبان ہلاتے ہوئے اس کے پیچھے بھاگنے لگی۔

اناجی کا آنا ایک واقعہ تھا۔ کوئی اور دن ہوتا تو ان کا آنا ایک تیوہار سا لگتا، موسم کی دھوپ کے ساتھ ایک دوسری دھوپ، ایک ہلکی سی گرمائی جو وہ اپنے ساتھ لاتی تھیں۔ لیکن اس دن مجھے ان کا آنا ایک کھٹکا سا جان پڑا... پچھلی رات مرلی دھر نے جو کہا تھا... یا وہ صرف میرا بھرم تھا؟... میرے اپنے من کا ڈر، جو اس طرح انھیں اچانک دیکھ کر ابھر آیا تھا؟

کتنے دنوں بعد انھیں اپنے گھر کے باہر دیکھا تھا۔ وہ ایک سجی سجائی گڑیا سی، ایزی چیئر پر بیٹھی تھیں۔ اس دن وہ پیلے اون کی بنی لمبی اسکرٹ پہن کر آئی تھیں۔ ان کے گلے میں کالی بندکیوں والا سفید مفلر لپٹا تھا۔ چہرے پر ہلکا سا پاؤڈر تھا اور ہونٹوں پر بہت مند رنگ کی گلابی لپ سٹک، جو بیچ میں

Scanned with CamScanner

چھوٹی چھوٹی ریکھاؤں میں بٹ گئی تھی۔ ان کے سفید بال ایک شنگ قسم کے سرخ اسکارف سے چھپ گئے تھے پر چاند سے تھے چھوڑا تھا، جس پر گنتی ریکھا میں نقشے پر تنی ندیوں کی یاد آتی تھیں۔ جب میں آیا تو انھوں نے مجھے دیکھا بھی نہیں وہ پوری تن کر چائے کی پیالی میں بسکٹ ڈبو کر کھا رہی تھیں۔ تایا ان کے پاس ہی اسٹول پر بیٹھی تھیں۔ جب بھی چائے میں بھیگا ہوا بسکٹ ٹوٹ کر ان کی انگلیوں پر آ گرتا تو وہ چپ چاپ اسے رومال سے پونچھ دیتیں۔

یہ تصویر ہے بابا؟ یا یادوں کی پورٹریٹ، جس میں میں بھی بیٹھا ہوں، صوفے کے پاس جہاں میرا صاحب لیٹے ہیں؛ بیٹھے نہیں، کشن پر سر رکھ کر آدھ لیٹے سے بیٹھے ہیں۔ انھوں نے مجھے سب سے پہلے دیکھا تھا۔ چہرے پر چھوٹی سی مسکان آئی تھی، ایک تسکین... جیسے میرے آنے سے تصویر کا کوئی چھوٹا ہوا حصہ پورا ہوا ہو۔ وہ دھیرے سے میرے پاس جھک آئے، چھوٹے سے لہجے میں صاف کہ ... مجھے صرف ان کی کھانستی سانس سنائی دی۔

میں نے ... ہاتھ ان کے گھٹنے پر رکھ دیا۔

... تھا، جو ساری تصویر کے ... کو ہلا گیا... تائی کی آنکھیں اوپر اٹھیں ... جہاں میں تھا اسے چھوڑ کر وہیں مڑ گئیں، لیکن شاید ان کی ... ہوئی ہوگی۔ ... بولتے بولتے رک گئیں، اور تایا کی ... وہاں ... میں جہاں میں بیٹھا تھا... پہلے مجھے انھوں نے مجھے پہچانا نہیں جیسے ان کی طرف راستے میں میں کوئی اجنبی ہوں۔ وہ تھوڑا سا قریب سرک آئیں، کچھ ان آنکھوں سے مجھے دیکھا... صرف چہرہ، پہچان نہیں۔ اس کے لیے یادوں کی رسی کو کھینچا، تا کہ اجنبی ... سے باہر آ جائے۔ تم آ گئے؟ وہ مسکرا رہی تھیں، جھریوں کے بیچ ان کی ... آنکھوں میں میں آ بیٹھا تھا۔ وہ بے خبر ہوئی تھیں ... ان کا تھا۔ ان کی پہچان کی روشنی میں چلا آیا تھا۔ میرے آنے سے جو بات بیچ میں ٹوٹ گئی تھی، وہ پھر چلنے لگی۔

مجھے ... سنا رہی تھیں۔ صرف اتنا یاد ہے، ہم سب ان کی آواز سنتے ... بیٹھے تھے ... بیچ میں ہاتھ سینک رہے تھے۔ کھڑکیوں پر ابھی پردے نہیں کھینچے گئے تھے ... سے جاتی تھی۔ اس کے نیچے درختوں

میں کوئلے رکھے تھے، لیکن مرن دھر نے انھیں جلایا نہیں تھا۔ بجلی کے جلتے بلبوں کے اردگرد پتنگوں کا جھنڈ ایک عجیب سی دھن دھن آواز کرتا گھوم رہا تھا... نیچے فرش اور صوفے اور کرسیوں پر مرے ہوئے پتنگوں کا جال سا بچھا دکھائی دیتا تھا، جیسے وہاں کسی نے تل کے سفید بیجوں کا ڈھیر بکھیر دیا ہو۔ وہ بلب سے ٹکراتے تھے اور تڑ تڑ کرتے نیچے گرتے جاتے تھے۔

ور تب میرا دھیان اچانک جھٹک گیا... تیا نے ہلکے سے میرا کندھا جھنجھوڑ کر کہا، "ناجی آپ سے کچھ پوچھ رہی ہیں۔"

میں جیسے سوتا ہوا جاگ گیا۔

"آپ نے مجھ سے کچھ کہا، ناجی؟"

"ہاں تم سے نہیں تو اور کس سے؟... تیا اتنے دنوں سے یہاں آئی ہے، تم نے کیا کیا اس کے لیے؟"

"کیا کرنا چاہیے، ناجی؟"

"اس بیچاری سے نالے کا پانی بھروانا چاہیے... اور کیا؟"

مہرا صاحب ہنسنے لگے۔

"میں ہر روز اپنے برآمدے میں تم لوگوں کی بازٹولی کو دیکھتی ہوں... کیا اسی لیے اس لڑکی کو یہاں بلایا تھا؟"

"ناجی، یہ تو کچھ نہیں ہے... جب میں چھوٹی تھی، آپ مجھے کیسے صبح بستر سے کھینچ کر تارا دیوی کے مندر لے جاتی تھیں۔" تیا نے ہنستے ہوئے کہا۔

"تارا دیوی؟" ناجی کی بوڑھی آنکھوں میں کوئی پرانا سپنا سرک آیا۔ "وہ بھی کوئی دیوی تھیں انھیں دیکھتے ہی مجھے لگتا تھا کہ وہ مجھے گھور رہی ہیں۔ ان کی آنکھوں کی کھوکھل میں نیلی کوڑیاں چمکتی رہتی تھیں۔ انھیں دیکھتے ہی مجھے اپنی بوڑھی دادی یاد آنے لگتی تھیں... بالکل نیلی، پتھریلی آنکھیں! مجھے اچنبھا ہوتا تھا، جیسے وہ جرمنی سے اڑ کر اس مندر میں چلی آئیں! تمھیں وہ بنگالی بابا یاد ہیں جو تمھیں پرساد دیتے تھے؟"

"وہ تو بہت پہلے مر گئے،" تیا نے کہا۔ "اب ان کا ناتی مندر کا پجاری ہے۔"

"مر گئے... کب؟ تم نے مجھے بتایا نہیں۔"

Scanned with CamScanner

"میں یہاں نہیں تھی، اما جی!"

"لیکن میں تو تھی... مجھے تو کوئی بتا سکتا تھا!"

ان کی آواز ایک دم سے بھرا سی گئی، جیسے کسی نے انھیں دھوکا دیا ہو۔ تیا نے شکایت بھری نگاہ سے مہرا صاحب کی اور دیکھا... وہ چپ چاپ خالی آنکھوں سے دیوار کو تاک رہے تھے۔

"پرساد بڑے انتظار کے بعد ملتا تھا..." تیا نے ان کا دھیان ہٹانے کے لیے کہا، "ایک دم شروع میں نہیں... مجھ سے کہتے تھے، پہلے میں دیوی کے چاروں طرف پریکرما کروں... اور جب میں پوچھتی تھی، پریکرما کیا ہوتی ہے، تو وہ ہاتھ گھما کر کہتے تھے، راؤنڈ اینڈ راؤنڈ... ساتویں راؤنڈ پر وہ مجھے گودی میں اٹھا لیتے تھے، کندھے پر بیٹھا کر گھنٹہ بجواتے تھے اور جب آخری گھنٹے کی گونجتی آواز پاس آتی تھی تو کہتے تھے، سنا تم نے؟ یہ تارا دیوی کی آواز ہے۔ جانتی ہو، مجھ سے کیا کہہ رہی ہیں؟... کہہ رہی ہیں منّی کو پرساد دو، اس نے گھنٹی بجا کر مجھے بہت دیر سے بلایا ہے... میں سوچتی تھی، وہ سچ کہہ رہے ہیں۔ یہ نہیں لگتا تھا، وہ مجھ سے ہنسی میں سب کہہ رہے ہیں۔"

"ہنسی کیسی پاگل؟" اما جی کا چہرہ ایک دم گمبھیر سا ہو گیا۔ "وہ سچ کہتے تھے۔ میں بھی تو گھنٹیوں کی آواز سن کر ہی پہلی بار دیوی کے پاس گئی تھی۔ اس دن نہ جاتی تو تمھارے سامنے تمھاری اما جی نہ بیٹھی ہوتیں۔"

"کیا کہتی ہو، اما جی؟"

"جو کہتی ہوں، ٹھیک کہتی ہوں... ان دنوں یہ شہر مجھے کھانے کو دوڑتا تھا۔ دن رات اپنے کو کوستی تھی، میں کیسے یہاں آ گئی۔ ڈاکٹر سنگھ مجھے ڈپریشن کی دوا دیتے تھے، لیکن ہوتا کچھ نہیں تھا۔ ایک شام جب میں ان کی کلینک گئی تو وہ مجھے چپ چاپ دیکھتے رہے، جیسے انھوں نے میرے چہرے پر کچھ دیکھا ہو، جو پہلے وہاں نہیں تھا..."

کچھ دیر کمرے میں سناٹا رہا۔

"کیا دیکھا انھوں نے آپ کے چہرے پر؟" مہرا صاحب کی آواز سنائی دی۔ وہ صوفے پر اٹھ کر بیٹھ گئے تھے۔ ٹیبل لیمپ کی روشنی سیدھی ان کے سکڑے سمٹے جسم پر گر رہی تھی۔

"مجھے نہیں معلوم، انھوں نے کیا دیکھا... لیکن ضرور کچھ دیکھا ہوگا کہ میرے کانپتے ہاتھ کو

اپنے ہاتھ میں لے کر بولے، "ا، کیا تم جرمنی لوٹ جانا چاہو گی؟ جرمنی! مجھے لگا، جیسے انھوں نے کوئی تھپڑ میرے منھ پر مارا ہو۔ میں نے اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ سے نکال لیا۔ میں نے ان سے کچھ اور نہیں پوچھا۔ میں باہر چلی آئی۔"

وہ کچھ دیر چپ بیٹھی رہیں... پھر ایک چھوٹی سی مسکان ان کے چہرے پر آئی... بیا کی اور دیکھا۔ "میں کیا کہہ رہی تھی؟"

"تارا دیوی؟"

"اوہ، گھنٹے کی بات!" ان کی نیلی آنکھوں میں دو چمکیلی بندکیاں اتر آئیں۔ "نہیں، وہ ہنسی نہیں کر رہے تھے۔ گھنٹے کی آواز سن کر تارا دیوی کہیں بھی بیٹھی ہو، فوراً نیچے اتر کر آتی ہے۔ ایسا ہوتا ہے۔ میں نے تو خود دیکھا ہے۔ اس شام جب میں ڈاکٹر سنگھ کی کلینک سے باہر آئی تو مجھے لگا جیسے کسی دھند کے بھنور میں چل رہی ہوں۔ میں چلتی گئی۔ مجھے پتا بھی نہیں چلا میں کہاں جا رہی ہوں... دور ہوا میں مجھے گھنٹیوں کی آواز سنائی دی، مجھے اپنے پاس بلاتی ہوئی، بالکل ویسے ہی جیسے بچپن میں میں اتوار کے دن اپنی دادی کا ہاتھ پکڑ کر گرجے جاتی تھی۔ اچانک میں نے دیکھا کہ میں سفید پتھر کی سیڑھیوں کے سامنے کھڑی ہوں... لمبی سیڑھیاں، ایک کے اوپر دوسری، اوپر جاتی ہوئی۔ سیڑھیوں کے اوپر اندھیرے میں صرف ایک روشنی دکھائی دے رہی تھی... میں جتنا اوپر چڑھتی گئی، روشنی کا گھیرا بڑھتا گیا اور اس کے ساتھ گھنٹیوں کی آواز۔ سیڑھیاں ختم ہوتے ہی مجھے مندر کا گیٹ دکھائی دیا... کوئی اور دن ہوتا تو میں بھیتر نہ جاتی، لیکن اس شام کلینک سے نکلنے کے بعد میرے لیے بھیتر اور باہر کا کوئی مطلب نہیں رہ گیا تھا۔ بنا کچھ سوچتے ہوئے میں مندر کے آنگن میں چلی آئی... میں نے دیکھا، آرتی کے بعد لوگ باہر آ رہے ہیں۔ ہر آدمی مندر کے باہر لگے گھنٹے کو بجاتا ہے اور پھر گیٹ سے باہر نکل جاتا ہے۔ میں ان سے چھپ کر ایک کنارے پر کھڑی ہو گئی۔ جب مجھے لگا، سب لوگ چلے گئے ہیں، تو میں بھیتر چلی آئی... بالکل مندر کے دروازے کی دہری پر... اور جب میں نے اپنی آنکھیں اوپر اٹھائیں تو میں نے دیکھا... دھوپ، اگربتیوں اور کپور کی لپٹوں سے اٹھتے ہوئے دھوئیں کے بیچ اونچے سنگھاسن پر میری دادی بیٹھی ہیں... بالکل ویسی ہی، مجھے اپنی محبت بھری آنکھوں سے نہارتی ہوئی، جیسے میں اب بھی بچی ہوں اور وہ اب بھی جیوت ہیں... اور تب میں وہیں مندر کی دہری پر بیٹھ گئی اور... رونے لگی۔ مجھے لگا، میرے بھیتر

Scanned with CamScanner

وہ دن چھپا پھوٹ پڑے، جو پتا نہیں کتنے دنوں سے میرے اندر پک رہا تھا۔''

نانی کی آواز لیٹے ہوئے بیٹے کا سانس رک سی گئی... کچھ دیر بعد جب ان کی آواز سنائی دی تو وہ بے حد صاف اور اجلی تھی... جلی اور صاف دھلی ہوئی۔

''تجھے معلوم نہیں، میں وہاں مندر کی دہری پر بیٹھ کر کتنی دیر روتی رہی۔ مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ میں سچ مچ رو رہی تھی یا نہیں اور چلی گئی تھی، جہاں مجھے اپنا رونا کہیں باہر سے سنائی دے رہا تھا۔ ہماری زندگی میں ایسے موقعے آتے ہیں جب ہم اپنے کو کسی باہر سے دیکھنے لگتے ہیں... ہم جیسے خود اپنے ہی تماشائی بن جاتے ہیں... ایسی وہ سب کے، جو مجھ سے الگ ہو کر مجھے بلا رہی تھی... اپنے رونے میں، جسے میں پہلے سے باہر سن رہی تھی۔ میرے اور میرے بیچ کوئی تیسرا بھی ہو سکتا ہے، میں اس کی کلپنا بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اسی لیے جب کچھ دیر بعد مجھے لگا، کوئی دھیرے دھیرے میرا کندھا ہلا رہا ہے تو میں نے اس طرف کوئی دھیان نہیں دیا، لیکن تبھی مجھے لگا، کسی ہاتھ نے میرا جھکا ہوا سر اوپر اٹھا دیا ہے، اور تب آنسوؤں کے دھندلکے میں ایک شانت، مہربان چہرہ دکھائی دیا... جسے میں نے اس دن سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

''...میرے سامنے تیری چاچی کھڑی تھی!''

''دیو...؟'' مہتا صاحب کی سانس پر وہ نام سوئی کی طرح بندھا تھا۔

اماجی کے منہ سے نکلا وہ نام اتنا غیر متوقع تھا کہ پہلے لمحے وہ ایک چمگادڑ کی طرح ہم سب کو چھوتا ہوا نکل گیا، ایک ٹھنڈی سی سنسنی میں ہم سب کو جھنجھوڑتا ہوا۔ لیکن اگلے پل ہی وہ واپس لوٹا اور اس بار نام نہ ہو کر ایک چہرہ تھا، پرانے چہرے سے کہیں زیادہ پورا، بھرا پُرا، جیوت، چمکیلا۔ ''کیا وہ سچ مچ چاچی تھیں؟''

اماجی نے ایک عجیب نگاہ سے تپو کو دیکھا، ایک بھید بھری مسکان ان کے چہرے پر تیر رہی تھی۔ ''جنگل کی تارا دیوی اور میری دشمن، اس کے بیچ بھلا اور کون ہو سکتا تھا! پتا نہیں وہ مندر کے کس کونے میں کھڑی مجھے دیکھ رہی تھیں۔ اب میرے پاس چپ چاپ چلی آئی تھیں کہ میرے پیچھے چہرے کے پیچھے رونے کو سنا تھا، میرے کندھے کو ہلایا تھا... آپ کون ہیں؟ میں نے پوچھا... تو ہنستے ہوئے بولیں، میں بالکل آپ کی کاٹیج کے نیچے رہتی ہوں... میری بیٹی آپ کو جانتی ہے۔ آپ کی

نئی...کون؟ میں نے حیرانی سے انھیں دیکھا۔ آپ اسے تانی دیتی ہیں... دیدآیا آپ کو؟... مجھے کیا معلوم تھا کہ تیری چاچی کے ساتھ میرا ملنا ایسا ہوگا... مندر کے آنگن میں ایک کھوئے ہوئے بچے کی طرح روتے ہوئے..."

کچھ دیر تک کوئی کچھ نہیں بولا۔ مجھے لگا، جیسے ہم سب کے بیچ کوئی چپ چاپ آ کر بیٹھ گیا ہے — جیتے ہوئے لوگوں کے بیچ سب سے زیادہ جیتا ہوا جیو۔ ہم سب انھیں اپنی اپنی جگہ دیکھ سکتے تھے، جبکہ ان کی اپنی جگہ کب کی خالی پڑی تھی... مرنے کے بعد آدمی اپنے سے چھوٹ کر کتنے لوگوں کے بیچ بٹ جاتا ہے۔

"لیکن دیوا... وہ تو کبھی مندر نہیں جاتی تھی؟" مہرا صاحب نے گھورتے ہوئے اناجی کو دیکھا، جیسے انھیں وشواس نہ ہو کہ وہ سچ کہہ رہی ہیں۔

"وہ اس شام شاید ویسے ہی چلی گئی ہوں جیسے میں چلی گئی تھی۔ گھاٹیوں میں پتا نہیں کون خبر لے کر آتا ہے۔ بھلا مجھے وہاں کھینچ کر کون لے گیا تھا؟ دیوا یا دیوی — اس سے کوئی فرق پڑتا ہے؟"

مہرا صاحب سونی آنکھوں سے ہوا میں تاکتے رہے۔ "میں اتنے سال یہاں رہا، لیکن تارا دیوی کا کوئی مندر ہو سکتا ہے، یہ آج ہی معلوم ہوا! آپ نے دیکھا ہے؟" انھوں نے میری اور دیکھا۔

"ادھر سے گزرا ہوں، لیکن بھیتر کبھی جانا نہیں ہوا۔"

"بس، کبھی پکنک کے لیے چلیں گے۔" اناجی نے خوشی سے تالی بجائی۔ یہ ان کی پرانی عادت تھی۔ جب وہ کسی بات سے خوش ہو جاتیں تو وہ اس کا سیدھا مظاہرہ تالی بجا کر کرتی تھیں۔ "ڈاکٹر سنگھ کو بھی کہلا بھیجیں گے... وہ آئیں گے تو ساتھ میں سیٹ سیاتین کو بھی لے آئیں... میں اب اتنی دور اوپر پیدل نہیں چڑھ سکتی، چاہے دیوی کتنی ہی گھنٹیاں کیوں نہ بجائے!"

"کب جانا ٹھیک ہوگا؟" مہرا صاحب کی آواز میں ایک عجیب سی خوشی چھلک رہی تھی، جیسے اپنی بیماری کو دھوکا دے کر پھر دوبارہ سے اپنی پرانی، کھلی دنیا میں لوٹ آنے کو بے چین تھے...

"تم بتاؤ!" اناجی نے تیا کو دیکھا، جو اب تک چپ چاپ سب کی باتیں سن رہی تھی۔ El.جی نے کچھ حیرانی سے پوچھا، "کیا بات ہے؟"

"اس بار مجھے معاف کریں، اناجی... مجھے جلدی لوٹنا ہے... میری چھٹی کے دن تو کب کے ختم

ہو گئے۔ آپ لوگ کیوں نہیں چلے جاتے؟"

ابا جی کا چہرہ بجھ گیا۔

"تم بھی خوب ہو... یہ سب ہم تمہارے آنے کی خوشی میں ہی تو کر رہے تھے... ہم تو یہاں بارہ مہینے رہتے ہیں۔"

کچھ دیر سناٹا چھایا رہا... پھر مہرا صاحب کی آواز سنائی دی۔

"تم نے یہ پہلے تو نہیں بتایا تھا..."

"آپ کو معلوم ہے ان دنوں مجھے کتنا کام رہتا ہے..."

"پھر تمہیں نہیں آنا چاہیے تھا..."

مہرا صاحب صوفے سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کا چہرہ ایک دم جذبات سے عاری تھا... جیسے کچھ دیر پہلے کا جوش اچانک ایک لپٹ میں جل کر راکھ ہو گیا ہو... بغیر کسی کی اور دیکھے وہ دھیمے قدموں سے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

تیا نے اٹھنا چاہا، لیکن وہ اٹھی نہیں، دروازے کو دیکھتی رہی جہاں سے وہ گئے تھے۔ گھنے سناٹے میں جھینگروں کے شور کے علاوہ کچھ بھی سنائی نہیں دیتا تھا... سوا ہماری سانسوں کے، جو وہاں بیٹھے تھے۔

"تیا، کیا تم ان کے لیے کچھ دن رک نہیں سکتیں؟" ابا جی نے کہا۔

"ان کے لیے؟" تیا کی آواز میں کچھ بیزاری سی ابھر آئی۔ "وہ ہی سب کچھ نہیں ہیں... ابا جی!"

"تمہاری ضد... اور کچھ نہیں!"

تیا ہنسنے لگیں... روکھی سی ہنسی، جو اپنے پر ہنستی ہے۔ "میری ضد ہوتی تو یہاں کبھی نہ آتی انھیں دوسرے لوگوں پر چھوڑ دیتی..."

"دوسرے لوگ؟ کون دوسرے لوگ؟"

"آپ، یہ، اور... وہ چاچی سب سے زیادہ، جو یہاں سے چلی گئیں... کیا ان کی کوئی ذمے داری نہیں جو اپنے پیچھے دوسروں کو چھوڑ جاتے ہیں؟"

Scanned with CamScanner

"کیا کہہ رہی ہو تیا؟ ہوش میں تو ہو؟"

تیا اٹھ کھڑی ہوئیں، کھڑکی کے پاس جا کر کھڑی ہو گئیں... ان کے بالوں کا جوڑ ڈھیلا پڑ کر کندھے پر سرک آیا تھا۔ دبلے جسم کی چھایا کھڑکی کے شیشے سے ہمیں دکھائی دے رہی تھی، جیسے وہ باہر بھی ہوں، بھیتر بھی، اپنے گھر میں ہوتے ہوئے بھی ہمیں باہر سے دیکھتی ہوئی۔

"میں ہوش میں ہوں اتا جی... اتنا ہوش میں ہوں کہ سمجھ میں نہیں آتا، میں یہاں کیوں ہوں، کیوں بار بار لوٹ آتی ہوں۔"

"کیا بات کرتی ہو!... یہ تمھارا گھر ہے... یہاں نہیں آؤ گی تو اور کہاں جاؤ گی؟"

"میرا گھر؟" تیا کھڑکی سے لوٹ آئی، اتا جی کے سامنے چلی آئیں۔ "کون سا گھر؟ یہ؟" وہ ہنسنے لگیں۔ "آپ کو تو معلوم ہے، میں یہاں کیسے آئی تھی۔ مجھے یہاں کسی نے نہیں بلایا تھا... میں نے کسی کی آواز نہیں سنی تھی... میں نے اپنے کو پرائے گھر کی سیڑھیوں پر پایا تھا... اسے آپ میرا گھر کہتی ہیں؟"

وہ وہیں گھٹنے ٹکا کر بیٹھ گئیں۔ اپنا سر صوفے کے ہتھے پر ٹکا لیا۔ جوڑے کے بال بکھر کر نیچے لٹک آئے۔ اتا جی اپنی سفید پتھرائی آنکھوں سے انھیں دیکھتی رہیں... پھر دھیرے دھیرے اپنی مرجھائی انگلیوں سے ان کے بالوں کو سہلانے لگیں... سے کیسے اچانک اپنے پاٹ پلٹ دیتا ہے، چڑا کے دو کناروں کے بیچ ان بہتا جاتا ہے... اس شام کمرے کے کونے میں ان دونوں کو دیکھتے ہوئے مندر کی وہ شام یاد ہو آئی، جب تیا کی جگہ اتا جی سیڑھیوں پر بیٹھی تھیں اور انھیں سہلاتے ہوئے ہاتھ کسی ایسے کے تھے جو نہ جانے کب سے سمٹری کے نیچے دبے ہوئے گارے مٹی میں گل چکے ہوں گے۔ کیا ایسا ہمیشہ ہوتا رہتا ہے اور ہم میں سے ہر کوئی یہ بھرم پالے رہتا ہے کہ اس کے ساتھ پہلی بار ایسا ہو رہا ہے؟

"مجھے بہت دیر ہو گئی، چلتی ہوں۔" اتا جی اٹھ کھڑی ہوئیں، لیکن تیا ویسے ہی بیٹھی رہیں، ان کی جھکی ہوئی ساکت دیہہ میں ذرا بھی حرکت نہیں ہوئی۔ اتا جی دھیمے قدموں سے میرے پاس آئیں، لیکن رکیں نہیں، چلتی گئیں۔ جب دروازے کی دہلیز پر آئیں تو مڑ کر میری اور دیکھا۔ "میرے ساتھ آؤ گے؟"

باہر مرلی دھر پہلے سے ہی لالٹین لے کر کھڑا تھا۔ اوپر آکاش میں اکے دکے تارے ٹمک رہے تھے۔ بہت دھیمی ہوا تھی، جو سوتے ہوئے پیڑوں کو سہلاتے ہوئے نکل جاتی تھی۔ ہم کچھ قدم آگے

Scanned with CamScanner

چپ ہوں گے کہ پیچھے سے آواز سنائی دی... تیا کی آواز... میں لمحہ بھر دوڑتا ہوا، گھر کی طرف گیا۔ ہم وہیں دیر، تاروں اور ہوا کے بیچ کھڑے رہے۔ کچھ دیر بعد ہمیں تیا ٹارچ لیے پاس آتی دکھائی دیں... انھوں نے ٹارچ مجھے پکڑا دی اور خود اماں جی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”چلیے... آپ کھڑے کیوں ہیں؟“

کیا یہ بھی تصویر کا ایک پہلو ہے؟ جو اپنے میں رکے ہوئے ہوئے بھی چلتا پھرتا ہے... ایک چھوٹی ہوئی اسٹل لائف، جس میں چاروں طرف جنگلی پودوں کی گندھ پھیلی ہے۔ ہم تینوں پیڑوں سے گھری پگڈنڈی پر چل رہے تھے۔ میں ٹارچ لیے آگے آگے، سڑک کے کنارے پر، وہ دونوں میرے پیچھے، روشنی کے چکتے میں اپنی چھایاؤں کے ساتھ۔ کبھی کبھی کوئی پنچھی جھاڑی سے نکل کر ہمارے اوپر سے نکل جاتا، اور اس کے پنکھوں کی کالی، گرم آہٹ ہمارے چہروں کو چھو کر دوسری طرف نکل جاتی تھی۔

سڑک کے کنارے لوہے کی ریلنگ لگی تھی جس پر چھوٹے وقفوں میں پتھر کی چوکیاں لگی تھیں... وہیں اماں جی کبھی سانس لینے کے لیے بیٹھ جاتی تھیں۔ جب تک وہ آرام کرتیں، میں اور تیا پگڈنڈی کے کنارے کھڑے ہو کر نیچے دیکھنے لگتے... لوہے کے کھمبوں کے بیچ، جہاں ٹھیک نیچے کی گھاٹی میں گاؤں کے گھر دکھائی دیتے، جن کی روشنیاں اتنی ہی خاموش اور ٹھہری ہوئی دکھائی دیتیں جتنے اوپر آکاش کے تارے...

”سنو“

اماں جی کی آواز سنائی دی۔ وہ میرے لیے نہیں تھی۔ جسے اماں جی نے بلایا تھا، وہ تیز قدموں سے وہاں چلی آئی جہاں اماں جی پتھر کی چوکی پر بیٹھی تھیں۔ تیا پاس آئیں تو اماں جی نے ان کا ہاتھ کھینچ کر اپنے پاس بٹھا لیا۔ وہ دھیمی آواز میں ان سے کچھ کہہ رہی تھیں۔ مجھے صرف کچھ سنائی دیا، ان کے شبد نہیں، جو مجھ تک آتے آتے جنگل کی دوسری بے شمار آوازوں کی طرح ہی پھسپھساہٹ میں گھل جاتے تھے... جب کچھ دیر تک بات چیت نہیں ہوئی تو میں ڈر سا گیا، دھیرے سے ان کے پاس گیا... لیکن، تیا نے اپنا سر اماں جی کی گود میں چھپا رکھا تھا اور اماں جی اپنی بوڑھی، دھندلی آنکھوں سے اندھیرے میں تاک رہی تھیں۔ آواز اب بھی آ رہی تھی، لیکن اماں جی کی نہیں، وہ اب ان سے الگ ہو کر ایک ڈراؤنی بازگشت بن کر جنگل کے سناٹے پر منڈلا رہی تھی۔

Scanned with CamScanner

دیر تک کوئی کچھ نہیں بولا... ہمیں دھیان تب آیا جب پھاٹک کے پاس پہنچ کر پسی کی جھنکتی ررریاتی سی آواز سنائی دی۔ ماتمن کے پاس پہنچنے سے پہلے ہی، ان کی آہٹ کی گندھ اس تک پاس پہنچ گئی تھی۔ بند پھاٹک کے پیچھے کھڑا وہ نہ جانے کب سے اناجی کے انتظار میں کھڑا تھا۔ اناجی نے ہمیشہ کی طرح میرے گالوں کو چوما، اور پھر تیا کو اپنی بانہوں میں لپیٹ کر کچھ دیر کھڑی رہیں... پھر پھاٹک کھولا، ہماری طرف ایسے دیکھا جیسے ہم اندھیرے بیابان میں کھوئے دو افراد ہوں... "تم اب جاؤ، میں اب چلی جاؤں گی!"

انھوں نے کہا اور وہ کھڑی رہیں۔ ہم نے سنا اور ہم بھی کھڑے رہے۔ کچھ دیر تک پسی کی بے صبری کی چیخوں کے علاوہ کچھ بھی سنائی نہیں دیتا تھا۔ پھر وہ مڑ گئیں اور ہم نیچے اترنے لگے۔

چپ چاپ چلتے رہے۔ بیابان میں آکاش کے تارے اور بھی زیادہ چمکیلے دکھائی دے رہے تھے۔ پیروں کے نیچے سوکھے پتوں کی چرمراہٹ کے علاوہ کچھ بھی سنائی نہیں دیتا تھا۔ بیچ راستے میں کہیں ان کی دیہہ کا کوئی انگ مجھے چھو جاتا، صرف کپڑوں کی اڑتی ہوئی چھوٹی موٹی پھٹپھٹاہٹ، اور تب مجھے لگتا... یہ وہ ہیں جو میرے ساتھ چل رہی ہیں، اور اس سمے مجھے اپنے بیتے ہوئے جیون کے چالیس سال یاد آجاتے تھے جو کسی میلے جانور کے رووں سے اچانک کسی آہٹ کو سن کر چونک کے کھڑے ہو جاتے ہیں، مجھے جتاتے ہوئے... جیسے آسمان کے تارے میرے ساتھ چل رہے ہیں، وہ بھی میرے ساتھ چل رہے ہیں اور چلتے چلتے مجھ سے ایک قدم آگے بڑھ جاتے ہیں... مستقبل کے اندھیرے گڑھے کو پار کرتے ہوئے، ایک دوسرے مستقبل میں پاؤں رکھتے ہوئے... جہاں وہ اپنی ٹارچ کی روشنی میں چل رہی ہیں، روشنی کے اس دھبے میں گھستے ہوئے جو ان کے پیروں کے آگے ہے... کیا موت بھی اس طرح چپ چاپ ہم سے چھٹک کر کہیں اور چلا جاتا ہے، جس کا پتا بہت بعد میں چلتا ہے؟

پر اس رات نہیں۔ اس رات میں یہ بھی بھول گیا کہ وہ میرے ساتھ چل رہی تھیں۔ مجھے تب پتا چلا جب وہ میری کوٹھری کے آگے کھڑی ہو گئیں۔

اچانک میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ انھوں نے اپنی ٹارچ میرے چہرے پر اٹھائی تھی۔

Scanned with CamScanner

"آپ کو کیا ہو گیا ہے؟"

وہ میرے پاس آئیں... مجھے ایسے دیکھنے لگیں جیسے اندھیرے میں کسی پریت کو دیکھ لیا ہے... کاش میں ان کی آنکھوں سے اپنے کو دیکھ سکتا...

"مجھے معاف کیجیے... پتا نہیں، مجھے کیا ہو گیا تھا۔" ان کی آواز بالکل شانت تھی۔

میں تذبذب میں انھیں دیکھتا رہا۔

"چلیے، اگر آپ کو دیر نہ ہو رہی ہو تو تھوڑی سیر کر آتے ہیں۔"

انھوں نے ٹارچ بند کر دی۔ ہم گھر کی طرف نہ مڑ کر سیدھے تاروں کی مہین پیلی روشنی میں چلنے لگے۔ میرے بھیتر کچھ دیر پہلے جو بونڈر سا اٹھا تھا، وہ دھیرے دھیرے بیٹھنے لگا۔ صرف ایک سن سناتا سا بھیتر رہ گیا، جہاں مجھے اپنے پیروں کی آواز بھی ڈراتی تھی۔

جب ہم کسی دوسرے کے ماضی میں جھانکتے ہیں تو کوئی دوسرا ہی چہرہ دکھائی دیتا ہے... کون سی تیا میرے ساتھ چل رہی تھیں؟ جو باتیں کرتے ہوئے میرے آگے آگے جھرنے میں پانی لینے جایا کرتی تھیں؟... یا وہ جو کچھ دیر پہلے اماجی اور مہرا صاحب کے سامنے بے قابو ہو کر چیخ رہی تھیں؟... سب کچھ بھول کر ایک دوسرے ماضی میں چلی گئی تھیں جس کے بارے میں سب چپ رہتے تھے، اور مجھے کچھ بھی معلوم نہیں تھا... یا وہ جو اب میرے ساتھ تھیں، اپنے میں ڈوبی ہوئی، تاروں کی چھایا میں دھیان میں مگن؟

ہم کچھ دور تک چپ چاپ چلتے رہے۔ اچانک وہ ٹھہر گئیں... میری اور دیکھا۔ وہ میرے سامنے مسکرا رہی تھیں... ایسی مسکراہٹ جو ڈرا سا دیتی ہے۔

"آپ تو بہت تھکے جان پڑتے ہیں... چلیے، کچھ دیر کے لیے یہاں بیٹھ جاتے ہیں۔"

سڑک کے کنارے ایک بنچ تھی... لیمپ پوسٹ کے نیچے۔ انھوں نے دھیرے سے میری کہنی کو چھوا... اور بنچ کے کنارے بیٹھ گئیں۔

سامنے کسی پرانے کانونٹ اسکول کا میدان تھا۔ بیچ میں بچوں کے کھیلنے کے جھولے لگے تھے، نیچے پھسلنے کی کاٹھ کی پٹریاں... میری گو راؤنڈ کا پہیہ، بیڈمنٹن کا جال جو ہوا میں دھیرے دھیرے ڈول رہا تھا۔

Scanned with CamScanner

''کیا سوچ رہے ہیں؟''

''آپ جب اپنی ماں کی بات کرتی ہیں تو مجھے ہمیشہ دیوا جی کی یاد آتی ہے... مجھے وشواس نہیں ہوتا کہ ان کے علاوہ کسی اور کا آپ سے کوئی رشتہ بھی تھا۔ انھوں نے کبھی اس بارے میں نہیں کہا۔''

وہ کچھ دیر چپ رہیں۔ پھر اڑتی ہوئی دھند کو دیکھتے ہوئے کہا، ''رشتے ہوتے نہیں، بنتے ہیں .. جب تک ٹس نہیں اٹھتی، پتا نہیں چلتا وہ کتنے پک گئے ہیں... اتنے برس بیت گئے، مجھے معلوم بھی نہیں، وہ کہاں ہیں...''

میں نے حیرانی سے انھیں دیکھا۔

''آپ نے ان کی کوئی خبر نہیں لی؟''

''میں تب بہت چھوٹی تھی جب وہ مجھے یہاں چھوڑ گئی تھیں۔ کچھ بھی بتا کر نہیں گئیں، وہ کہاں جا رہی ہیں۔''

''مہرا صاحب سے بھی نہیں؟''

''وہ ان سے بہت پہلے الگ ہو گئی تھیں... جب سے وہ دیوا کے ساتھ رہنے لگے تھے۔''

ایک عجیب سی ہنسی ان کے چہرے پر چلی آئی۔ ''آج بھی جب میں گاؤں کی سرکاری ڈسپنسریوں میں دوائیاں بانٹنے جاتی ہوں تو سوچتی ہوں، وہ کہیں دکھائی دے جائیں۔''

کچھ دیر ہم اڑتی ہوئی دھند کے پیچھے پہاڑیوں پر سرکتی ہوئی بتیوں کو دیکھتے رہے۔

''دیوا کو سب معلوم تھا؟''

''معلوم نہیں ہوگا؟ پر وہ کیا کر سکتی تھیں... مجھے لگتا ہے، وہ جو بھید دبا کر رکھتی تھیں، وہی کینسر کے پھوڑے کی طرح ان کے بھیتر پک آیا تھا! مجھے نہیں معلوم وہ کیا چاہتی تھیں۔''

''آپ کو...'' میں نے ان کی اور دیکھا۔ ''آپ کو نہیں معلوم؟''

وہ بنچ پر ایک سفید مورتی کی طرح خاموش بیٹھی تھیں — آدھے دھند لکے، آدھی چاندنی میں۔ ایک عجیب سی مسکراہٹ ان کے چہرے پر چلی آئی تھی۔

''آپ کو کیسے معلوم؟''

''مجھ سے جب آپ کے بارے میں بات کرتی تھیں تو لگتا تھا، کسی بہت نازک چیز کے

Scanned with CamScanner

بارے میں کہہ رہی ہوں... بہت سنبھال کر، جیسے انھیں ڈر ہو کہ وہ کبھی بھی ٹوٹ سکتی ہے!"

وہ تھوڑی دیر چپ بیٹھی رہیں، پھر کہا، "مجھ پر وشواس نہیں کرتی تھیں۔ انھیں میرے بارے میں بہت ڈر لگا رہتا تھا۔"

"کیسا ڈر؟"

انھوں نے بہت آہستہ سے بینچ پر پڑے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

"جب آپ کسی کو بہت چاہنے لگتے ہیں... ویسا ڈر۔"

ان کے ٹھنڈے ہاتھ کے نیچے میرا ہاتھ نرم سا پڑا رہا۔

"مہرا صاحب بھی تو آپ سے بہت ڈرتے ہیں،" میں نے کہا۔

"وہ دوسرا ڈر ہے... اس سے میں ڈرتی ہوں،" وہ ہنسنے لگیں۔ "تبھی تو میں یہاں زیادہ دن رہ نہیں سکتی!" ان کے لہجے میں ایک نئی تلخی سی آ گئی تھی، جیسی کسی کے جھروکے سے باہر جھانکتی ہوئی۔ "لیکن اب آپ یہاں ہیں تو مجھے پہلے جیسی بے چینی نہیں ہوتی۔"

میرے بھیتر ایک ہول سا اٹھنے لگا۔

"آپ کی بیٹیوں سے سنتا ہے؟ جب سے وہ نہیں رہیں، میں اپنے کو غلط جگہ پر پاتا ہوں... کبھی تو مجھے سمجھ میں نہیں آتا میں یہاں کیا کر رہا ہوں؟"

وہ چپ بیٹھی رہیں... صرف اپنا ہاتھ میرے ہاتھ سے الگ کر دیا۔ ان کی چپ مجھے چبھنے لگی۔ میں نے کچھ غلط کہہ دیا تھا اور میں اب اپنے شبدوں کو واپس نہیں لے سکتا تھا۔ آدمی جب اپنے جیون میں بے یقین ہوتا ہے تو دوسروں کو اسی طرح ٹھیس پہنچاتا ہے۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ اب وہ نہیں رہیں تو آپ کہیں بھی جا سکتے ہیں،" انھوں نے کہا۔ "لیکن انھوں نے آپ کو جس کے لیے بلایا تھا، وہ تو اب بھی ہیں۔ کیا آپ ان کو چھوڑ کر جا سکتے ہیں؟"

جب میں نے کچھ نہیں کہا تو وہ ہٹیں نہیں۔ میرے چہرے کو اپنی طرف موڑ لیا۔

"آپ سوچتے ہیں، میں آپ کو بلیک میل کر رہی ہوں؟"

ان کی آنکھوں میں وہ تناؤ نہیں تھا جو کچھ دیر پہلے ان کی چپ کے ساتھ آیا تھا، پر اپنے پیچھے ایک لکیر چھوڑ گیا، جو اب تک میں بھیتر محسوس کر رہا تھا۔

Scanned with CamScanner

"سچ بتائیے، کیا آپ کو سچ مچ یہاں رہنا کھلنے لگا ہے؟"

"نہیں، یہاں رہنا نہیں... اپنا کہیں بھی رہنا... اس لیے میں اپنے کو دلاسا دیتا ہوں کہ میں کہیں بھی جاؤں گا تو بھی میرے ساتھ ایسا ہی ہوگا۔"

"آپ کو کوئی بھی فرق محسوس نہیں ہوگا؟"

"یہ تو یہاں سے جانے کے بعد پتا چلے گا،" میں نے ٹالتے ہوئے کچھ ہنسی میں کہا، لیکن مجھے معلوم تھا ہنسی وہاں نہیں ہے۔

وہ بھی شاید یہی جاننے کے لیے مجھے دیکھ رہی تھیں۔

"کچھ بھی نہیں؟" یہ ان کی آواز تھی یا صرف کہے ہوئے اکشر، جو منھ سے نکلتے ہی مر جاتے ہیں۔

"آپ نے کچھ کہا؟"

وہ بنچ سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ "چلیے، گھر لوٹتے ہیں۔ بہت دیر ہو گئی!"

ہم گھر کی طرف مڑ گئے۔ میرے اندر، بالکل پیٹ کے کھوکھل میں... کھوکھل کے بھیتر کسی گڑھے میں ایک عجیب سی دھکدھکی ہو رہی تھی، جسے میں نے پہلی بار سنا تھا — کیا سچ مچ چاہنے کا ڈر دیہہ کو بسنت کے کنوارے پتے کی طرح ہلاتا ہے، جب اس پر سب رنگ ایک ساتھ چٹخنے لگتے ہیں؟ ڈر کے بھیتر سے اگتا پھول، جسے میں نے اپنی اتنی خالی، سونی زندگی کے ریگستان میں اگتے ہوئے دیکھا تھا... کیا وہ رات کی اڑتی دھند میں اسے کہیں دیکھ پا رہی تھیں؟ وہ اپنے دھیان میں مگن چلی جا رہی تھیں۔

دوسرے دن کی صبح بالکل شانت رہی۔ بالٹیوں کی کھنکناہٹ نے مجھے کمرے کی چوکھٹ تک آنے کے لیے بے بس نہیں کیا۔ بارش ہونے کی وجہ سے سب گھروں کے پمپ اور نلکے کسی پرانی نیند سے جاگ کر اچانک گڑگڑ کرنے لگے تھے۔ میں بستر پر لیٹا دیر تک ان کی آواز سنتا رہا۔ پھر مجھے لگا کہ کوئی ایک اور آواز ہے جو بھیتر غسلخانے سے نہیں، کہیں باہر کی چوکھٹ سے آ رہی ہے۔ جلدی سے کپڑے پہنے اور باہر برآمدے میں چلا آیا۔

کوئی بہت دبے، دھیمے ہاتھوں سے دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔

میں نے دروازہ کھولا تو دہلیز پر سرلی دھر دکھائی دیا۔ سمجھا، اور دنوں کی طرح وہ اب بھی مجھے

Scanned with CamScanner

جھرنے پر جانے کے لیے بلانے آیا ہے۔

’’آج کہیں جانا نہیں ہوگا مرلی دھر!‘‘ میں نے ہنس کر کہا۔ ’’دیکھ نہیں، آج کتنا پانی آ رہا ہے!‘‘

’’جی، مجھے معلوم ہے۔‘‘

وہ چپ میری طرف دیکھتا کھڑا رہا۔

’’کیا بات ہے مرلی دھر؟‘‘

اس نے اپنی قمیض کی جیب سے ایک تڑا مڑا کاغذ میرے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ ’’یہ چھوٹی بی بی نے دیا ہے۔‘‘

’’کیا ہے یہ؟‘‘ میں نے اس کی اور دیکھا۔

’’دیکھ لیجیے۔ جانے سے پہلے وہ مجھے یہ آپ کے لیے دے گئی تھیں۔‘‘

’’جانے سے پہلے... کہاں؟‘‘

’’وہ آج صبح کی بس سے چلی گئیں۔ میں ابھی انھیں بس اسٹینڈ پر چھوڑ کر آ رہا ہوں۔‘‘

میں کاغذ کے پرزے کو ہاتھ میں لیے کھڑا رہا۔

کچھ دیر کے بعد جب کمرے میں لوٹ کر اسے کھولا تو تین چار سطروں کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیا، جیسے ان کے جانے کی خبر کمرے میں آتی روشنی کو بیچ راستے میں روک کر کھڑی ہو۔ جلدی میں گھسیٹے شبدوں کے پیچھے ان کی آواز سنائی دی، جیسے اپنی لکھی چٹھی خود پڑھ کر سنا رہی ہوں...

’’آج پانی آ رہا ہے۔ جانے کے لیے یہ اچھا دن ہے۔ مجھے آپ کو صبح اٹھانے نہیں آنا ہوگا۔ معلوم نہیں تھا، یہ دن ایسے بیتیں گے۔ مجھے آپ پر بھروسا ہے کہ جب میری ضرورت پڑے گی، آپ مجھے بلا بھیجیں گے۔ آشا ہے، ضرورت جلدی نہیں پڑے گی۔ تارا دیوی سے معافی مانگ لیجیے گا... اگلی بار ضرور ان سے ملنے جائیں گے۔‘‘

آگے کچھ اور نہیں تھا... سوا تیا کے۔ کیا یہ ان کا نام ہو سکتا ہے جن کے ساتھ پچھلی رات چلتے ہوئے میں نے اپنے بدن پر وہ بھید بھری آہٹ سنی تھی؟

میں باہر نکل آیا... دوپہر کی مدھم دھوپ کورٹ پر پھیلی تھی۔ دیودار کے پیڑ کسی پرانی پیلی دھوپ کے خواب میں کھڑے دکھائی دیتے تھے۔ نیچے نالے کی کلکل سنائی دے رہی تھی... کوئی اور دن ہوتا تو

Scanned with CamScanner

ہماری بازسیدنا برتن کھنکھناتے ہوئے ایک لائن میں چلتی دکھائی دیتی... لیکن اب وہ پگڈنڈی بارش کے پانی میں کہیں کھو گئی تھی... وہاں صرف دھوئیں کے بادل تھے، جھرنے کے کھوکھل سے اوپر آکاش کی اور اڑتے ہوئے...

کچی روشنی میں بھیگا ہوا دن... جب کوئی اپنا شہر چھوڑ کر چلا جاتا ہے تو موسم پہلے جیسا نہیں رہتا، ایک اجاڑ سا رستا رہتا ہے... میں چلتا چلتا رک جاتا، جیسے کوئی پیچھے آرہا ہے۔ پیچھے مڑ کر دیکھتا تو جانی پہچانی عمارتیں مجھے اپنے پیچھے آتی دکھائی دیتیں... میں رک جاتا تو وہ بھی رک جاتیں، اپنی کھڑکیوں کے پاس سے مجھے گھورتی۔ پھر اچانک وہ اڑتی ہوئی دھند میں گم ہو جاتیں... صرف پردہ سا ہلتا رہتا، باقی شہر کو مجھ سے بانٹتا ہوا، دھوپ اور ہوا میں ہلتا ہوا۔

مجھے تعجب ہوتا، یہ وہی شہر ہے جہاں میں تین سال پہلے آیا تھا۔ اس کا میری پچھلی زندگی سے کوئی واسطہ نہیں تھا — یہ اتنا ہی تھا جتنا جسم کا پہنے ہوئے کپڑوں سے ہوتا تھا، کبھی مجھے ڈھکتا ہوا، کبھی الگ الگ پوٹلی میں رکھتا ہوا۔ پرانے دنوں کے کپڑے میری عمر پر گھستے ہوئے تار تار ہوتے جاتے تھے... جیسے میں ایک ہی جگہ کھڑا ہوں اور وہ بوڑھے ہوتے جاتے ہیں، دھیرے دھیرے میری دیہہ کو کفن میں بدلتے ہوئے، جس طرح جلی ہوئی گڑیا کی راکھ خود گڑیا کی شکل میں بدلتی جاتی ہے، دیکھو تو پوری ثابت، ہاتھ لگاؤ تو بھربھرا کر جھرتی ہوئی...

پاؤں رکے تو آنکھیں اوپر اٹھیں... دیکھا، میں سمٹری کے ادھ کھلے پھاٹک کے آگے کھڑا تھا۔ میرے پیر کسی پالتو کتے کی طرح کسی پرانی یاد کو سونگھتے ہوئے مجھے یہاں لے آئے تھے۔ پرانی کاٹھ کا پھاٹک، گھن کھایا ہوا، ادھ بھرا اکھلا سا پانی میں بھیگا کھڑا تھا۔ اسے کھولنا بھی نہیں پڑا، چھوتے ہی وہ پیچھے کی طرف لڑھک گیا۔ سامنے اٹھے ہوئے چوکور پتھر دکھائی دیے جن پر گھاس کے تنکوں نے اپنے گھر بنالیے تھے... دور سے پتا نہیں چلتا تھا، کس پتھر کے پیچھے کون دبا ہے... کن کے نام کون سے کتبوں پر کھدے ہیں، کن ناموں کے پیچھے کون سے چہرے چھپے ہیں...

چڑ کی پیلی، کچی سوئیاں ہوا میں بہتے ہوئے ایک قبر سے دوسری تک اڑتی جاتی تھیں۔ میں کچھ دیر تک وہیں کسی انام پتھر کے اوپر اگی گھاس پر بیٹھا رہا، شہر کو سنتا رہا۔ وہ کسی پاتال لوک سے اٹھتا ہوا اوپر آرہا تھا۔ قبروں کے اوپر چلغوزے کے گھنے چکیلے پتوں کی چھوٹی بڑی چھتیں ڈول رہی

Scanned with CamScanner

تھیں۔ یہیں کہیں ان کی قبر ہوگی۔ کچھ سال پہلے میں ان کے پیچھے کھڑا تھا۔ وہ مجھے دیکھتیں تو وہی حیرت بھری ہنسی دکھائی دے جاتی جو پہلے دن دکھائی دی تھی۔۔۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر پوچھتیں، ''تم اب تک یہاں ہو؟'' اور میں کہتا، ''مسز مہرا، آپ کو چلے جانا تھا تو مجھے یہاں کیوں بلایا تھا؟'' اور تب مجھے لگا، باہر جو قبریں دکھائی دیتی ہیں وہ ہمارے بھیتر کے مُردے ہیں۔ ہم جیون بھر ان کے بولنے کے انتظار میں ادھر سے اُدھر بھٹکتے رہتے ہیں، بنا یہ جانے کہ وہ اپنے جواب پہلے ہی ہمارے پاس چھوڑ گئے ہیں۔

دھیرے دھیرے دھوپ مند پڑنے لگی۔ آکاش پر بادل گھرنے لگے۔ صرف ہوا چلتی تھی، اونچی نیچی قبروں پر اگی گھاس اور پھول اور پتے پھرپھرا رہے تھے۔

میں جب گھر کی طرف جانے لگا تو وشواس نہیں ہوا کہ تیا وہاں نہیں ہوں گی۔ آج کوئی مہرا صاحب کے ساتھ ٹہلتا ہوا میری کوٹھری کے آگے سے نہیں گزرے گا، صبح بالٹیاں کھنکناتا ہوا مجھے نہیں جگائے گا۔

میں کاٹیج کے سامنے ویسا ہی جذبے سے خالی کھڑا رہا جیسے دوپہر کی گھڑی میں سمٹری کے گیٹ کے آگے کھڑا تھا۔

❀❀❀

2

2.1

کھڑکی سے آتی ہوئی روشنی میں اس کی چھایا دکھائی دی، باہر ٹھٹکی ہوئی۔ اس گھڑی کون آسکتا ہے؟ آیا ہے تو بھیتر آنے سے کیوں ڈرتا ہے؟ باہر کیوں کھڑا ہے؟ وہ بستر سے اٹھتے ہیں، دبے قدموں سے کھڑکی کے پاس جاتے ہیں اور چٹاک سے اس کے پلّے کھینچ دیتے ہیں... کوئی نہیں؟ یا کوئی تھا اور کھڑکی کھلتے ہی بھاگ گیا؟ ایک ہلکی سی گھرگھراہٹ ان کی چھاتی میں اٹھتی ہے، جیسے کہیں کھوکھل میں پھنسا جانور غرّا رہا ہو۔ وہ اسے سنتے رہتے ہیں۔ کیا یہ لہو کی آواز ہے جو جسم کے بیہڑ اندھیرے میں دوڑ

رہا ہے، رگوں میں دھڑکتا ہوا، دھدھکتا ہوا؟

"خون... کیسا خون؟" ڈاکٹر سنگھ ان سے پوچھتے ہیں... "کیا سنائی دیتا ہے آپ کو؟ جانوروں کی غراہٹ، جھاڑیوں میں پھنسے پرندوں کی پھڑپھڑاہٹ؟ آپ کی دیہہ ہے یا جنگل کی سینگچوری؟ کچھ تو بولیے، میری بات کا جواب کیوں نہیں دیتے؟ اگر کچھ نہیں بولنا تو مجھے بلاتے کیوں ہیں؟"

وہ بے بس، بیچاری آنکھوں سے انھیں دیکھتے رہتے ہیں۔ کیا جواب دیں؟ انھیں یاد بھی نہیں آتا، انھوں نے ڈاکٹر سنگھ کو کب بلایا تھا؟ ہو سکتا ہے مرلی دھران سے کہنے گیا ہو... یا گورنر بابو... کلب میں گئے ہوں گے، وہیں ڈاکٹر سنگھ کے ساتھ بیئر پیتے ہوئے کچھ میرے بارے میں بک دیا ہوگا... آج رات آئیں گے تو پوچھوں گا! کتنی بار کہا ہے، مجھے الگ چھوڑ دیجیے، مجھ پر مہربانی کیجیے... لیو می الون، پلیز، پلیز...

"آپ کچھ کہہ رہے ہیں؟" ڈاکٹر سنگھ ان کے پاس جھک آئے۔ "کوئی تکلیف ہے تو بتائیے، اس طرح بڑبڑائیے نہیں۔"

دیہہ میں کیسی تکلیف، ڈاکٹر سنگھ؟ دیہہ اپنے میں تکلیف ہے... اٹھتا ہوں تو وہ بھی اٹھنے لگتی ہے، چلتا ہوں تو میرے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ اس کی آنکھ بچا کر کہیں چھپ جاؤں، پھر دیکھوں، کیسے میرا سراغ پاتی ہے... کوئی اپنی دیہہ کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اس سے بچ سکتا ہے؟ کیسے پیچھا چھڑا سکتے ہیں اس سے، جو جنم سے آپ کے ساتھ جڑی ہے؟... تبھی تو ہم پیدا ہوتے ہی روتے ہیں۔ کبھی آپ نے اپنے کو باہر سے دیکھا ہے؟ جیسے میں بستر پر بھی لیٹا ہوں اور اپنے کو کھڑکی سے بھی دیکھ رہا ہوں۔ میں بستر سے اٹھ کر اسے دیکھنے جاتا ہوں جو کھڑکی پر کھڑا مجھے بستر پر لیٹا دیکھ رہا ہے... ہم ایک ساتھ دو میں بٹ جاتے ہیں۔ ایک میں جو وہ ہے، ایک وہ جو میں ہوں... دو ہی میں کیوں، کاٹنے لگو تو ہم کتنوں میں بٹ جاتے ہیں۔ بچپن میں ہم پہاڑی جونک کو کسی ٹہنی سے کاٹتے جاتے تھے... اور اس کا ہر کٹا ہوا حصہ دوبارہ سے چلنے لگتا تھا، ایک زندہ، چلتا پھرتا جیو... پتا بھی چلانا مشکل ہو جاتا تھا کہ اتنے کلبلاتے حصوں میں اس کی اصلی دیہہ کون سی تھی... آدمی کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوتا ہے، لیکن بالکل الٹے ڈھنگ سے... آدمی کی دیہہ ایک جیسی رہتی ہے... لیکن وہ خود اپنے میں کٹتا جاتا ہے۔ کٹ کٹ کر بٹتا جاتا ہے، لیکن اوپر سے بالکل ثابت دکھائی دیتا ہے، وہی ایک ماتھا،

دو کان، ایک ناک، دو آنکھیں... آنکھوں کا رنگ بھی بچپن سے بڑھاپے تک ایک جیسا ہی رہتا ہے۔ بھوری آنکھیں نیلی نہیں ہوتیں، لیکن دیکھنے کی نگاہ... کیا وہ ایک جیسی ہی رہتی ہے؟ آپ ہی بتایئے، کتنے اچرج کی بات ہے کہ آنکھیں ایک جیسی رہتی ہیں اور مدت بعد اچانک آپ کو لگتا ہے کہ وہ بدل گئی ہیں۔ جو رشتے آپ نے پرانی نگاہ کے اجالے میں بنائے تھے، وہ اندھیرے میں چلے جاتے ہیں، جیسے وہ تھے ہی نہیں، آنکھوں کا دھوکا تھے، من کا بھرم، دھول، راکھ، مٹی... آپ میری بات سمجھتے ہیں؟

روشنی نیچے چلی جاتی ہے: نومبر کی دھوپ پہاڑوں کی پیٹھ کو سہلاتی پھسلتی جاتی ہے۔ ہوا کے ساتھ چیزوں کی تیکھی، نشیلی گندھ بھیتر آتی ہے۔ کچھ جل رہا ہے؟ وہ آنکھیں کھولتے ہیں... نیلے دھوئیں کی لپٹ بھیتر آتی ہے۔ نہیں، کچھ نہیں... صرف جنسی دھر نے باغ میں پتوں کی ہولی جلائی ہے... سوکھے کرارے پتے کٹ کٹ کرتے ہوئے، پٹاخوں میں چٹکتے ہوئے، لپٹوں میں لپٹے ہوئے ہوا میں بھٹکتے ہیں، جن کے اوپر اتنا دھواں دکھائی دیتا ہے... نیلے سانپ سا ہوا میں لہراتا ہوا... لیکن لپٹیں بس، صرف آگ کی گول آکار چمک دکھائی دیتی ہے، جیسے ڈوبتے سورج کے پیچھے کوئی دوسرا سورج اگ رہا ہے، اوپر اٹھ رہا ہے۔ پتا نہیں چلتا، گھڑی کی سوئیاں کہاں بھاگے جا رہی ہیں... کیا صبح کا اندھیرا روشنی میں بدل رہا ہے، یا شام کا اجالا رات کی دہلیز پر کھڑا ہے؟ یا سکڑتے سمے کے اسکرین پر دونوں سورج ایک ساتھ چمک رہے ہیں؟

مہرا صاحب کچھ بھی نہیں سمجھ پاتے۔ لگتا ہے، جو اب تک سے تھا، ایک بیساکھی جس کے سہارے اتنی چڑھائی پار کی تھی، اب نیچے جھانک کر دیکھتے ہیں تو اپنی کمائی نہیں، دوسروں کے کشٹ دکھائی دیتے ہیں... ہر کشٹ جیسے پتھر ہو، جس پر پاؤں رکھتے ہی کوئی چیخ سنائی دیتی ہے... اور وہ جلدی سے پیر اٹھا لیتے ہیں... کیا فائدہ ہے اپنے پیروں کے نشانوں پر دوبارہ چلنے کا؟ کتنا عجیب ہے، جو راستہ مجھے یہاں تک لایا تھا، وہ مجھے اپنے سے اتنا دور لے گیا ہے کہ وہاں خود میں اپنے کو نہیں ڈھونڈ پاتا۔

تبھی تو رسی کھینچ کر گھنٹی بجاتے ہیں... اور جب مرلی دھر ہانپتا ہوا سامنے آتا ہے تو پوچھتے ہیں، "یہ آگ کہاں جل رہی ہے؟" اور جب وہ انھیں بتانے لگتا ہے تو سنتے بھی نہیں وہ کیا کہہ رہا ہے۔ کچھ دیر بعد جب وہ چپ ہو جاتا ہے تو انھیں پتا چلتا ہے کہ وہ اب بھی کھڑا ہے، جیسے وہ بولتے ہوئے غائب ہو گیا تھا اور چپ ہوتے ہی پھر سامنے دکھائی دے گیا ہے...

Scanned with CamScanner

"ڈاکٹر سنگھ گئے؟" انھوں نے پوچھا۔

"جی، کب کے..." مرلی دھر منھ کھولے کھڑا انھیں دیکھتا رہا۔ "آپ کو نہیں معلوم؟"

"لیکن ابھی تو یہاں تھے...؟"

"جی، انھیں گئے تو دو گھنٹے ہو گئے۔ آپ شاید سو گئے تھے؟"

"گورز بابو؟"

"وہ بازار گئے ہیں... ڈاکٹر صاحب نے کچھ لکھ کر دیا تھا، اسی کی دوا لینے۔ جیسے ہی آئیں گے، سیدھا آپ کے پاس بھجوا دوں گا۔ آپ کو ابھی کچھ چاہیے؟"

"نہیں، کچھ بھی نہیں... بس میرا سرھانا تھوڑا اونچا کر دو۔"

وہ بستر کے پاس آیا تو مہرا صاحب نے اپنے کپڑوں کی اس پرانی، سیلی گندھ کو ٹرنت بھانپ لیا جو بیڑی کے دھویں اور جلتی ہوئی لکڑیوں سے آتی تھی۔ کتنی پرانی گندھ تھی وہ جو سردیاں شروع ہوتے ہی چھپے کونوں سے نکل کر آؤٹ ہاؤس کے تنگ، اندھیرے کمروں اور وہاں رہنے والے نوکروں کے گودڑ کپڑوں کی سلوٹوں میں سمٹ آتی تھی... پرانے دنوں کی گرم اور پراچین مہک... جس کے گھیرے میں آ کر وہ اپنے کو حفاظت میں محسوس کرتے تھے، جیسے وہاں کوئی ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکے گا... موت بھی نہیں...

"آپ ٹھیک ہیں، صاحب جی؟" مرلی دھر نے ان کے سرھانے کو تھوڑا اونچا کر کے ان کے سر کو تکیے پر ٹکا دیا۔ اب وہ سیدھی کھڑکی کے پار چیڑوں کی قطار دیکھ سکتے تھے، پہاڑ کے ماتھے پر ایک کالی بھوں سی کھنچ آئی تھی، ڈوبتے سورج کی سرخی میں سلگتی ہوئی...

"ڈیوا، اب کیا یہ میری باری ہے؟"

"کیا کہہ رہے ہیں، صاحب جی؟" مرلی دھر تکیے پر جھک آیا۔ "کس کی باری کی بات کر رہے ہیں؟"

انھوں نے آنکھیں کھولیں تو چیڑوں کی قطار کہیں نہ تھی... مرلی دھر کا گھبرایا سا چہرہ تکیے کے اوپر جھانک رہا تھا۔

"میں نے سوچا تم چلے گئے، مرلی دھر۔"

"آپ کچھ کہہ رہے تھے؟"

"نہیں تو..."

"آپ بی بی جی کو بلا رہے تھے۔"

وہ ہنسنے لگے، لیکن کوئی آواز اوپر نہیں آئی، صرف چھاتی اوپر نیچے ہوتی رہی اور آخر جب تھک کر ٹھہر گئی تو تھوک کی ایک لکیر منھ کے کور سے بہتی ہوئی تکیے پر چلی آئی، جسے مرلی دھر نے جلدی سے ان کے رومال سے پونچھ دیا جو تکیے کے نیچے دبا تھا۔ وہ وہیں فرش پر اکڑوں بیٹھ گیا، تاکہ اگلی بار کھانسی کا دورہ آئے تو وہ موجود رہے۔ پر اب شاید اس کی ضرورت نہیں تھی۔ اب وہ آنکھیں موندے ساکت لیٹے تھے — ساکت... لیکن خاموش نہیں۔ چہرے پر ایک عجیب سی بے چینی تھی، جیسے بھیتر کی کوئی چیز باہر آنے کے لیے مچل رہی ہو، راستہ نہ پا رہی ہو، بیابان میں بھٹک رہی ہو...

مرلی دھر ان کے چہرے کو دیکھ کر سوچنے لگا، پتا نہیں ان کے بھیتر کیا پل رہا ہے، پھوڑے کی طرح، جو نہ دبتا ہے نہ پھوٹ کر باہر آتا ہے۔ ایسے لمحوں میں لگتا ہے کہ چٹھی لکھ کر بٹیا کو بلوا بھیجے، لیکن ہر بار ہمت چھوٹ جاتی ہے۔ اس نے آج تک کوئی کام صاحب جی سے چھپا کر نہیں کیا تھا... اور اب آخری بار، جب وہ بستر پر اس طرح بے بس لیٹے ہیں، وہ ان کے ساتھ دھوکا کرے گا؟ وہ اسے معاف کر بھی دیں، اپنے کو وہ کبھی معاف نہیں کر سکے گا۔

"مرلی دھر؟" اچانک بستر سے ان کی آواز سنائی دی۔ "تم ابھی گئے نہیں؟"

"جی، بس جا رہا تھا۔ کچھ کام ہے؟"

"دلّی والے بابو آ گئے؟"

"ابھی نہیں... میں دیکھ آتا ہوں۔"

"نہیں، رہنے دو، اتنی جلدی کیا ہے! وہ اپنے ٹائم پر آئیں گے..."

ٹائم کا کوئی دکھاوا تھا؟ کمرے میں پتا بھی نہیں چلتا تھا... وہ کہاں دبکا بیٹھا ہے۔ وہ ہے بھی یا نہیں۔ کھلی کھڑکی سے بیڈمنٹن کورٹ کے اوپر والے آکاش میں ایک دو تارے ٹمٹماتے دکھائی دے جاتے تھے، لیکن کمرے میں ابھی دھوپ کی آخری بجھتی چندکیاں بستر پر رینگ رہی تھیں... کہیں دور پہاڑی چراگاہوں سے گھر لوٹتے ڈنگروں کی گھنٹیاں سنائی دے جاتی تھیں۔

Scanned with CamScanner

"کیا اماجی گھر آئی تھیں؟" مہرا صاحب نے کروٹ بدل کر آنکھیں کھولیں۔

"جی، دو دن پہلے... وہ اور رنجن بابو دونوں آئے تھے۔"

"اور میں کہاں تھا؟" انھوں نے اٹھنے کی کوشش کی، لیکن مرلی دھر نے ان کے کندھے پکڑ کر انھیں پھر لٹا دیا۔

"آپ سو رہے تھے۔"

"مجھے جگایا کیوں نہیں؟"

"جگایا تھا... آپ نے اماجی سے بات بھی کی تھی... دیکھیے، وہ آپ کے لیے کتابیں بھی چھوڑ گئی ہیں جو آپ نے منگوائی تھیں! آپ کو اب یاد آیا؟"

دیوا کی کتابیں، جو اماجی لے جاتی تھیں؟ انھیں یاد آیا... وہ نہیں جو مرلی دھر بتاتا تھا، بلکہ وہ جسے وہ عرصہ پہلے بھول چکے تھے... ان دنوں مہرا صاحب کے ساتھ اکثر ایسا ہی ہوتا تھا... مدت پہلے گزری ہوئی گھڑیاں اس طرح یاد آتی تھیں جیسے ابھی کل ہوئی ہوں... اور جو کل ہوا تھا، لگتا ہے وہ کبھی ہوا ہی نہیں۔ زندگی آگے بڑھتی ہوئی جو خالی جگہ چھوڑتی جاتی تھی، اس میں گزری ہوئی گھڑیاں اپنا گھر بناتی جاتی تھیں... کیا ایک عمر کے بعد آدمی جیتا ایک طرف ہے اور جاگتا دوسری طرف؟ جب سچ مچ جاگتا ہے، تب پتا چلتا ہے، جینے کا مطلب پتا نہیں کہاں راستے میں چھوٹ گیا... کیا یہ سب کے ساتھ ہوتا ہے... یا صرف میرے ساتھ ہو رہا ہے؟

باغ میں اٹھتی ہوئی لپٹیں مند پڑنے لگی تھیں، لیکن دھوئیں کی تیکھی گندھ ہوا میں تیرتی ہوئی بھیتر آ رہی تھی۔

"کھڑکی بند کر دوں، صاحب جی؟"

"نہیں... ابھی نہیں... ابھی تو اجالا ہے... تم کہاں بیٹھے ہو؟"

"جی یہاں، آپ کے سرھانے کے پاس..." مرلی دھر نے ان کے ماتھے کو سہلایا، جیسے وہ ستر برس کے بوڑھے نہیں، سات برس کے بچے ہوں، بخار کی تپن میں بھٹکتے، بہکتے ہوئے۔ کیسے کوئی آدمی اپنی دیہہ کو چھوڑ کر الگ گھومتا رہتا ہے، کسی انجانے پردیس میں، جہاں ہر درد کی اپنی گلی ہے، ہر یاد کا اپنا آنگن، ہر پچھتاوے کا اپنا پچھواڑا۔ مریض کے سامنے بیٹھے مہمان کو پتا بھی نہیں چلتا کہ وہ اپنی

دیہہ کو کس کے سامنے چھوڑ کر خود کون سی یاترا پر چل نکلا ہے... وہاں سے لوٹے گا بھی یا نہیں... اسی وحشت میں آ کر مرلی دھران کے جسم کو پھر جھنجھوڑنے لگتا ہے...

"صاحب جی، آپ ہیں تو یہیں؟"

وہ مسکراتے ہیں، آنکھیں کھول دیتے ہیں... "یہاں نہیں ہوں بھلا تو کہاں ہوں مرلی دھر!" نھوں نے پیار سے مرلی دھر کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"ایک بات کہوں، صاحب جی؟"

"بولو مرلی دھر... کیا کہنا ہے؟"

"تیا بی بی کو بلا دیں..."

کچھ دیر چپی رہی... وہ آنکھیں کھول کر سامنے کی دیوار کو دیکھتے رہے۔ "کیوں... کیا میرا وقت آ گیا ہے، مرلی دھر؟..."

"وقت کا کچھ نہیں معلوم، صاحب جی... وہ گھنٹہ بجا کر تھوڑی آتا ہے..." مرلی دھر نے ذرا ہنس کر کہا۔

"ہاں! آتا ہے... جب بی بی گئی تھیں تو کیا سب نے اس کے آنے کی آواز نہیں سنی تھی؟ تم نے کتنی منوتیاں مانگی تھیں... کچھ بنا؟"

"جی بنا، صاحب جی..."

"کیا وہ بچ گئیں؟"

"جی ہاں... بچ گئیں۔ کبھی کبھی موت کو بھی دیا آ جاتی ہے، کشٹ سے چھٹکارا دینے آ جاتی ہے... ان کا کشٹ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا تھا۔"

کچھ دیر سناٹا رہا۔ پھر صاحب جی کی آواز سنائی دی... ایک عجیب سی ہچکچاہٹ سے بھری ہوئی۔ "تم نے کبھی میرے لیے منوتی مانگی ہے، مرلی دھر؟"

"جی نہیں... کبھی سوچا بھی نہیں!"

"کیوں، کیوں نہیں؟"

"آپ کو کس بات کی کمی... آپ کے پاس سب کچھ ہے۔"

Scanned with CamScanner

سب کچھ؟

مہرا صاحب نے آنکھیں بند کر لیں، جیسے اس 'سب کچھ' کو دیکھنے سے بچا جا سکے جو ان کے بھیتر دبا تھا۔

کمرے میں دھیرے دھیرے اندھیرا گھر آیا... جب کچھ دیر تک وہ کچھ نہیں بولے تو مرلی دھر اٹھ کھڑا ہوا... دبے قدموں سے باہر آیا۔ ہینڈلوم کورٹ کے بھیتر جلتے ہوئے پتوں کی لپٹیں بجھنے لگی تھیں۔ صرف ہوا میں دھوئیں کی کڑوی گندھ تیر رہی تھی۔ وہ اپنے کوارٹر جانے سے پہلے دلّی والے بابو کی کوٹھری جانا چاہتا تھا... اب تک تو انھیں لوٹ آنا چاہیے تھا۔

ان دنوں مرلی دھر انھیں اکیلے میں بہت کم چھوڑتا تھا... اگر خود کبھی جانا ہی پڑے تو جنسی دھر کو ان کے پاس چھوڑ جاتا تھا۔ ڈر سا لگا رہتا تھا کہ اگر وہ جاگیں، اور کمرے میں کوئی نہ ہو؟ شام کی تو کوئی بات نہیں، دلّی والے بابو بلا ناغہ آ کر بیٹھ جاتے تھے... اور کبھی کبھی تو رات کو بھی ان کے پاس والے کمرے میں صوفے پر سو جاتے تھے۔ وہ ہمیشہ ان کے لیے وہاں بستر بچھا کر جاتا تھا...

کوٹھری کے برآمدے کی بتی جل رہی تھی۔ لگتا ہے، وہ ڈاکٹر صاحب کی دوا لے کر لوٹ آئے ہیں... پھر یہاں کیوں نہیں آتے؟ اپنے کمرے میں کیوں بیٹھے ہیں؟

2.2

رات، دن... دن اور رات۔

میں ان کے پاس بیٹھا رہتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا، وہ اچانک جاگیں اور اپنے کو تی بڑی کا ٹیج کے سائیں سائیں کرتے کمروں میں نپٹ اکیلا پائیں... اس سے زیادہ بھیانک بات کیا ہو سکتی ہے کہ کوئی آدمی اکیلے پن کے انجانے پردیس کی طرف گھستا جا رہا ہو اور اس کے ساتھ کوئی نہ ہو۔ کوئی آخر تک ساتھ نہیں جاتا، لیکن کچھ دور تک تو ساتھ جا سکتا ہے۔ ہر دن گزرنے کے ساتھ مجھے لگتا ہے کہ میں ان کے ساتھ کچھ اور آگے نکل آیا ہوں۔ مجھے ڈر ہے، ایک دن وہ اتنے آگے نکل جائیں گے کہ مجھے پتا بھی نہیں چلے گا، وہ کس پہاڑی کے پیچھے گم ہو گئے۔

ابھی نہیں... ابھی جب آنکھیں کھولتے ہیں تو مجھے کرسی پر بیٹھا دیکھ کر انھیں ہمیشہ کچھ اچرج سا

ہوتا ہے۔ کچھ ویسا ہی جیسے کوئی آدمی لمبی یاترا کر کے لوٹا ہو تو اپنے کسی دوست کو پلیٹ فارم کے اسی بنچ پر بیٹھا پائے جہاں وہ اسے چھوڑ کر گیا تھا۔

''تم اپنا رجسٹر لائے ہو؟''

''ٹھہریے، ابھی لاتا ہوں۔'' میں اٹھنے لگا تو انھوں نے میرا ہاتھ پکڑ کر بیٹھا لیا۔

''ٹھہرو، مجھے خاص کچھ نہیں کہنا ہے۔ مجھے صرف کچھ دکھائی دیا تھا۔ پہلے میں نے سوچا کوئی سپنا ہے، لیکن جب آنکھیں کھولیں تو بھی وہ وہاں تھا... تم کیا سوچتے ہو، یہ کوئی اشارہ ہے؟''

''اشارہ کیسا؟''

''میں بیچ میں آ جاتا ہوں اور وہ آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ ہٹ جاتا ہوں تو وہ پھر دکھائی دینے لگتا ہے۔''

وہ کچھ دیر خالی ہوا میں تاکتے رہے... پھر دھیرے سے کروٹ لی۔

''تم نے کبھی اس بارے میں سوچا ہے؟''

''کس بارے میں؟ آپ کس کی بات کر رہے ہیں؟''

''اپنی، اور کس کی؟'' انھوں نے آنکھیں پھیلا دیں... سفید پتلیوں پر آخری دھوپ کی بندکیاں چمک رہی تھیں۔'' مجھے لگتا ہے، کئی چیزیں اسی لیے آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی ہیں کیونکہ ہم بیچ میں آ جاتے ہیں۔ تم نے جم کاربٹ کے میمائرز نہیں پڑھے، انھوں نے یہاں کے جنگلوں کے بارے میں لکھے تھے... انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ جب کبھی وہ بیابان جنگل میں بندوق لیے چلتے تھے تو انھیں لگتا تھا، بہت سی آنکھیں انھیں دیکھ رہی ہیں، جبکہ وہ کسی کو نہیں دیکھ سکتے تھے۔ 'میری آہٹ سنتے ہی سارا جنگل چھپ جاتا تھا،' وہ لکھتے ہیں... 'اور مجھے لگتا تھا، جیسے...'' وہ ایک لمحے رکے، جیسے کسی پھانس کو اپنے پرانے گھاؤ سے باہر نکال رہے ہوں۔ ''' جیسے میں کسی ایسی جگہ آ گیا ہوں، جو میری نہیں ہے۔'''

وہ کچھ دیر اسی کی اور آنکھیں لگائے لیٹے رہے۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے کہا، ''ہو سکتا ہے... ہماری اصلی جگہ کہیں اور ہو، اور ہم غلطی سے یہاں چلے آئے ہوں؟'' ان کی آواز میں کچھ ایسا تھا کہ میں جھجکا سا گیا۔

''کون سی اصلی جگہ؟'' میں نے کہا۔ ''اس دنیا کے علاوہ کوئی اور جگہ ہے؟''

Scanned with CamScanner

"مجھے نہیں معلوم، لیکن جہاں تم ہو، میں ہوں، نرنجن بابو ہیں، ذرا سوچو، کیا ہم صحیح جگہ پر ہیں؟ نرنجن بابو نے ایک بار مجھے بڑی عجیب گھٹنا سنائی... تم جانتے ہو، انھوں نے فلاسفی تو چھوڑ دی، لیکن سادھوسنیاسیوں سے ملنے کی دھن سوار ہوگئی... جو بھی کوئی ملتا اس سے بات کرنے بیٹھ جاتے۔ ایک بار انھیں معلوم ہوا کہ کوئی بوڑھا بھکشک ان کے باغیچے کے پاس ہی ایک جھونپڑی میں ٹھیرا ہے... وہ ان سے ملنے گئے تو بھکشک نے بہت دیر تک ان کے سوالوں کا کوئی جواب نہیں دیا... پھر بھی جب نرنجن بابو نے انھیں نہیں چھوڑا تو انھوں نے کہا... پہلے اس کوٹھری میں جہاں تمھاری جگہ ہے، وہاں جاکر بیٹھو... نرنجن بابو کو اس میں کوئی پریشانی محسوس نہیں ہوئی۔ وہ چپ چاپ ایک کونے میں جا کر بیٹھ گئے۔ لیکن کچھ ہی دیر بعد انھیں بے چینی محسوس ہونے لگی۔ وہ اس جگہ سے اٹھ کر دوسری جگہ جا کر بیٹھ گئے، لیکن کچھ دیر بعد انھیں لگا، وہاں بھی کچھ غلط ہے اور وہ اٹھ کر تیسری جگہ جا بیٹھے... ان کی بے چینی بڑھتی گئی اور وہ برابر ایک جگہ سے دوسری جگہ بدلتے رہے... پھر انھیں لگا جیسے ایک ہی جگہ ان کے لیے بچی تھی جسے انھوں نے پہلے نہیں دیکھا تھا، دروازے کی دہری کے پاس، جہاں پہلے اندھیرا تھا اور اب ہلکی دھوپ کا چکتا چمک رہا تھا... وہاں بیٹھتے ہی انھیں لگا جیسے صرف کچھ دیر کے لیے... کہ یہ جگہ صرف ان کے لیے تھی، جسے وہ اب تک کھوج رہے تھے... جانتے ہو، وہاں بیٹھ کر انھیں کیا لگا؟... ایک عجیب سی شانتی کا احساس... انھیں لگا انھیں بھکشک سے کچھ بھی نہیں پوچھنا۔ انھیں سب جواب مل گئے ہیں، من کے سارے اندیشے دور ہو گئے ہیں... وہ جس طرح کوٹھری میں آئے تھے، ویسے ہی باہر نکل آئے..."

ان کا چہرہ اندھیرے میں چھپ گیا تھا، حالانکہ کھڑکی کے باہر اب بھی چیڑوں کی پھنگیوں پر شام کی آخری دھوپ چمک رہی تھی۔

"تمھیں معلوم ہے... دیوا نے تمھیں یہاں بلایا تھا... کبھی سوچا ہے، کس کے لیے؟

"میرے لیے... ہے نا؟" انھوں نے غلاف سے اپنا ہاتھ باہر نکال کر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

"لیکن جب میں نہیں رہوں گا، تب؟ کچھ سوچا ہے اس کے بارے میں؟ جانتے ہو، اس دنیا میں کتنی دنیا کیں خالی پڑی رہتی ہیں، جبکہ لوگ غلط جگہ پر رہ کر زندگی گنوا دیتے ہیں... میں نہیں چاہتا، تمھارے ساتھ ایسا ہو۔"

Scanned with CamScanner

''اور جنھیں اپنی جگہ مل جاتی ہے... وہ سکھی ہو جاتے ہیں؟''

''سکھ؟'' ایک پھنکارتی سی آواز ہوا میں ٹھہر گئی۔ ''میں نے سکھ کا نام تو سنا ہے، دیکھا کبھی نہیں!''

وہ تکیے پر سر موڑ لیتے ہیں۔ میں دھیرے سے کھڑکی کے پاس جاتا ہوں... پردہ کھینچ دیتا ہوں۔ ٹیبل لیمپ کی چھوٹی بتی جلا دیتا ہوں۔ جھانک کر نیچے دیکھتا ہوں تو پتا چلتا ہے، وہ نیند کے دوسرے کنارے پر چلے گئے ہیں۔ کبھی بھی لوٹ سکتے ہیں... نیند جیسے کوئی چھوٹا سا تالاب ہے، جہاں وہ ڈبکی لگانے گئے ہیں اور میں کنارے پر ان کے لوٹ آنے کی راہ دیکھ رہا ہوں۔

نہیں، انھیں کوئی ایسی بیماری نہیں جسے کسی میڈیکل کھاتے میں درج کیا جا سکے۔ کوئی کشٹ ایسا نہیں جس کی ہوک یا ہائے ان کے منھ سے باہر نکلتی ہو۔ سب کچھ پہلے جیسا ہی ہے: صرف چہرے پر چیونٹی بھر بدلاؤ سر کتا دکھائی دیتا ہے۔ آنکھیں مندی ہوئی بھی ادھ کھلی دکھائی دیتی ہیں، آدھی بھیتر، آدھی باہر۔ بہت دنوں سے ڈاڑھی نہ بنانے کے کارن چہرہ ایک گہری سفیدی میں ڈھکا رہتا ہے، جس کے بیچوں بیچ ان کی پتلی ستواں ناک ایک تنگ ہڈی سی اوپر اٹھی دکھائی دیتی ہے... آنکھوں اور ناک کے بیچ ایک تجسس سا چمکتا رہتا ہے۔ کیا وہ کچھ دیکھ رہے ہیں جو میں نہیں دیکھ پاتا؟ سپنا تو ہو نہیں سکتا، کیونکہ سپناتے ہوئے چہرے پر ایک بچے کی معصومیت اور گہری نیند چلی آتی ہے، منھ تھوڑا سا کھل جاتا ہے، جیسے کچھ لوگ منھ کھول کر ہی کسی سنسنی خیز قصے کو سنتے ہیں اور تب... انھیں دیکھتے ہوئے مجھے عجیب سا بھرم ہوتا ہے۔ جیسے ان کا شریر صرف وہ نہیں ہے جو بستر پر لیٹا دکھائی دیتا ہے، بلکہ وہ بھی ہے جیسا وہ بچپن میں اور جوانی میں تھا... جیسے ساری حالتیں اور کیفیتیں سینما کے سلائیڈ پر لکھی ہوئی ہیں۔ جو بھی پہلے جی چکے ہیں، اب اسے پردے پر دیکھ رہے ہیں، ہو بہو ویسا نہیں جیسا ہوگا تھا، بلکہ وہ بھی جو جینے کی ہڑبڑی میں حاشیے پر چھوٹ گیا تھا: وہ اب لوٹ کر گوندکی چپّی میں اس کے ساتھ جڑ گیا ہے جسے وہ مجھے لکھاتے تھے ––– دوسری زندگی کے بیچ چپکی ایک تیسری زندگی، جو اب تک کسی تہ خانے کے اندھیرے میں کلبلاتی تھی... اور اب برسوں بعد موقع پا کر مچھلی کی طرح سانس لینے اوپر چلی آئی تھی...

ایسے موقعوں پر وہ میرا ہاتھ پکڑ لیتے... بے چین آنکھوں سے مجھے کریدنے لگتے۔ ''دیکھا تم نے؟''

''کیا بابو جی؟ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' ایسے بدحواس لمحوں میں انجانے ہی میرے منھ سے

Scanned with CamScanner

'بابوجی' نام نکل پڑتا۔ شاید یہ ان کے ہاتھ کی پکڑ تھی جو ہمارے بیچ کی دوری کو پاٹ لیتی تھی... شریر کا لمس بھی کیسا ہوتا ہے — وہ ایک انجانے رشتے کو ناقابل بیان راز میں بدل دیتا ہے۔ کچھ دیر بعد ان کا ہاتھ ڈھیلا پڑ جاتا... نیند کا نیلا پھیلاؤ دھیرے دھیرے ان کی چیتنا کو ڈھکنے لگتا۔ جو مچھلی کچھ دیر پہلے دھوپ کی کوند میں اوپر اٹھتی دکھائی دی تھی، وہ پھر کسی اندھیرے میں گم ہو جاتی... کچھ بھی باقی نہ رہتا، صرف سپاٹ، سوکھی سانسیں، ان کا بستر، تکیے پر گرتی ٹیبل لیمپ کی روشنی اور سرہانے پر بیٹھا میں۔

اگلے دن ڈاکٹر سنگھ انھیں دیکھنے آئے۔ کافی دیر ان کے ساتھ بیٹھے رہے۔ میں اس دوران برآمدے میں بیٹھا رہا... بند دروازے کے پیچھے سے ہلکی آوازیں... آوازوں کے بیچ سناٹے کو سنتا رہا۔ اور دنوں میں جب ڈاکٹر سنگھ باہر آتے تو ہمیشہ مجھے کچھ ہدایتیں دے جاتے... یا کبھی کوئی دوا منگوانی ہوتی تو اس کا پریسکرپشن میرے ہاتھوں میں پکڑا دیتے... ہمیشہ مصروف سے دکھائی دیتے، کام کی بات کے علاوہ شاید ہی کوئی بات ان کے منھ سے نکلتی۔ لیکن اس دن جب باہر آئے تو برآمدے کی سیڑھیاں اترنے سے پہلے میرے سامنے رک گئے۔ انھوں نے میری طرف دیکھا... پھر کچھ سوچ کر بولے:

''کل کچھ ہوا تھا؟''

''نہیں... مجھ سے باتیں کرتے رہے... پھر سو گئے...''

''کوئی ہیجانی بات تو نہیں کی تھی؟''

''کچھ خاص نہیں... لیکن آپ تو جانتے ہیں، جب سے تیا گئی ہیں، تھوڑا بہت تو ناراض رہتے ہی ہیں۔''

''ناراضگی کیسی؟'' انھوں کچھ تیکھے لہجے میں پوچھا۔

''انھیں نہیں معلوم تھا، بٹیا اتنی جلدی لوٹ جائیں گی۔ کیا آپ سے کچھ کہہ رہے تھے؟''

وہ ہنسنے لگے... ڈاکٹر سنگھ جب ہنستے تھے تو ان کی ساری دیہہ اس میں حصہ بانٹتی تھی... ہاتھ، سر، آنکھیں ایک دوسرے سے اپنی ہی کسی پرائیویٹ بھاشا میں اشارے کرنے لگتی تھیں۔

''ایک دن وہ کلب آنا چاہتے ہیں... جانتے ہو، وہ اس کلب کے سب سے پرانے ممبر ہیں... تم کبھی انھیں اپنے ساتھ کیوں نہیں لے آتے؟''

''اس حالت میں؟'' میں نے ڈاکٹر سنگھ کو دیکھا... کیا وہ اب مجھ پر ہنس رہے تھے؟

''کیوں... ان کی حالت کو کیا ہوا ہے؟ وہ ٹھیک ہیں۔ قانون کی نگاہ میں ہر آدمی بے گناہ ہے، جب تک مجرم ثابت نہیں ہوتا... میڈیکل سائنس میں اس کا الٹا ہے... ہر آدمی بیمار ہے جب تک اپنے کو تندرست محسوس نہیں کرتا...''

''تب آپ کو ان میں کوئی فرق دکھائی نہیں دیتا؟''

''کہنا مشکل ہے... ایک پوڑی سے دوسری پوڑی... جب تک آخری پوڑی پر نہیں پہنچیں گے، کیسے پتا چلے گا، پنی کتنا قریب ہے؟''

وہ کبھی کبھی اس طرح کی پہیلیوں میں بات کرتے تھے، جب مجھے ان کی اصلی حالت کے بارے میں نہیں بتانا چاہتے تھے۔

وہ سیڑھیاں ترنے لگے۔ آج وہ خاکی رنگ کی برجس پہن کر آئے تھے۔ سر پر ہیٹ تھا۔ کوئی آرمی افسر سے جان پڑتے تھے۔

مرلی دھر سینٹ سباسٹین کی لگام پکڑ کر دھوپ سینک رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کو دیکھتے ہی وہ اسے برآمدے کے سامنے لے آیا۔ وہ سیڑھی سے ہی اچک کر گھوڑے کی کاٹھی پر ایسے بیٹھے جیسے سینٹ سباسٹین اصلی نہیں، کھلونے کا گھوڑا ہو، جو ان کے بیٹھتے ہی چلنے لگا۔ میں بھی ان کے ساتھ ساتھ چلنے لگا، جیسے کوئی بات ادھوری چھوٹ گئی ہو... کوئی بیچ کی پوڑی جسے پار کرنا ضروری ہو۔ جب مرلی دھر نے پھاٹک کھولا تو انھوں نے لگام کھینچ کر میری اور مسکراتے ہوئے دیکھا۔

''چلو، میرے ساتھ کلب آؤ گے؟''

''اب آپ کو کسی مریض کو دیکھنے نہیں جانا؟'' میں نے پوچھا۔

''بس آخری تم بچے ہو... تمھیں بار میں دیکھ لیں گے۔''

ان کی ہنسی کو دیکھ کر مجھے لگا، باہر کی دنیا اس سے کتنی الگ تھی جس میں میں صاحب جی کے ساتھ رہتا تھا... ''پھر بتاؤ... آؤ گے؟''

من ہوا، چلا جاؤں... کچھ دیر کے لیے ہی سہی، چھٹی تو ملے گی۔ پھر کسی نے مجھے کھینچ دیا، کٹے کی بھینس کی طرح، جو بھول جاتا ہے کہ وہ ایک لکیر سے آگے نہیں جا سکتا۔ ''آج نہیں،'' میں نے کہا۔

''پھر کبھی آؤں گا۔ دیر تک آپ کے ساتھ بیٹھوں گا۔''

Scanned with CamScanner

سینٹ سباسٹین ہوا میں اپنی گز بھر لمبی پونچھ لہراتا ہوا چڑھائی چڑھنے لگا۔ پگڈنڈی کے موڑ پر وہ اور ڈاکٹر سنگھ بادلوں میں گم ہو گئے۔ گیٹ بند کرنے میں واپس لوٹا تو میرے پاؤں سفید بجری پر ٹھٹک گئے۔ بادلوں کے بیچ مہرا صاحب کی کاٹیج کیسی چھوٹی موٹی دکھائی دیتی تھی۔ پتا بھی نہیں چلتا تھا، وہاں کوئی رہتا ہوگا۔ مٹی، پتھر، گارے کا ڈھیر — سے کو اپنی چہار دیواری کے بیچ جونک کی طرح چوستا ہوا۔

اس کے بعد کہیں جانا نہ ہوا۔ میں انتظار میں برآمدے میں بیٹھا رہتا۔ کبھی بلاتے، کبھی مرلی دھر کے ہاتھ کوئی سندیش بھجوا دیتے۔ ایک دوپہر اچانک وہ میری کوٹھری میں آئے اور برآمدے کی کرسی پر آکر بیٹھ گئے۔ بہت دنوں بعد وہ کپڑے بدل کر آئے تھے — کوٹ، پینٹ، پالش میں چمچماتے جوتے۔ صرف چہرہ بہت پیلا اور کمزور دکھائی دے رہا تھا... شاید اس لیے کہ انھوں نے بہت دنوں بعد ڈاڑھی بنائی تھی، جس کے کارن ہڈیوں کا ابھار کچھ زیادہ ہی ننگا اور نکیلا دکھائی دے رہا تھا۔

''ٹھہریے، چائے بنا کر لاتا ہوں،'' میں نے کچھ ہڑبڑی میں کہا۔

''بیٹھو...'' انھوں نے دوسری کرسی کو پیر سے میرے پاس دھکیل دیا۔ ''چائے کو چھوڑو... پہلے یہ دیکھو!'' انھوں نے ایک لمبا سفید لفافہ میری طرف بڑھا دیا۔

میں نے ان کی اور دیکھا، پھر لفافہ کھول کر کاغذ کے دو پنّے نکالے... تیا کی لکھائی دیکھتے ہی پہچان گیا۔

''پڑھو!'' ان کی آواز سنائی دی۔

میں پڑھنے لگا۔ انھوں نے اپنی کرسی کچھ اور پاس کھسکالی۔ جب میں کہیں بیچ میں اٹک جاتا تو وہ بے چین ہو کر کہتے، ''چھوڑو، آگے بڑھو...'' اور میں لفظوں کو پھلانگ کر آگے بڑھ جاتا... ان قصبوں اور شہروں، گاؤں کے بیچ چلنے لگتا جہاں جہاں تیا گئی تھیں، ایسے استھان جن کا نام بھی کبھی نہیں سنا تھا۔ پرانے جھگڑے کی ذرا سی بھی کوئی چھایا نہیں، جیسے وہ مہرا صاحب کا دھیان اپنے سے ہٹا کر اس عجیب دنیا کی طرف کھینچنا چاہتی تھیں جہاں وہ اتنے برسوں سے رہ رہی تھیں... کمیونٹی سینٹر، سرکاری ڈسپنسری، پرائمری اسکول... پھر میں بھول گیا میں کیا پڑھ رہا ہوں، مجھے صرف شبدوں کے پیچھے وہ دکھائی دینے لگیں، جن کے جوتوں پر کیچڑ کے دھبے دکھائی دیتے تھے، جب وہ چنّی کو کمر سے باندھ کر میرے

Scanned with CamScanner

ساتھ جھرنے سے پانی لانے جایا کرتی تھیں... اور کچھ بولتی جاتی تھیں... جسے میں نہیں سن سکتا تھا...

مجھے ایک عجیب سا بھرم ہوا، جیسے میں ان کے پتر کو صاحب جی کو نہیں سنا رہا، صرف ان کی آواز سن رہا ہوں، جو خط کے بھیتر سے ہم دونوں کے پاس آ رہی ہے، اور جب میں آخری جملے پر پہنچا تو اپنے منھ سے اپنا نام سن کر رک گیا... انھوں نے میرے بارے میں پوچھا تھا کہ میں کیسا ہوں، اور کیا وہ اب بھی مجھے اپنے بارے میں من گھڑت قصے سناتے ہیں... اور تب میں نے ان کی اور دیکھا... لیکن وہ... کہیں اور تھے۔ وہ دوپہر کی ہلکی دھوپ کو پہاڑوں پر سرکتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ جب میں چپ ہو گیا تو اچانک میری اور دیکھا۔

''آنے کے بارے میں کچھ لکھا ہے کیا؟''

''نہیں، اس میں تو کچھ نہیں ہے۔'' مجھے معلوم تھا، انھیں معلوم ہے... خود چٹھی پڑھنے کے بعد مجھ سے پڑھواتے ہیں، تو انھیں معلوم نہیں ہوگا اس میں کیا لکھا ہے؟ شاید وہ سوچتے ہیں کہ جسے پتر میں وہ نہیں پڑھ پائے، اسے میں دیکھ پاؤں گا۔

وہ میرے ہاتھ سے لفافہ لے لیتے ہیں... وہ میرے سے کرسی سے اٹھتے ہیں۔ دھیمے، مند قدموں سے اپنی کاٹیج کی طرف چلنے لگتے ہیں... روشنی مند پڑنے لگتی ہے، سورج ایک دیا سا بادلوں کے پیچھے ٹمٹماتا رہتا ہے۔

2.3

ایک ایسی ہی سنسان دوپہر تھی جب دروازے پر ہلکی سی کھٹکھٹاہٹ سنائی دی۔ میں کوٹھری سے باہر آیا تو برآمدے میں نرنجن بابو بیٹھے دکھائی دیے۔ دوپہر کی دھوپ میں ان کا چہرہ کمھلایا ہوا تھا۔ خاکی ہیٹ پر دھول جم گئی تھی۔ ڈاڑھی پہلے سے زیادہ سفید دکھائی دے رہی تھی، جیسے پراچین کال کا رشی لمبی تپسیا کے بعد باہر آیا ہو۔

''بھیتر آیئے،'' میں نے کہا۔

''نہیں نہیں... یہیں برآمدے میں بیٹھتے ہیں... تھوڑا سا پانی پلاؤ گے؟''

میں جلدی سے پانی کا گلاس لے کر آیا۔ جیسے وہ سچ مچ کوئی پہاڑ لانگھ کر آئے ہیں۔

"کہاں سے آ رہے ہیں؟"

"منڈی سے... میرے حلیے سے نہیں جان پڑتا؟"

انھوں نے سیبوں کے تین کریٹوں کی اور اشارہ کیا جو وہ اپنے ساتھ لائے تھے۔

"ایک مہرا صاحب کے لیے، دوسرا تم اپنے لیے رکھ لینا۔"

"اور یہ؟" میں نے تیسرے کریٹ کی طرف دیکھا۔

"اگر ممکن ہو تو اسے اناجی کے گھر بجھوا دینا... پتا نہیں، مجھ سے ان سے ملنے کا سے نکل پائے گا۔"

سیبوں کے کریٹ دیکھ کر جو اندیشہ دل میں اگا تھا، وہ کانٹے کی طرح گڑنے لگا۔ کیا ان کے جانے کے دن اتنے چپکے سے پاس سرک آئے کہ مجھے اس کی آہٹ بھی سنائی نہیں دی؟

"تم گھر سے کبھی باہر نہیں نکلتے؟"

"مہرا صاحب کے ساتھ بیٹھنا پڑتا ہے..."

"کیسے ہیں وہ؟"

"جب سے تیا گئی ہیں، تب سے اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلتے۔ لیٹے رہتے ہیں۔"

"ڈاکٹر سنگھ آتے ہیں؟"

"ہاں... لیکن کچھ بتاتے نہیں۔ کہتے ہیں کہ ہمیں ان دنوں انھیں اکیلا نہیں چھوڑنا چاہیے... میں اور مرلی دھران کے پاس باری باری سے بیٹھتے ہیں۔"

"تم سے کچھ کہتے نہیں؟"

"کہتے ہیں، لیکن مجھ سے نہیں۔ مجھے کبھی کبھی لگتا ہے کہ جہاں وہ رہتے ہیں، وہ کوئی دوسری جگہ ہے۔ وہاں میری پہنچ نہیں ہے۔"

کچھ دیر تک ہمارے بیچ سناٹا کھنچا رہا۔ وہ اپنی ٹھنڈی آنکھوں سے سامنے کاٹج کو دیکھ رہے تھے جو ڈھلتی دوپہر کی دھوپ میں جھلملا رہی تھی۔

"آپ بیٹھیے... میں چائے بنا لاتا ہوں۔"

وہ جیسے سوتے سے جاگ گئے... چاروں طرف برآمدے، میری کوٹھری، کوٹھری کے بھیتر سیلن بھرے اندھیرے کو دیکھ کر بولے: "یہاں تو تم بیٹھتے ہی ہو۔ چلو تھوڑی دیر باہر کی ہوا لو... آ سکتے ہو؟"

میں نے گھڑی دیکھی۔ سے کافی تھا۔ مہرا صاحب کے پاس مرلی دھر شام تک بیٹھتا تھا۔ مجھے رات کو نیند نہیں آتی تھی، اس لیے میں نے رات کی شفٹ اپنے لیے باندھ لی تھی... لیکن کبھی کبھی میں گھبرا جاتا تھا... ان کے کمرے سے، اپنی کوٹھری سے، کالج کے سناٹے سے...

"چلیے!" میں نے کہا۔

مجھے دیکھ کر وہ مسکرائے۔ "کہاں چلو گے؟"

"جہاں آپ کی مرضی۔"

"آج کے موسم میں چنی لال کا چوبارہ سب سے اچھا رہے گا... باہر ہوا میں بیٹھیں گے۔"

چنی لال کی دکان ایک طرح کا ہوا گھر ہی تھی... چائے خانہ اور ہوا گھر، دونوں ایک ساتھ۔ زنجن بابو اسے 'اڑن کھٹولا' کہتے تھے، کیونکہ وہ ایک بوڑھے پرانے پیپل کے چبوترے پر بنی تھی... دور سے دیکھنے پر لگتا تھا جیسے پیڑ کے بھیتر سے دکان باہر نکلی ہے، زمین اور آکاش کے بیچ ادھر میں لٹکی ہوئی۔ ڈھابے کا مالک چنی لال اپنی پتنی کے ساتھ پیڑ کے پیچھے ایک جھونپڑی میں رہتا تھا... جھونپڑی کی ہی ٹین کی چھت پر لال مرچیں اور بڑیاں سوکھا کرتی تھیں... نیچے دروازے کی اوٹ میں اس کی پتنی اپنے لال لہنگے کو پھیلائے آلتی پالتی مار کر بیٹھی رہتی تھی، پان کی بیگم کی طرح۔ پیپل کی چوڑی پتیاں ٹین کی چھت اور ڈھابے کی میز پر جھڑ جھڑا یا کرتی تھیں۔

میز ایک ہی تھی، لیکن بنچیں دو تھیں... پاس میں ہی مٹی کا چولھا تھا، جس کی مندی آنچ میں ہمیشہ چائے کی کیتلی بڑبڑاتی رہتی تھی۔ چولھے کے اوپر لکڑی کی چھتری تھی، جس کا ایک سرا پیڑ کی ڈال اور دوسرا جھونپڑی کی دیوار کے بیچ اڑا تھا۔ چھتری کے ایک چھور پر پیتل کے گلاس چم چم چمکا کرتے تھے، دوسرے چھور پر بسکٹوں، مٹھریوں اور ٹافیوں سے بھرے پلاسٹک کے مرتبان رہتے تھے۔ مرتبان کے ڈھکنوں پر پرندوں کی بیٹ کے سفید نشان اکثر دکھائی دے جاتے تھے۔

نیچے سارا شہر دکھائی دیتا تھا۔

چنی لال نے ہمیں دور سے آتا دیکھ لیا تھا۔ اس کی پتنی نے اپنے دوپٹے سے بنچوں اور میزوں پر جھڑے پتوں کو جھاڑ دیا... وہ فرانے سے ایک گلاس کا پانی دیگچی میں ڈال دیا۔

بنچ پر بیٹھ کر انھوں نے ایک لمبی سانس کھینچی۔ "جب میں اس شہر میں پہلی بار آیا تھا تو سیدھے بس

Scanned with CamScanner

اسٹیشن سے اتر کر یہاں چائے پی تھی۔ تب سوچا بھی نہیں تھا، ایک دن ہمیشہ کے لیے بس جاؤں گا۔''

''سیبوں کا باغیچہ آپ نے تبھی خریدا تھا؟''

''نہیں، کئی برسوں بعد... پہلی بار تو کچھ دن رہنے آیا تھا، پھر سوچا، جب یہیں رہنا ہے تو کچھ کرنا چاہیے...''

''مجھے تو عرصے تک پتا نہیں چلا، آپ یہاں ہیں... ہم سب یہی سوچتے تھے، آپ کسی باہر کی یونیورسٹی میں پڑھانے گئے ہیں... جس طرح آپ چپ چاپ دوستوں کے بیچ غائب ہو جاتے تھے اور ہم سوچتے تھے، آپ ابھی تو یہاں تھے، کہاں گئے؟''

وہ ہنسے نہیں۔ ایک بے دلی سی چھائی تھی، جیسے پرانے دنوں کی دنیا سے وہ بہت دور چھٹک گئے تھے اور اب اسے یاد نہیں کرنا چاہتے تھے۔

پیڑ کے پیچھے ٹھکر میں چنی لال کی عورت برتن دھو رہی تھی اور پانی کی دھار سر سر کرتی ہوئی ہمارے سامنے کی نالی سے بہہ رہی تھی۔

جب چنی لال چائے کے دو گلاس میز پر رکھ گیا، تب کہیں سناٹا ٹوٹا۔ ''اب کیسے ہیں مہرا صاحب؟''

''ایک ہی جیسے ہیں... چلنا پھرنا بند ہو گیا ہے۔ کمرے میں ہی رہتے ہیں۔''

''کیا کرتے ہیں؟''

''لیٹے رہتے ہیں یا تاکتے رہتے ہیں... بولتے ہیں تو سمجھ میں نہیں آتا وہ اپنے بھیتے کا کون سا کھاتا کھول کر بیٹھ گئے ہیں جسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔''

''اپنا کچھ لکھا دے ہیں؟''

''پوچھتے ہیں، رجسٹر لایا ہوں؟... پھر اپنا لکھا ہوا خود پڑھتے ہوئے ہنسنے لگتے ہیں۔''

''ہنستے ہیں؟''

''ہاں... پڑھتے پڑھتے ہنسنے لگتے ہیں۔''

''یہ سب کیسے ہوا؟ کچھ دن پہلے تک تو سب ٹھیک تھا۔ میں انھیں ہر جگہ گھومتا دیکھتا تھا۔ کچھ ہوا تھا؟''

''بٹیا آئی تھیں۔''

''کب؟ مجھے کسی نے کوئی خبر نہیں دی۔''

''بہت کم دن رہیں... صاحب جی کو دیکھنے آئی تھیں۔''

نرنجن بابو نے چائے کا گلاس سرکا دیا اور قمیض کی جیب سے پائپ نکال لی۔ تمبا کو بھرتے ہوئے کہا: ''پتا نہیں کیوں آتی ہے، جب یہاں رہ نہیں سکتی! کیا تم نے اسے لکھ دیا، ان کی کیسی حالت ہے؟''

''لکھا تھا... ہر ہفتے انھیں چٹھی لکھ دیتا ہوں۔''

''عجیب لڑکی ہے... اپنی زندگی کا کیا گزرا باپ پر نکالتی ہے۔''

''کیسا کیا گزرا؟'' مجھے لگا، وہ کچھ چھپا رہے ہیں۔

وہ تیسری دیا سلائی جلا رہے تھے، پائپ کو اچانک منھ سے ہٹا کر بولے، ''مجھے کیا معلوم؟ ایک اکیلی لڑکی کے ساتھ کیا ہوتا ہے، کوئی جانتا ہے؟ اور دیوا تو اس کی ماں بھی نہیں تھی!''

نہیں تھی تو کون تھی؟ میں پوچھنا چاہتا تھا۔ وہ جوتیا کو دروازے کے باہر چھوڑ کر چھٹی پا گئی تھی؟ ہمیشہ کے لیے کھو گئی تھی؟

''آپ نے کبھی ان کی ماں کو دیکھا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''صاحب جی کی پہلی پتنی کو؟ ایک بار آئی تھیں... کسی کو معلوم نہیں، کب... سوائے دیوا کے... وہ جانتی تھیں۔'' ایک بے رحم سی ہنسی ان کی ڈاڑھی میں ابھر آئی۔ ''انھیں سب معلوم تھا... ان کی قبر کھودیں گے تو پتا نہیں کتنے کلبلاتے بھید باہر آئیں گے! تم خوش قسمت ہو، تم تب آئے جب سب کے رول پورے ہو چکے تھے...''

وہ کیا کہہ رہے تھے؟ کیسے رول؟ آدھی بات کہہ کر وہ رک کیوں جاتے ہیں؟ پر ان سے پوری بات جاننے کی ہمت کبھی نہیں ہوتی تھی۔ میں جتنا جانتا تھا، اس سے زیادہ جاننے کی اچھا نہیں ہوتی تھی — کم سے کم ان سے نہیں۔

دوپہر کے بادل نیچے اتر رہے تھے۔ بانج کی بوڑھی باہنوں سے الجھ جاتے تھے۔ نالی میں پانی اب بھی سرسر سیٹی بجاتا ہوا بہہ رہا تھا۔

''تمھیں معلوم ہے؟'' انھوں نے پائپ کو جھاڑ کر میز پر رکھ دیا۔ ''ہمارے باغیچے میں ایسے

سیب ملتے ہیں جو اوپر سے لال سرخ دکھائی دیتے ہیں، لیکن کاٹتے ہی ان کے بھیتر کیڑا دکھائی دیتا ہے، جو پتا نہیں کب سے اس کے اندر پنپ رہا ہوتا ہے۔ وہ کہیں باہر سے نہیں آتا، بھیتر گودے سے جان کھینچتا ہے۔ وہ جتنا ہی بڑھتا جاتا ہے، بھیتر کا سب کچھ کھوکھلا ہوتا جاتا ہے۔ کبھی تو پورا کا پورا پیڑ اسی طرح ختم ہو جاتا ہے... جب میں مہرا صاحب کو دیکھتا ہوں...'' انھوں نے آگے کچھ نہیں کہا... پائپ جلانے میں جٹ گئے۔

کیا کہنا چاہتے تھے؟ کتنے لوگ جیتے جاگتے، ہنستے گھومتے دکھائی دیتے ہیں... ہر کسی کے بھیتر جھانک کر دیکھو گے، کہاں کیڑا بیٹھا ہے، کتنا زہر گھلا ہے؟ اسی سے بچنے کے لیے تو تم اتنی دور آئے تھے... دوسروں سے الگ، اپنی ٹھور پانے؟ اور تب اچانک مجھے ان مہاتما کی یاد ہو آئی جنھوں نے رنجن بابو کو اپنی 'صحیح جگہ' پر بیٹھنے کی صلاح دی تھی۔ مل پائی انھیں وہ جگہ یا ابھی کچھ باقی ہے؟

چنی لال ہمیں الگ چھوڑ کر اپنے مستقر میں چلا گیا۔ رہ گئی صرف ہوا اور کانچ ٹہنیاں اور ڈوبتے سورج کی پیلی نیولی چھایا، جو بادلوں کو چھید کر سارے شہر پر پھیل رہی تھی۔ پہاڑیوں پر ایک غیر زمینی سی چمک پھیلی تھی۔ سنہرے، پیلے رنگوں میں رنگی ہوئی وہ کسی دیوتاؤں کا لوک جان پڑتی تھیں — منش کے ہاتھوں سے دور، اچھوتی، اپنی ہی روشنی سے روشن۔

''یہ دن مجھے عجیب سے لگتے ہیں...'' رنجن بابو نے کہا۔ ''سیبوں کا سیزن ختم ہو جاتا ہے... میں اپنے کو اچانک بالکل بیکار پانے لگتا ہوں۔ نہ یہاں رہنے کی اچھا ہوتی ہے، نہ نیچے جانے کی... کبھی کبھی مجھے لگتا ہے، اس شہر میں لوگ جینے نہیں آتے... انتظار کرنے آتے ہیں۔''

''کس کا انتظار؟'' میں نے انھیں دیکھا۔

وہ ہنسنے لگے... پائپ کا جما تمباکو میز پر کھٹ کھٹ کرتے ہوئے جھاڑنے لگے۔

''اپنا، اور کس کا؟ جس عمر میں لوگ یہاں آتے ہیں، اپنے علاوہ اور کس کا انتظار کیا جا سکتا ہے؟ اسی لیے انھیں نیچے جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔''

''ڈر؟ کس کا؟''

''اپنے کو کھو دینے کا،'' رنجن بابو نے کہا۔ ''یہاں رہ کر کم سے کم یہ بھروسا تو رہتا ہے کہ کچھ بھی ہوگا تو ہم موجود تو رہیں گے... نیچے شہروں میں تو ہم اپنے کو بھلائے رکھتے ہیں، جب تک کوئی دھکا

Scanned with CamScanner

دے کر ہمیں جگا نہیں دیتا۔"

وہ چپ ہو گئے... چنی لال کو بلا کر چائے کے دو گلاس اور منگوائے... پھر میری اور آنکھیں اٹھا کر بولے، "جب ہم بچے تھے تو ہر سال ہمارے پتا کا ٹرانسفر دوسرے شہروں میں ہوتا رہتا تھا۔ ہم بھائی بہنوں کو ہمیشہ پرانی جگہوں کو چھوڑتے ہوئے بہت دکھ ہوتا تھا... پتا نہیں وہاں کبھی دوبارہ آنا ہوگا یا نہیں؟ اسٹیشن جانے سے پہلے ہم کچھ خاص جگہوں میں اپنی گھریلو چیزیں دبا کر رکھ دیتے تھے ---- کسی بیر کی جھاڑی میں کوئی کھلونا، پانی کی ٹنکی کے پیچھے پیسوں کا کوئی سکہ، کسی پیڑ کی جڑ میں کلپ یا کنچے کی گولی، تاکہ جب ہم وہاں واپس لوٹیں تو دیکھ سکیں کہ وہ چیزیں وہاں ویسی ہی ہیں جیسی ہم انھیں چھوڑ گئے تھے۔ وہ ہمارے وہاں 'ہونے' کی نشانیاں تھیں، ہمارے لوٹنے کا انتظار کرتی ہوئی... کچھ برسوں بعد جب کبھی اتفاق سے اس شہر میں دوبارہ لوٹنا ہوتا تو ہمیں یاد بھی نہیں رہتا تھا کہ کون سی چیز ہم نے کہاں چھپا کر رکھی تھی، جبکہ وہ چپ چاپ ہماری واپسی کا انتظار کرتی رہتیں... ہم ان کے پاس سے گزر جاتے اور ہمیں پل بھر کے لیے بھی خیال نہیں آتا تھا کہ خود ہماری زندگی کا ایک ٹکڑا کسی جھاڑی کے پیچھے، کسی پیڑ کی جڑ میں، کسی پانی کی ٹنکی کے پیچھے ہمارا انتظار کر رہا ہے..."

"کیا یہاں رہ کر وہ سب چیزیں یاد آ جاتی ہیں،" میں نے پوچھا، "جو آپ نے کھو دی تھیں؟"

"نہیں نہیں..." انھوں نے کہا۔ "ہم خود کھوئی ہوئی چیزوں میں شامل ہو جاتے ہیں... آخر ہمیں بھی تو کوئی یہاں چھوڑ کر بھول گیا ہے کہ ہم اس کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔"

بادلوں کا ایک پردہ سا ہمارے بیچ کھنچ آیا تھا۔ لگتا تھا، وہ کہیں چھپ گئے ہیں، صرف ان کی آواز میرے پاس آ رہی ہے۔

"کیا آپ اسی لیے یہاں رہتے ہیں؟ کہیں نہیں جاتے؟"

"نہیں، آیا اسی لیے نہیں تھا، لیکن رہ اسی لیے رہا ہوں۔"

پھر وہ کیوں نہیں جاتے، نیچے جانا ضروری ہے؟ میں ان سے پوچھنا چاہتا تھا، لیکن کسی چیز نے مجھے روک لیا۔ وہ بہت دور سے جان پڑے۔ کتنے برسوں سے جانتا آیا ہوں نرنجن بابو کو، پر بھیتر کتنی خالی جگہیں ہیں جنھیں کبھی نہیں پاٹ پایا۔ جس طرح اچانک فلاسفی چھوڑ کر نرنجن بابو غائب ہو گئے تھے، برسوں بعد دوبارہ ان سے مل کر لگتا ہے کہ یہ جو سامنے بیٹھے ہیں، باغیچے کے مالک، یہ ان سے کچھ الگ

Scanned with CamScanner

تھا جنھیں میں یونیورسٹی میں جانتا تھا... اسی لیے یک قدم آگے جا کر دو قدم پیچھے مڑ جاتا ہوں، ٹھیک اس حادثے کی جگہ پر جہاں نرنجن بابو کے دونوں سرے پائے جاتے تھے، ایک وہ جنھیں برسوں پہلے جانتا تھا، دوسرے وہ جو میرے سامنے بیٹھے تھے، چائے کے گلاس کے آگے، پائپ سلگاتے ہوئے...

چنی لال جب لالٹین جلا کر ہماری میز پر لایا، تب پتا چلا، باتوں کے بیچ کتنا اندھیرا سرک آیا تھا۔ دور جنگل کے بیابان سے جھینگروں اور مجھریوں کی تان سنائی دے رہی تھی۔ پیپل کے چبوترے پر کسی نے دیوا جلا کر رکھ دیا تھا، جو ہوا کے جھونکے سے پھڑ پھڑا اٹھتا تھا۔

"چائے اور لاؤں؟"

"نہیں، اب چلتے ہیں۔" نرنجن بابو نے چائے کے پیسے چکائے، لیکن بنچ سے نہیں اٹھے، جیسے ابھی کچھ کہنا باقی رہ گیا ہے۔

"تمھیں یاد ہے جو ایک بار میں نے تم سے کہا تھا؟"

"کس بارے میں نرنجن بابو؟"

"لگتا ہے اس بار میرا جلدی لوٹنا نہیں ہوگا... تم چاہو تو میری کاٹیج میں آ کر رہ سکتے ہو... میں نے چابی ننکو کو دے رکھی ہے۔"

"یہ آپ کی مہربانی ہے... لیکن مجھے نہیں لگتا اس کی کوئی ضرورت پڑے گی۔"

وہ کچھ دیر چپ چاپ میری اور دیکھتے رہے۔

"تمھاری مرضی... لیکن دیکھو..." وہ ایک لمحے رکے، "کوئی بھی فیصلہ لو تو مجھے لکھنا نہ بھولنا..."

فیصلہ؟ پیڑ کے اندھیارے میں ان کے منھ سے نکلا یہ شبد اچانک مجھے سہما سا گیا۔ مجھے تب نہیں معلوم تھا کہ کوئی بھی فیصلہ کیوں نہ لو، اندھیری سڑک اور قسمت کے ستاروں کے بیچ فاصلہ ایک جیسا ہی رہتا ہے۔

2.4

اس شام گھر لوٹا تو برآمدے میں مرلی دھر کو دیکھ کر اچرج میں پڑ گیا۔ وہ لالٹین لے کر سیڑھیوں پر بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ "کیا آپ کو صاحب جی ملے تھے؟"

Scanned with CamScanner

''اپنے کمرے میں نہیں ہیں؟''

اس نے سر ہلایا۔

''میں نے سارا گھر چھان ڈالا... جب کہیں دکھائی نہیں دیے تو میں نے سوچا، شاید سیر کے لیے نکل گئے ہیں۔''

میں بھاگتا ہوا کاٹیج کی طرف گیا۔ سب کمروں کے دروازے کھلے تھے اور بتیاں جلی تھیں... ان کا کمرہ ویسا ہی تھا جیسا میں چھوڑ کر گیا تھا — تپائی پر پانی کا جگ، وٹامن کی گولیوں کی شیشی، کرسی کے نیچے ان کے چپل، الماری میں تہہ کیے ہوئے کپڑے، میز پر قرینے سے رکھی ان کی نوٹ بک... صرف بستر خالی پڑا تھا۔

مرلی دھر بھی میرے ساتھ گھر کے ہر کمرے، کونے کونے، غسل خانے، ٹوائلٹ، پچھواڑے کے آنگن میں جھانک رہا تھا، جیسے وہ کوئی لکا چھپی کا کھیل ہو جس میں صاحب جی سب کی آنکھ بچا، کسی دروازے کی اوٹ میں کھڑے ہوں۔

کہاں جا سکتے ہیں اس وقت؟

''تم نے ان کو آخری بار کب دیکھا تھا؟'' میں نے مرلی دھر سے پوچھا۔

''شام کے وقت... مجھ سے پوچھا، آپ کہاں ہیں۔ میں نے بتایا، رنجن بابو کے ساتھ گئے ہیں... کچھ دیر بعد اٹھ کر بولے، تم کوارٹر جاؤ، جب ضرورت پڑے گی تو بلا بھیجوں گا۔''

''پھر؟''

''پھر جب ان کا سوپ لے کر آیا تو وہ کمرے میں نہیں تھے۔ لاٹھی جوتا بھی نہیں تھا، اسی لیے سوچا، اناجی کے یہاں نہ گئے ہوں... وہاں جا کر دیکھا تو تالا بند تھا...''

سمجھ میں نہیں آیا، یہ کیسے ہو سکتا ہے! وہ جو پچھلے دنوں اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلتے تھے، اب اچانک سب کی آنکھوں سے اوجھل ہو گئے تھے۔ اپنے پر غصہ، چڑ، جھنجھلاہٹ، سب ایک ساتھ امڈنے لگے۔ مجھے انھیں چھوڑ کر نہیں جانا چاہیے تھا۔ کہیں وہ اس بات پر تو ناراض نہیں ہوئے کہ رنجن بابو آئے، ان سے نہیں ملے، مجھے اپنے ساتھ لے گئے؟ تیا کے جانے کے بعد انھیں ہر بات پر غصہ آتا تھا۔ مجھے ان کی وہ سب باتیں یاد آنے لگیں جن کی اور میں دھیان نہیں دیتا تھا، سنک سمجھ کر ٹال دیتا

Scanned with CamScanner

تھا... کبھی کسی رات پوچھتے تھے، رجسٹر لائے ہو؟ (وہ ہمیشہ میری نوٹ بک کو رجسٹر کہتے تھے۔) مجھے آج تم سے ایک ضروری بات کہنی ہے... جلدی کرو، نہیں تو بھول جاؤں گا۔ میں نوٹ بک لے کر بیٹھا رہتا اور وہ آنکھیں بند کیے بیٹھے رہتے۔

''چلیں بابو جی، باہر چل کر دیکھتے ہیں، بہت دور نہیں گئے ہوں گے۔''

''کہاں مرلی دھر؟'' میں نے بے بس ہو کر اسے دیکھا۔ اس کے چہرے پر کوئی مایوسی نہیں تھی، مانو ایسی گھٹنائیں روز پڑتی ہیں!

''آپ اوپر پوسٹ آفس والی سڑک پر دیکھیے... ہم نیچے بازار کی طرف جاتے ہیں... یہ لالٹین آپ رکھیے۔ مجھے کوئی مشکل نہیں پڑے گی۔''

لالٹین کی ضرورت نہیں پڑی۔ اوپر تاروں کا جال بچھا تھا، ساری پہاڑیاں ایک سفید جھلملی روشنی میں چمک رہی تھیں۔ سڑکیں خالی پڑی تھیں۔ ایک عجیب سی وحشت نے مجھے پکڑ لیا۔ اگر وہ چلتے چلتے کسی کھڈ میں جا گرے تو پتا بھی نہیں چلے گا کہ وہ کس نالے کھائی میں جا پڑے ہیں... اور اگر کسی باگھ بھیڑیے کی آنکھ ان پر جا پڑی، جو سردیاں شروع ہوتے ہی کھانے کی تلاش میں اپنی بن گپھاؤں سے باہر نکل آتے ہیں؟ پر ان سب اندیشوں کو چیرتا ہوا جو ڈر سب کے اوپر اپنے پنکھ پھیلا کر پھڑ پھڑا رہا تھا، وہ تیا کو لے کر تھا... میں اس کو کیسے اپنا منھ دکھا سکوں گا؟

ڈاک گھر کا سونا احاطہ، چیڑوں کے سرسر کرتے پیڑ، تاروں کی پھیکی روشنی میں گاؤں کی طرف اترتی ہوئی پگڈنڈیاں... سب کو پار کرتا ہوا میں چلتا گیا۔ وہ کہیں دکھائی نہیں دیے۔ بچے رہ گئے تھے ڈاکٹر سنگھ اور E.J. کے گھر... اگر وہ ان کے گھر جاتے تو وہ ضرور مجھے خبر کرتے۔ تھک ہار کر میں پوسٹ آفس کے سامنے والی ڈسپنسری کی بنچ پر بیٹھ گیا، جہاں دن کے وقت روگی بیٹھتے تھے۔ پہلی بار مجھے لگا، جیسے میں بھی ان کی جماعت میں ہی ہوں، ان بیماروں میں سے ایک جنھیں تب تک اپنے روگ کا پتا نہیں چلتا جب تک انھیں کوئی ٹھوکر نہیں لگتی... اور ٹھوکر بھی کیسی... کہ جو باہر سے آیا تھا، انھیں ڈھونڈنے آنکلا تھا، جو خود اپنے گھر کے باہر گم ہو گئے تھے...

بہت پہلے کبھی مسز مہرا نے مجھے اس شہر کے ایک ڈاکیے کی گھٹنا سنائی تھی... روز چٹھیوں کا بیگ لے کر نکلتا اور لوگوں کو بانٹنے کے بجائے انھیں کھائی میں پھینک دیتا... ویلی آف ڈیڈ لیٹرز۔ مری ہوئی

چٹھیوں کے نام سے وہ گھمائی جاتی تھی۔ کیا کچھ لوگوں کو بھی ان کی قسمت اس پوسٹ مین کی طرح کسی ایسی جگہ لا کر پٹک دیتی ہے جہاں وہ ایک دوسرے کے پتوں کے ساتھ رہ کر بھی ایک دوسرے کے لیے کھو جاتے ہیں؟...

تاروں کی چھاؤں میں بیٹھا ہوا اس رات میں شہر کو دیکھتا رہا... میرے لیے وہ شہر بھی وہ کہاں تھا۔ اوپر زنجن بابو کا باغیچہ، کچھ نیچے ہٹ کر اناجی کی پرانی کاٹیج، مہرا صاحب کا گھر، چنگی خانے کے پیچھے پھیلی سنٹری کے یوکلپٹس —— اور ان سب کو گھیرتے جنگل، ندی، نالے، پتھریلی چٹانوں میں دبے پرانے ساگر، جانداروں کے فوسل، ڈھانچے، جس کے اَتل میں کسی دوسرے کال لوک کی گھڑی ٹک ٹک کرتی ہے، اس سب کو دہراتی ہوئی جو کبھی پہلے سے ہی ہو چکا ہے، اور تب مجھے ایک عجیب سا خیال آیا کہ شاید مہرا صاحب اس رات کال چکر کے اس بے انت اندھیرے سے مکتی پانے کے لیے ہی گھر چھوڑ کر باہر چلے گئے ہیں...

پر باہر کہاں؟... ہر جگہ تو باہر ہے!

تبھی مجھے دور سے پاس آتی ہوئی لالٹین دکھائی دی، جیسے وہ اندھیرے میں خود اپنے پیروں پر چلی آ رہی ہو... اس کے پیچھے کالی کی چھایا، جو بھاگتی ہوئی میرے پاس چلی آئی، میری ٹانگوں پر اچھلتے ہوئے چیخنے لگی۔

سامنے مرلی دھر کھڑا تھا

"... چلیے، صاحب جی آ گئے..."

"کہاں ملے؟" میں نے خوشی میں اس کے دونوں کندھے پکڑ لیے۔

"وہ تارا دیوی کی سیڑھیوں پر بیٹھے تھے۔"

"تارا دیوی؟ وہاں کیسے؟"

مرلی دھر چپ کھڑا رہا۔ ایک عجیب سا ڈر اس کے پہاڑی چہرے پر جما تھا، جیسے تارا دیوی کا بلاوا کسی کو بھی، کسی گھڑی بھی آ سکتا ہے...

میں بنچ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ مرلی دھر کی لالٹین، کالی کی دوڑتی چھایا، اس کے پیچھے میں... ہم ایک ساتھ گھر کی اور چلنے لگے۔

Scanned with CamScanner

2.5

اس دن کے بعد ان کا راستہ کھل گیا۔ وہ بنا کسی سے کچھ کہے سنے باہر نکل جاتے۔ میں ان کے کمرے کا دروازہ کھولتا تو وہ خالی دکھائی دیتا۔ کرسی، میز، بستر ایک عجیب شکایت بھرے غصے میں مجھے گھورنے لگتے، جیسے انھیں معلوم بھی نہ ہو، کب وہ ان کے چنگل سے آنکھیں بچا کر باہر نکل گئے ہوں۔ اچھی بات یہ تھی کہ انھیں کھوجنے کے لیے کہیں بہت دور نہیں بھٹکنا پڑتا تھا۔ بری بات یہ تھی کہ ان کے چھپنے کا استھان ہمیشہ بدلتا رہتا تھا... ایک دن نالے کے کنارے بیٹھے دکھائی دیتے تو دوسرے دن فاریسٹ ہاؤس کے پیچھے والی ڈھلان پر لیٹے ہوئے... مجھے دیکھ کر وہ ہمیشہ کچھ حیران سے ہو جاتے، جیسے میں کسی دوسری دنیا کا رہنے والا ہوں جو اچانک ان کے سامنے ظاہر ہو گیا ہوں۔ میں ان کا ہاتھ پکڑ کر ان کے پاس ہی بیٹھ جاتا۔ وہ اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں پڑا رہنے دیتے، پر کہتے کچھ نہیں تھے۔

ان دنوں وہ کچھ بھی نہیں کہتے تھے۔ وہ چپکے سے کہیں باہر نہ نکل جائیں، اس لیے میں ان کے ساتھ جانے لگا۔ راستے پر چلتے چلتے کبھی کبھی ان کے ہونٹ پھڑکنے لگتے، مانو وہ اپنے سے بول رہے ہوں... کچھ دنوں بعد مجھے اپنی غلطی پتا چلی... وہ اپنے سے نہیں، اپنے میں بولتے تھے، خیالوں میں گم ہو کر... جیسے زندگی کے کچھ بچے ہوئے رازوں کے سلسلے جو انھوں نے کسی سے نہیں کہے تھے، کسی ان دیکھے اسٹینوگرافر کو لکھوا رہے ہوں، میرا حریف جس کے بارے میں مجھے کچھ بھی پتا نہیں تھا، لیکن جو ان کے ساتھ چھایا کی طرح چلتا تھا۔ کبھی کبھی رستے پر چلتے ہوئے مجھے کوئی شبد سنائی دے جاتا، جیسے چوری چپکے سے ان کی آنکھ بچا کر باہر نکل آیا ہو۔ آپ نے کچھ کہا؟ میں ان سے پوچھتا۔ وہ چلتے چلتے رک جاتے، جیسے میں نے ان کی اندرونی بات چیت میں کوئی کنکر ڈالا ہو۔ وہ پھر چلنے لگتے، جب تک کوئی دوسرا شبد مچھلی سا اچھل کر اوپر نہ آ جاتا، کوئی بھولا ہوا دوست، اچانک کسی پرانے شہر کا نام، یا کبھی صرف ایک گہری آہ کی ہوک جو ان کی چھاتی میں اوپر سے نیچے تک ایک بجلی کی کڑک کی طرح چمک جاتی۔ لیکن کسی دن ایک دم صاف ستھرے، سیدھے سنائی دے جانے والے شبد — جیسے *Great Expectations*۔ میں نے تجسس سے ان کی طرف دیکھا تو بولے، "پڑھا ہے؟" میں نے کہا، "ڈکنز؟" تو ہنس کر بولے، "ڈکنز نہیں تو کیا ہارڈی... کلب کی لائبریری میں ہے... وہاں چل کر دیکھیں گے۔"

وہ ایک نرالی جگہ تھی کلب کی لائبریری۔ انگریزوں کے زمانے میں وہ جم خانہ کلب کا ایک زندہ حصہ رہی ہوگی اور وہاں ان کی بیویوں نے اپنا خالی سے گزارا ہوگا… ریٹائر ہونے کے بعد گھر لوٹنے سے پہلے وہ اپنی ذاتی کتابیں سات سمندر پار ڈھونے کے بجائے لائبریری کو بھینٹ کر جاتے ہوں گے، تبھی بہت سی کتابوں کے ٹائٹل پیج پر ان کے نام دیکھے جا سکتے تھے… مشنریوں کی تاریخ، شکاریوں کی دلچسپ کہانیاں، والٹر اسکاٹ، آر ایل اسٹیونسن، کپلنگ کے ناول… کتاب کے ٹائٹل سے ہی ہر افسر یا اس کی پتنی کی دلچسپی اور سواد کا پتا چل جاتا تھا۔ الماریوں کے بیچ خالی دیواروں پر باگھ، شیر یا چیتے کی کھالیں ٹنگی رہتی تھیں… دھول اور جھڑتے ہوئے پلستر میں سنی ہوئی ان کی کھال کسی پراچین گپھا کی تصویر کی یاد دلاتی تھی… مانو اصلی جانور مرنے کے بعد خود اپنی تصویروں میں بدل گئے ہوں…

ان دنوں میں نے کتنی ہی دوپہریں صاحب جی کے ساتھ ان کتابوں، باگھوں، شکاریوں کے بیچ گزاری تھیں۔ لائبریری میں گھستے ہی وہ ایک خاص الماری کے آگے کھڑے ہو جاتے۔ انھیں سب معلوم تھا، کون سی کتاب کس کونے میں دبکی ہے۔ ان کی چھڑی کی نوک دھول بھرے شیشوں کے بیچ گھومتی رہتی، جن کے بیچ کتابوں پر جڑے مراکو چمڑے کی پیٹھ پر سنہرے ٹائٹل مکڑی کے جالوں میں جھولتے دکھائی دیتے تھے۔ کبھی کوئی ویلز، کوئی کونریڈ ان کی چھڑی کی نوک سے باہر سرک آتا۔ وہ وہیں اسٹول پر بیٹھ کر اسے پڑھنے لگتے۔ ایک ہلکی سی مسکراہٹ ان کے چہرے پر چلی آتی، جیسے کوئی بھولا ہوا منظر سے کی جھاڑی سے نکل کر ناول کے پنے پر اتر آیا ہو۔ بھول جاتے، میں وہاں بیٹھا ہوں۔

ایک شام انھوں نے اچانک کتاب سے سر اٹھایا اور میری طرف دیکھا۔ بولے، "تم اب بھی یہاں بیٹھے ہو؟"

"آپ پڑھیے… مجھے دیر نہیں ہے۔"

"سنو… تم ایک کام کیوں نہیں کرتے؟ جب تک میں یہاں بیٹھا ہوں، تم بار میں جا کر ڈرنک لے سکتے ہو… ہو سکتا ہے، ڈاکٹر سنگھ بھی وہاں بیٹھے ہوں۔"

"آپ کو میرا یہاں بیٹھنا برا لگتا ہے؟"

ایک عجیب سی اداسی میں وہ ہنس دیے۔ "برا کیوں لگے گا! تمھیں دیکھ کر مجھے اپنا بچہ یاد آ جاتا ہے… تیا جب چھٹیوں میں آتی تھی تو یہاں بیٹھ کر اپنا کام کرتی رہتی تھی… میں بار میں بیٹھا رہا کرتا

Scanned with CamScanner

تھا۔ جب لائبریری بند ہو جاتی تھی تو ہم ساتھ گھر لوٹتے تھے۔''

''آپ تھوڑا ٹھیک ہو جایئے...'' میں نے کہا، ''ہم ان سے ملنے جا سکتے ہیں۔ بس سے صرف پانچ گھنٹے کا راستہ ہے۔''

''تیا سے؟'' ان کی آنکھیں چمکنے لگیں، جیسے انھیں میرے شبدوں پر وشواس نہ ہو رہا ہو۔ ''وہ ہمیں دیکھ کر بالکل حیران ہو جائے گی... پوچھے گی تو ہم کہیں گے، اس بار ہم کرسمس اس کے ساتھ منانے آئے ہیں۔''

لیکن دوسرے ہی لمحے ان کے چہرے پر ایک چھایا سی اتر آئی۔

''پتا نہیں، اسے برا تو نہیں لگے گا؟'' انھوں نے میری طرف ایک بچے کی طرح دیکھا، جو اپنا شک دور کرنے کے لیے بڑوں کی طرف دیکھتا ہے۔

''برا کیوں لگے گا؟''

''ہمارا اس طرح اچانک اس کے پاس پہنچ جانا؟''

''آپ کہیں تو میں انھیں پتر لکھ سکتا ہوں...''

وہ تھوڑی دیر چپ بیٹھے رہے۔ گود میں پڑی کتاب کو اٹھا کر الماری میں رکھ دیا۔ ''اچھا، دیکھیں گے۔'' پھر میری طرف دیکھا۔ ''چلیں؟''

اور ہم لائبریری سے باہر چلے آئے۔ پھاٹک کے ساتھ چیڑ کا پیڑ دکھائی دیتا تھا، جس کی پتیاں سوئیوں کی طرح تاروں کے بیچ پھنسی دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ اپنی لکڑی کے سہارے چلتے تھے، کبھی اپنا ہاتھ مجھے نہیں پکڑنے دیتے تھے۔ اپنی چھڑی کی کھٹ کھٹ اور جھاڑیوں میں جھینگروں کی تان... ایک دوسرے کی جگل بندی میں اتنا مست ہو جاتے کہ دیر تک ہمیں پتا نہ چلتا کہ ساتھ ہوتے ہوئے بھی ہم کیسے رات کی جنگلی، چپکیلی خاموشی میں صرف وہ سن رہے ہیں جس کا سمبندھ ہم سے نہیں، کسی پرانے جگت سے ہے... شاید اسی لیے صاحب جی اچانک راستے میں کھڑے ہو جاتے، جیسے لاٹھی کی نوک سے اگر ڈکنز اور ہارڈی کی رازدارانہ دنیا کو باہر نکالا جا سکتا ہے تو قدرت کی اس بات چیت کو بھی سنا جا سکتا ہے جو تاروں کے نیچے چیڑوں کی سرسراہٹ میں مسلسل بہتی رہتی تھی۔ اس بات چیت کا اور چھور کچھ بھی نہیں تھا، کبھی بھی اسے بیچ میں سنا جا سکتا تھا، پکڑا جا سکتا تھا۔

کچھ دن بیت جانے کے بعد ایک رات جب ہم کلب سے لوٹ رہے تھے، انھوں نے اچانک مجھ سے پوچھا: ''اس دوپہر تم نے جو لائبریری میں کہا تھا، کیا صرف مجھے بہلانے کے لیے کہا تھا؟''

''کس بارے میں؟ آپ کس شام کی بات کر رہے ہیں؟''

وہ کچھ چڑ سے گئے۔ ''تمھیں کچھ بھی یاد نہیں؟ تو چھوڑو!'' وہ اپنی لاٹھی کو گھماتے ہوئے تیز قدموں سے چلنے لگے۔ میں جلدی سے ان کے پاس آیا۔ ''آپ بتائیے تو... کس کی بات کر رہے ہیں آپ؟''

وہ چلتے رہے، کچھ بھی نہیں بولے۔ کچھ دیر بعد اپنے آپ ٹھہر گئے۔ ''مجھے نہیں معلوم تھا، تمھاری میموری اتنی چھوٹی سوئی ہے... میری بات چھوڑو، تمھیں اپنا کچھ یاد رہتا ہے؟''

''...کون سی بات آپ نے کہی تھی، جواب مجھے یاد نہیں آ رہی؟''

وہ کچھ دیر چپ رہے، پھر اچانک بولے، ''کیا ہم سچ مچ تیا سے ملنے جا سکتے ہیں؟''

انھیں اب بھی یاد تھا، جسے میں ہنسی سمجھ کر تقریباً بھول چکا تھا۔

''یہ تو بہت ہی اچھا رہے گا، لیکن کیا انھیں ایک چٹھی لکھ کر بتا دینا ٹھیک نہیں رہے گا؟''

''نہیں... نہیں،'' انھوں نے سر ہلایا۔ ''پہلے سے بتا دیں گے تو سرپرائز کیسا؟''

میں کچھ الجھن میں گھرا انھیں دیکھتا رہا۔ وہ اپنے ڈر کو سرپرائز کا نام دے رہے تھے... تبھی اتنے جوش میں دکھائی دے رہے تھے کہ اس سے کچھ بھی کہنا بے معنی سا جان پڑا۔

''کیا سوچ رہے ہو؟'' انھوں نے سنجیدہ سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''ٹھیک ہے... لیکن آپ اس حالت میں بس کا سفر کر لیں گے؟''

''کس حالت میں؟''

''کیا جانے سے پہلے ڈاکٹر سنگھ کو دکھانا ٹھیک نہیں ہوگا؟''

''وہ کیوں؟! ابھی ایک ہفتہ پہلے ہی تو وہ مجھے دیکھ کر گئے تھے...''

''نہیں... ان کے آنے کی ضرورت نہیں... میں خود ان سے پوچھ آؤں گا کہ آپ یاترا کر سکتے ہیں؟''

''تمھی تو کہتے تھے، پانچ چھ گھنٹے کا سفر ہے...''

Scanned with CamScanner

میں نے زیادہ بہانہ کرنا ٹھیک نہیں سمجھا۔

"ٹھیک ہے... میں پتا چلانے جاؤں گا، ڈیلکس بس کتنے بجے جاتی ہے... اس حساب سے تیاری کرلیں گے۔"

انھوں نے میری طرف ایسے دیکھا جیسے مطمئن ہونا چاہتے ہیں کہ میں انھیں بہلا تو نہیں رہا۔ بہت بار سنا تھا کہ بڑھاپے میں لوگ بچے سے ہو جاتے ہیں، لیکن اس شہر کے بیچ سڑک پر مہرا صاحب سے بات کرتے ہوئے جان پڑا کہ بچپن اور بڑھاپے سے پرے بھی ایک اسٹیشن ہوتا ہے جہاں انسان عمر کا کھونٹا چھوڑ کر سب اسٹیج ایک ساتھ پار کرتا جاتا ہے، آگے پیچھے کی دشاؤں کا کوئی نہیں سوچتا... کوئی بھی قدم کہیں بھی پڑ سکتا ہے۔ پتا بھی نہیں چلتا کس لمحے وہ کس عمر کی چٹان پر کھڑے ہو کر اپنی دنیا کو دیکھ رہے ہیں۔

اور وہ دنیا بھی ایک جگہ پر رکی نہیں رہتی۔ کلب میں بیٹھے ہوئے جب میں صاحب جی کو کتاب میں کھوئے ہوئے دیکھتا تھا تو لگتا تھا، یہ وہ دنیا نہیں جو بستر پر پڑے انھیں خالی آنکھوں سے چھت پر دکھائی دیتی ہے... اور وہ اس سے بھی الگ ہے جو اب میرے ساتھ سڑک پر چلتے ہوئے تاروں کے جال کے نیچے کھڈ میں گرتے پانی کے جھرنے اور جھینگروں کو سنتے ہوئے دکھائی دیتی ہے۔ کیا کبھی وہ سوچتے ہیں کہ ایک دنیا وہ بھی ہے جہاں میں ان کے ساتھ ہوں؟

ضرور سوچتے ہوں گے، کیونکہ اس رات اپنے کمرے کے دروازے پر پہنچ کر وہ ایک دم بھیتر نہیں چلے گئے... مجھ سے کہا، کیا میں ان کے ساتھ کچھ دیر بیٹھ سکتا ہوں۔ "تمھیں نیند تو نہیں آ رہی؟"

لیکن وہ کوٹھری میں بھی نہیں گئے۔ جالی دار ریلنگ سے گھرے برآمدے میں اپنی آرام کرسی پر بیٹھ گئے۔ میں ان کے سامنے تھا، جہاں سے مرلی دھر کے کوارٹر کی روشنی جھاڑیوں پر آ رہی تھی۔ نہ کوئی ڈیسک، نہ میز، نہ رجسٹر، کچھ بھی ایسا نہیں جو گھر کے پرانے دنوں کی یاد دلا سکے، جیسے جنگل کے بیچ کسی پرانے ریسٹ ہاؤس کے برآمدے میں بیٹھے ہوں۔ اندھیرا پورا نہیں تھا، تاروں کے پھیکے اجالے میں سوچا جن استھل کھلا سا پڑا تھا، ایک جنگلی گندھ سی ہوا میں گھل رہی تھی۔ میرے اپنے کمرے کا چھجا کھڑکی کی روشنی میں کہیں بیچ رات میں ڈولتا سا جان پڑتا تھا۔ مجھے یاد آیا، مسز مہرا اپنے

آخری دنوں میں ای برآمدے میں بیٹھی رہا کرتی تھیں اور میں اپنی کھڑکی سے دیکھا کرتا تھا۔

''تمھیں سردی لگ رہی ہو تو بھیتر بیٹھتے ہیں۔''

''نہیں، میں ٹھیک ہوں، لیکن آپ؟''

انھوں نے کچھ نہیں کہا۔ ٹھنڈ سے دور وہ کسی اور خیال میں ڈوبے تھے۔ ان کے ساتھ چپ رہنے کا مطلب چپ رہنا ہی تھا، جو مجھے اچھا لگتا تھا۔ زبردستی نہیں تھی کہ ساتھ بیٹھنے کا مطلب ایک دوسرے سے بولنا ہی ہو۔ کبھی کبھی تو ہمیں یاد بھی نہیں رہتا تھا کہ ہم چپ بیٹھے ہیں۔ مجھے لگتا ہے، جب دو لوگ بہت دنوں تک ساتھ رہتے ہیں تو اکثر ایسا بھرم ہوتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کو سن رہے ہیں، حالانکہ ان میں سے بول کوئی بھی نہیں رہا ہوتا۔

میں نے ان کے ہاتھ کو دھیرے سے چھو کر کہا: ''کچھ مجھ سے کہنا ہے آپ کو؟''

انھوں نے میری اور دیکھ، سر ہلایا... پھر جیسے کچھ یاد آیا۔ ''کیا وہ سچ مچ آدمیوں کا ماس کھاتے تھے؟''

''کون؟'' تعجب سے میں نے انھیں دیکھا۔

''اس دن تم جو کتاب دکھا رہے تھے... میکسیکو یا کون سی جگہ تھی؟ میں سوچ رہا ہوں، ان کے بارے میں... تم نے بتایا تھا کہ جس آدمی کی بلی دیتے تھے وہ ان کا سب سے پیارا آدمی ہوتا تھا... یہ ٹھیک بھی تھا — ہم دیوتا کو وہی تحفہ دیتے ہیں جو ہمارے بالکل پاس کا ہوتا ہے، جس کے بنا ہم رہ نہیں سکتے۔ وہ بھی کیسی موت، جس کے بعد ہمیں اپنا جیون دوبھر نہ جان پڑے۔ وہ کتاب ہمارے کلب کی لائبریری میں ہونی چاہیے۔''

وہ کچھ دیر چپ رہے۔ برآمدے کی جھری سے ہوا آتی تھی تو پودے کپکپانے لگتے تھے۔ لیکن دور دیوداروں کے پیڑ ایک لائن میں بالکل ساکت سے دکھائی دیتے تھے، جیسے چلتی ہوا انھیں چھوئے بنا ان کے اوپر سے نکل جاتی ہو، اور وہ بالکل بے حرکت سے کھڑے تھے۔

''ایک بات پوچھوں...'' وہ اچانک بولے۔ ''ایسی کتابیں پڑھ کر تم کچھ سیکھتے ہو؟''

''کس کے بارے میں؟''

''اپنے بارے میں، اور کس کے بارے میں! تم سوچتے ہو، جو لوگ ہزاروں سال پہلے جیتے

تھے ان کے رسم و رواج ہمارے اندر زندہ نہیں ہیں؟''

''آپ کیا سوچتے ہیں؟''

''مجھے لگتا ہے... ہم اب بھی لوگوں کو بلی پر چڑھاتے ہیں... حالانکہ ان کا گوشت نہیں کھاتے!''

ایک جھرجھری سی بھیتر دوڑ گئی۔ وہ کیسی ہانک رہے ہیں۔ کہاں ازٹک (Aztec)، کہاں یہ پہاڑی قصبہ — ان دونوں کے بیچ کون سا رشتہ یہ ڈھونڈ رہے تھے؟ کون سا کیڑا ان کے دماغ میں رینگ رہا ہے جو انھیں چین نہیں لینے دیتا؟

''آپ کیا سوچتے ہیں،'' میں نے دھیرے سے کہا، ''آدمی کے مزاج میں کوئی بدلاؤ نہیں ہوا؟ ... ہزاروں سال پہلے کے لوگ اور آج جو ہم ہیں — ایک جیسے ہیں؟''

وہ چپ بیٹھے رہے، سر ہلایا، میری طرف دیکھا۔

''تم بتاؤ... تم تو بہت پڑھتے ہو، تمھیں اپنے میں کوئی فرق دکھائی دیتا ہے؟''

''اپنے میں؟'' میں نے اچرج سے انھیں دیکھا۔ ''میں نے سوچا، آپ اتہاس کی بات کر رہے ہیں۔''

وہ ہنسنے لگے۔

''اپنے اتہاس کے بارے میں سوچو... تمھیں کیا لگتا ہے، تم وہی ہو جیسے... جیسے تب تھے جب یونیورسٹی میں تھے، یا بچپن میں، جب ماں باپ زندہ تھے؟''

کیا آدمی خود اپنے بیتے ہوئے کے بارے میں طے کر سکتا ہے، وہ کیا تھا، اب کیا ہے؟ جیسے ہم بچپن میں کواڑ پر پنسل کا نشان لگا کر اپنی لمبائی ناپتے تھے... ایک دن جب ہم سچ مچ بڑے ہو جاتے ہیں تو سوکھی لکڑی پر بچپن کے وہ نشان کتنے بے معنی جان پڑتے ہیں۔

''جانتے ہو، جب تم کبھی مجھے وہ پڑھ کر سناتے ہو جو میں تمھارے سامنے کہتا ہوں، تو مجھے ہر بار لگتا ہے کہ میں وہ آدمی نہیں جس پر یہ سب کچھ بیتا ہے... مجھے لگتا ہے، جو لوگ اپنی جیونی لکھتے ہوں گے انھیں بھی کچھ ایسا شک ہوتا ہوگا۔''

''کیسا شک؟'' میں نے ان کی اور دیکھا۔ ان کے پیچھے رات کا اندھیرا تھا، جہاں اڑتے ہوئے جگنوؤں کی پھسلتی ہوئی بندیاں دکھائی دے جاتی تھیں۔

''اپنے پر... کہ وہ ایک ثابت چیز ہے، یا الگ الگ ٹکڑوں سے جڑی ہوئی کوئی چیز؟ میرے ایک دوست تھے، جن کو کبھی وشواس نہیں ہوتا تھا کہ جو آدمی شادی کرتا ہے، وہ وہی آدمی ہوتا ہے جو ایک دن اچانک اپنی پتنی کو چھوڑ کر کسی دوسری عورت کے ساتھ چلا جاتا ہے... وہ کہتے تھے، وہ کوئی دوسرا آدمی ہے، حالانکہ اس کے ہاتھ پاؤں، چہرہ، آنکھ کا رنگ ایک جیسا ہی رہتا ہے... کتنے اچرج کی بات ہے نہ۔ جو آدمی اپنی پتنی سے پریم کرتا ہے، وہ اسے مار بھی سکتا ہے... اور مارنے کے بعد اچانک اسے دہشت سی ہوتی ہے کہ وہ پہلے جیسا ہی ہے، اس کے اور ہتیارے کے بیچ ایک چھوٹے سے بال کا بٹوارا بھی نہیں ہے!''

وہ بولتے جا رہے تھے، جیسے اس رات انھوں نے مجھے اسی لیے وہاں بلوایا تھا — ایک نیوٹرل جگہ پر — نہ بھیتر نہ باہر — برآمدے کی دہری پر جہاں وہ نڈر ہو کر میرے سامنے کچھ بھی کنفیس کر سکتے تھے۔

لیکن یہ کیسا کنفیشن تھا، جہاں وہ اپنے علاوہ سب کے بارے میں بول رہے تھے؟ یا شاید وہ اپنے میں ہی سب کچھ تھے، جہاں ایک ایکٹر اپنے مونولاگ میں سب کے پارٹ نبھاتا جاتا ہے... کوئی پرانا دوست، کوئی پاگل پریمی، کوئی ہتیارا پتی...

میں تھوڑا سا پیچھے ہٹ گیا، جیسے اتنے پاس سے انھیں سہہ پانا ناممکن ہو۔

''کیوں، ڈر گئے؟''

ایک عجیب سی مسکراہٹ ان کے چہرے کی جھرّیوں پر جھولنے لگی۔

''آپ نے کیا مجھے اسی لیے یہاں بلایا تھا؟''

''تمھیں...'' ایک عجیب حقارت کا بھاؤ ان کے لہجے میں چلا آیا۔ ''تم نے میرے بارے میں اتنی نوٹ بکیں بھری ہیں... یہ بتاؤ، جو انھیں پڑھے گا وہ میرے بارے میں کیا سوچے گا؟''

میں ان کی اور دیکھنے لگا۔

''ہاں، میرے... اسے میں کیسا دکھائی دوں گا؟ اگر میں جیوت نہیں رہا... تو کیسی شکل صورت اس کے دماغ میں آئے گی؟... کیا وہ کبھی سوچ پائے گا کہ یہ ایک ہتیارے کے نوٹس ہیں؟''

''آپ کیا کہہ رہے ہیں بابو جی؟''

Scanned with CamScanner

وہ چیخنے لگے... "نہیں، سچ مچ کا نہیں... وہ تو سکھیے ہوتے ہیں جن کے ہاتھ خون سے رنگے دکھائی دیتے ہیں... دیکھو، میرے ہاتھ تو ان کو بالکل صاف، دھلے ہوئے دکھائی دیں گے... کہیں کوئی داغ دھبا نہیں جو انھیں شک میں ڈال سکے..."

انھوں نے دونوں ہاتھ میرے سامنے پھیلا دیے، جیسے ان کے جسم سے الگ، کرسی کے ہتھے پر موم کی بانہوں سے کٹے پڑے تھے... اور تب انھیں دیکھتے ہوئے مجھے پہلی بار لگا جیسے انگلیاں، ہاتھ، ہتھیلیاں — ان کی شاید نجی، خفیہ، اندھیری ہوئیں ہوتی ہیں، جن کا احساس باقی جسم کو ذرا بھی نہیں ہوتا۔ وہ اپنی الگ زندگی جیتے ہیں، دیہہ کے بھیتر ہوتے ہوئے بھی دیہہ سے الگ... جیسے ان کے ہاتھ میرے سامنے پڑے تھے۔ کسی ہتیارے کے ہاتھ نہیں، بلکہ اپنے بے لوث ننگے پن میں دہکتے ہوئے... ایک ٹھنڈی سی جھرجھری مجھے ہلا گئی، جب میں نے دیکھا کہ وہ دو مردہ سے پڑے ہاتھ کسی جادوئی چمتکار سے دھیرے دھیرے اوپر اٹھ رہے ہیں، ان کے چہرے کی اور بڑھ رہے ہیں اور اپنی ہتھیلیوں میں ان کی آنکھوں کو بھینچ لیا ہے۔ وہ ساکت تھے، پر ان کا سارا جسم ہل رہا تھا، اور تب میں نے دیکھا... جسم کا وہ ہلنا ان کے رونے کے ساتھ جڑا ہے۔

وہ رو رہے تھے، رات کے سناٹے میں، اور میں پتھر سا بیٹھا تھا۔ کچھ دکھ ہوتے ہیں جن کے سامنے صرف پتھر ہوا جا سکتا ہے۔ اور تب مجھے یاد آیا (یاد بھی کس اندھیرے میں اپنی کنڈلی کھولتی ہے) کہ کبھی بہت پہلے انھوں نے کہا تھا کہ وہ تیا کی ماں کے بارے میں بتائیں گے... وہی جوان کے دورے کے دنوں میں ناول پڑھتی تھیں... کہیں وہ تو نہیں اس رات کسی ان دیکھے کونے میں آ کر برآمدے میں آ کر بیٹھ گئی تھیں، ان کا رونا سن رہی تھیں، جس کا کوئی مطلب نہیں تھا؟ کیا آنسوؤں کا باندھ تبھی ٹوٹتا ہے جب بھاگنے کے باقی راستے بند ہو جاتے ہیں؟

میں دھیرے دھیرے ان کی بانہوں کو سہلانے لگا، جو پتلی ٹہنیوں سی کانپ رہی تھیں... بوڑھے آدمی کے آنسو پتا نہیں کس خندق سے باہر آتے ہیں، آتما کی انتڑیوں کو چیرتے ہوئے، کہ یہ سوچنا ناممکن لگتا ہے کہ انھیں کسی دلاسے سے روکا جا سکتا ہے، پھر بھی میں ان کی بانہوں کو سہلاتے ہوئے کہنے لگا...

"بابو جی، دیکھیے، آپ کو یاد نہیں، کل ہم تیا سے ملنے جائیں گے... تیا کے پاس... کل صبح ہی اٹھیں گے... میں نے ڈیلکس بس کا ٹائم پتا چلا لیا ہے... صرف پانچ گھنٹے کا راستہ ہے۔ میں صبح سات بجے ہی آپ کو جگانے آ جاؤں گا.. ٹھیک ہے... اب آپ اٹھیے، سونے چلیے..."

میں بولتا جا رہا تھا، جادو منتر کی طرح یہ سادے اور رٹی جملے دہرا رہا تھا، کیونکہ ہمارے پاس صرف یہی دنیا ہے جس کا لالچ دے کر ہم اس آدمی کو اپنے کنارے سے کھینچ لیتے ہیں جو دوسرے کنارے پر اندھیری کھائی کے کگار پر کھڑا ہے...

میں نے انھیں کرسی سے اٹھایا اور ان کا ہاتھ پکڑ کر کمرے میں لے آیا۔ جب وہ بستر پر لیٹ گئے تو میں نے انھیں رضائی سے ڈھک دیا۔ پانی کا جگ، گلاس اور گھڑی ان کی تپائی پر رکھ دی۔

"لیمپ بجھا دوں؟" میں نے پوچھا۔

"ابھی رہنے دو... میں کچھ دیر ایسے ہی لیٹوں گا۔"

"پھر میں چلتا ہوں... اب آپ سو جائیے۔"

میں دروازے تک چلا آیا، لیکن دہری پر آ کر میرے پاؤں رک گئے۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ چپ چاپ تکیے پر سر رکھ کر لیٹے تھے۔ آنسوؤں کے بوندر کے بعد ایک دھلی دھلی سی تصویر ان کے چہرے پر جھلک رہی تھی۔ اچانک ان کی آنکھیں دروازے کی طرف مڑ گئیں، جیسے انھیں پہلے سے ہی معلوم تھا، میں وہاں کھڑا ہوں۔ میں ڈر سا گیا۔ شاید ہی انھوں نے مجھے کبھی اس طرح نہارا ہو۔ اچانک انھوں نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے پاس بلایا۔ میں دوبارہ ان کے بستر کے پاس آیا۔

"کچھ چاہیے؟" میں نے پوچھا۔

انھوں نے کچھ نہیں کہا، صرف دیکھتے رہے... دھیرے سے ان کے ہونٹ پھڑپھڑائے۔ میں ان کے اور پاس چلا آیا۔ سرہانے پر ان کا چہرہ تھوڑا سا اوپر اٹھ آیا۔ "میں نے اپنی ساری چیزیں پیک کر لی ہیں..." وہ جیسے کوئی چھپا بھید مجھے بتا رہے تھے۔ "تم نے؟"

"میں ابھی جا کر کرتا ہوں..."

"اپنی وہ کتابیں بھی رکھ لینا جو کلکتہ سے آئی ہیں..."

ان کے چہرے کو دیکھ کر لگا جیسے وہ کسی لمبی یاترا پر نکلنے والے ہوں۔

Scanned with CamScanner

"تم نے اس کو تو خبر نہیں کی؟"

ان کے منھ سے تیا کا نام نہیں نکلا، پر میں جان گیا وہ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ میں نے ایسے سر ہلایا جیسے میں ان کی سازش میں شامل ہوں۔

"سنو..." ان کا لہجہ اچانک بہت نرم ہو آیا۔ "وہ تمھیں دیکھ کر بہت خوش ہوگی۔"

میں مسکرایا۔

"اور آپ کو دیکھ کر نہیں؟"

انھوں نے دونوں ہاتھوں سے میرا سر نیچے جھکا لیا، ان کے کانپتے ہونٹوں سے باہر آیا... "تھینکس!" کس لیے؟ کیا میں نے ٹھیک سے سنا تھا؟ انگریزی کے وہ ہکلاتے سے ڈھائی اکشر، ہلکی سی گرمی میں نم، جو ان کے منھ سے میرے لیے پہلی بار نکلے تھے۔

تب کیا معلوم تھا کہ وہ ان کے منھ سے نکلے ہوئے آخری اکشر بھی ہوں گے۔

2.6

وہ صبح کبھی نہیں آئی جس کے انتظار میں میں اس رات مہرا صاحب سے الگ ہوا تھا۔ صرف وہ سکھ یاد ہے جس کے سرہانے ہم دونوں سر رکھ کر اپنے اپنے کمروں میں سوئے تھے۔ بیتے ہوئے سکھوں کے مقابلے میں کبھی نہ آنے والے سکھ ہمیشہ صاف اور چمکیلے دکھائی دیتے ہیں۔ ان پر سے کی دھول نہیں گرتی۔ وہ کبھی میلے نہیں پڑتے۔

وہ کافی لمبی رات رہی ہوگی، یا وہ ہمارا انتظار تھا جس نے اسے اتنا لمبا کھینچ دیا تھا؟ میں بار بار اٹھتا تھا، بتی جلا کر گھڑی دیکھتا تھا، پانی پیتا تھا، پھر سونے لگتا تھا۔ سونے اور جاگنے کے بیچ ان کا چہرہ دکھائی دیتا تھا... کہیں دور اپنے کمرے میں سو رہی ہوں گی، بنا یہ جانے کہ اگلے دن ہم ان کے دروازے پر کھڑے ہوں گے۔ ہمیں دیکھ کر وہ کیا سوچیں گی؟ نہ خبر، نہ کوئی اطلاع، پتر، فون کچھ بھی نہیں۔ کہیں میں اپنی جلدبازی میں کوئی بھاری غلطی تو نہیں کر رہا، جس کے لیے بعد میں پچھتانا پڑے... ایک سرپھرا پاگل پن؟

پر تبھی مجھے ان کا چہرہ یاد آتا... نہیں، ایک چہرہ نہیں، وہ سب چہرے جو وہ میرے پاس چھوڑ

گئی تھیں: مشتاق، فکرمند، بولتے ہوئے، چپ، چلتے ہوئے، کھلا، سرخ، دھوپ میں تپا ہوا، جب وہ ہماری ٹولی کے آگے بالٹی جھلاتی ہوئی جھرنے کی طرف جا رہی ہوتی تھیں... پر جب میں انھیں دیکھنے کے لیے کروٹ بدلتا تو مجھے ان کا چہرہ نہیں، اپنی عمر کا دوسرا کنارہ دکھائی دیتا، دھند میں چھپا ہوا، لیکن اتنا پاس جیسے اس رات وہ میرے پاس بنچ پر بیٹھی تھیں... اور ایک عجیب سی دھکدھکی میری چھاتی سے نکل رہی تھی۔ تبھی مجھے ایک دوسری کھٹکھٹاہٹ سنائی دی... میں بڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ کچھ دیر تک دم سادھے اندھیرے میں لیٹا رہا... اور جب دروازے پر پھر کھٹکھٹاہٹ ہوئی تو کوئی شک نہیں رہا۔

میں بستر سے اٹھ کر دروازے کے پاس آیا، پر اسے ایکدم کھول نہیں سکا، کچھ دیر تک بنا ہلے ڈُلے کھڑا رہا۔ ''کون ہے؟'' میں نے پوچھا... ہلکے دھکے سے دروازہ بھڑبھڑا کر کھل گیا۔

دہری پر لالٹین دکھائی دی۔ مرلی دھر کھڑا تھا۔

''صبح ہو گئی؟''

آدھی رات کو صبح؟ وہ ہکا بکا یا ہوا مجھے دیکھ رہا تھا۔

''میرے ساتھ چلیے، بابو جی!'' اس نے کہا۔

''ٹھہرو، میں ہاتھ منھ دھو کر تیار ہوتا ہوں... اتنے میں تم میرا سوٹ کیس لے کر باہر چلو۔ صاحب جی تیار ہو گئے؟''

''وہ تو چلے گئے۔'' لالٹین کی روشنی میں اس کا پیلا، پہاڑی چہرہ کسی انجان انہونی کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔

''چلے گئے... کہاں؟'' میں اس کے پاس آیا اور وہ ڈر کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا... اور تب باہر برآمدے میں آ کر میں نے دیکھا، آکاش تاروں سے بھرا تھا... صبح کا کہیں پتا نہیں تھا۔ کاٹیج کے کمرے میں ایک بتی جل رہی تھی، جہاں وہ سوتے تھے۔

''کیا ہوا مرلی دھر؟'' میں نے پوچھا۔ ''کیا وہ کمرے میں نہیں ہیں؟''

''ہیں بابو جی... لیکن ان کے بھیتر کوئی دوسرا آن بیٹھا ہے... کچھ سمجھ میں نہیں آتا، وہ کیا کہہ رہا ہے...''

میں کاٹیج کی طرف بھاگنے لگا... جیسا تھا ویسا ہی... پھولوں کی کیاریاں، بیڈمنٹن کورٹ،

Scanned with CamScanner

برآمدہ، ان کا کمرہ...... پانچ اور چیڑ کے پیڑوں سے ہوتا ہوا...

وہ آدھے بستر پر تھے، آدھے نیچے لٹک رہے تھے، جیسے اچانک کسی نے انھیں دھکا دیا ہو اور وہ گرتے گرتے سنبھل گئے ہوں... ایک آنکھ کھلی تھی، منھ کے کور سے تھوک کی ایک لائن ٹھوڑی تک بہہ آئی تھی... ایک گہری، گھنگھور آواز ان کے گلے میں سے نکل رہی تھی، جیسے ان کے بھیتر کے جنگل میں کوئی گھائل جانور بین کر رہا ہو...

میں اب تک ان کی موت سے ڈرتا ہوا آیا تھا... تب کیا معلوم تھا کہ آدمی کی اصلی یاترا موت سے پہلے شروع ہوتی ہے، جب وہ جینے کی پکی سڑک چھوڑ کر کسی انجانی پگڈنڈی کی اور مڑ جاتا ہے، جو جینے اور موت سے الگ کسی اور دشا کی طرف جاتی ہے۔

صبح ہی میں ڈاکٹر سنگھ کو ان کی کلینک سے بلا لایا تھا۔ وہ بھیتر گئے اور کچھ ہی دیر بعد باہر آ گئے۔ جسم کے بائیں طرف لقوے کا ہلکا سا حملہ ہوا تھا، جس کا اثر زبان پر بھی ہوا تھا۔ چنتا کی بات نہیں ہے۔ انھوں نے انجکشن دے دیا تھا۔ وہ سو رہے تھے۔

''بٹیا کو خبر کر دی تھی؟'' ڈاکٹر سنگھ نے میری اور دیکھا...

''نہیں، ہم تو ان کے پاس جانے والے تھے۔''

''کب؟''

''آج صبح۔''

انھوں نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''میں کلینک سے انھیں فون کر دوں گا۔ تم ان کے ساتھ رہو... شروع کے دن مشکل ہوتے ہیں، ان دنوں لاپروائی نہیں برتنی چاہیے...'' پھر کچھ حیرانی سے میری اور دیکھا۔ ''کیسے ہو گیا یہ سب؟''

''کیسے؟'' کیا پچھلے دنوں کا سلسلے وار حساب دوں تو ڈاکٹر سنگھ سمجھ پائیں گے؟ لائبریری میں، کتابوں کے بیچ، جب ڈاکٹر سنگھ کلب کی بار میں اپنی شام کی ڈرنک لے رہے ہوتے تھے، تب میں اور صاحب جی شام کے دھندلکے میں بھیتر کے کن بیابانوں کی تھاہ پانے میں لگے رہتے تھے، کیا کبھی اسے صاف ستھرے بیان میں باندھا جا سکتا ہے؟ اور وہ پچھلی رات، جب کوئی چیز بھرا بھرا کر باہر نکلی

Scanned with CamScanner

تھی جیسے لاوا اگلنے سے پہلے دھرتی کانپتی ہے اور میں ان کے ہلتے ہوئے جسم کو آنکھیں پھاڑے دیکھ رہا تھا، یہ جانے بنا کہ اب کچھ نہیں بدلا جا سکتا۔

ڈاکٹر سنگھ کے جانے کے بعد میں دیر تک ان کے بستر کے سامنے بیٹھا رہا۔ انھوں نے بولنے کی کوشش چھوڑ دی تھی، صرف ہاتھ کے اشارے سے مجھے اپنی ضرورت بتا دیتے تھے۔ کچھ دیر بعد مرلی دھر آیا، بالٹی میں گرم پانی اور کندھے پر تولیہ، ٹیلکم پاؤڈر کا ڈبہ، صابن، جیسے وہ برسوں سے اس دوسرے آدمی کے انتظار میں تھا جو مہرا صاحب کے بھیتر تھا اور اب اتنے برسوں بعد باہر آیا تھا— گونگا، بے بس، فالج زدہ، نڈھال... صاحب جی کے اس اچانک بدلاؤ کو مرلی دھر نے اسی طرح اتنے آسان طریقے سے قبول کر لیا تھا، جیسے پہاڑی لوگ قدرت کے ہونے والے بدلاؤ آندھی، ہوا، برف اور بارش— کو مان لیتے ہیں۔ اس کی آنکھوں میں یہ بیماری نہیں، جسم میں ہونے والا بدلاؤ تھا، جو اپنی لے اور رو پر چلتا ہے— اسے دیکھ کر سوگ اور اچرج بھلا کس لیے؟

''آپ ذرا باہر بیٹھیں گے؟ میں اتنے میں ان کا ہاتھ منھ صاف کر دیتا ہوں۔'' مرلی دھر ان کے کپڑے اتار رہا تھا۔ پرانے نوکروں کا اپنے مالکوں پر ویسا ہی ادھیکار ہوتا ہے، جیسا ماں کا اپنے بچے پر... ان کے سامنے کچھ چھپا نہیں ہوتا۔

میں باہر برآمدے میں آ کر بیٹھ گیا۔ نومبر کا صاف اجلا دن، مانو سردیاں آنے سے پہلے اچانک موسم ایک قدم پیچھے ہٹ کر بیتی ہوئی گرمیوں کا جائزہ لے رہا ہو۔ ہوا میں ٹھنڈک، چھلکے سی دھوپ نکل آئی تھی۔ ریذیڈنسی کورٹ کا پتھریلا فرش دن میں ایسے چمک رہا تھا جیسے پچھلی رات بارش گری ہو...

پچھلی رات؟ ابھی اسے بیتے بارہ گھنٹے ہی تو ہوئے تھے۔ کیا گھٹنائیں ہمارے سمے میں نہیں، کسی دوسرے کال لوک میں ہوتی ہیں، جہاں جلدی اور دیر کا کوئی حساب نہیں ہے؟ کیا کبھی میں سوچ سکتا تھا کہ اس گھڑی میں برآمدے میں بیٹھا ہوں گا، ان کے ساتھ بس میں نہیں، جس کی دو سیٹیں میں کل بک کروا کر آیا تھا اور جو اب خالی اس شہر کی طرف جا رہی ہوں گی جہاں ان کی بیٹیاں رہتی تھیں؟ یہ اچھا ہی ہوا کہ انھیں ہمارے آنے کی کوئی خبر نہیں تھی۔

تیا انھیں مجھ پر چھوڑ گئی تھیں، بنا یہ سوچے کہ جو آدمی ان کی ماں کی پناہ میں آیا تھا وہ ان کے

Scanned with CamScanner

باپ کے انت کی رکھوالی کیسے کر پائے گا؟ برآمدے میں بیٹھے ہوئے مجھے دھوپ میں چمکتا ہوا ان کا شہر دکھائی دیا۔ پہاڑوں کے پیروں پر بچھے ہوئے پکے گھر، ایک اسپتال، پرائمری اسکول، بس اسٹینڈ، ریل کی لائن، جو الگ دشاؤں سے آکر وہاں ختم ہو جاتی تھی۔ اوپر چڑھنے کے لیے صرف موٹر روڈ جاتی تھی، ان قصباتی نگروں کی طرف جو پہاڑ کے اوپر بسے تھے، جنگلی ناموں، جھرنوں، سیب اور آڑو کے باغیچوں کے بیچ سے گزرتی ہوئی... ہمیں جس راستے سے اتر کر ان کے پاس جانا تھا، اسی پر بس میں بیٹھ کر وہ ہمارے پاس آ رہی تھیں۔

لیکن وہ نہیں آئیں — نہ اس دن، نہ اگلے دن۔ تیسرے دن، جب ڈاکٹر سنگھ صاحب جی کو دیکھنے آئے، تب معلوم ہوا کہ وہ اسپتال کی اور سے گاؤں کی ڈسپنسری کا دورہ کرنے گئی ہیں... اسپتال میں کسی کو نہیں معلوم تھا، وہ کب لوٹیں گی۔

ان کے نہ آنے کی خبر سے ایک عجیب سی راحت محسوس ہوئی۔ صاحب جی کو اس حالت میں دیکھ کر وہ پتا نہیں کیا کر بیٹھتیں؟ ان کے سب پرانے ڈر انھیں آ گھیرتے۔ ایک میں ہی تھا جس سے وہ ان کے بارے میں پوچھ سکتی تھیں، اور میں انھیں کچھ نہیں بتا سکتا تھا۔

وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتے تھے، یہ سچ ہے۔ لیکن شاید میں اس کے قابل نہیں تھا۔ میں گواہ ضرور تھا، پر ایسا جو سچے اور وشواس کے قابل گواہوں کے جانے کے بعد بچ جاتا ہے۔ جو بچ جاتا ہے، کیا اس کی گواہی پر کوئی وشواس کر سکتا ہے؟

اور تب مجھے لگا، شاید ان کی بیماری ایک اشارہ ہے، ہونٹوں پر دبی ہوئی انگلی کا اشارہ... جس کے آگے لیے دیے کا خطرہ ختم ہو جاتا ہے۔

کیا اسی لیے وہ اتنے شانت دکھائی دیتے تھے جتنا میں نے انھیں کبھی نہیں دیکھا تھا؟ نہیں، شانت نہیں، وہ صحیح شبد نہیں ہے، شانتی میں ایک طرح کا سکون ہوتا ہے... ان کے چہرے پر ایک ٹھہراؤ سا دکھائی دیتا تھا، دو آوازوں کے بیچ ایک ٹھہراؤ، ادھ بیچ میں ٹھہری ہوئی چیز، جیسے آدھی رات کسی بیابان جگہ پر کوئی بھڑبھڑاتی بھاگتی ٹرین رک جاتی ہے، نہ اسٹیشن، نہ ٹرمنل، نہ سگنل... بھیتر سوتے ہوئے یاتریوں کو پتا بھی نہیں چلتا کہ وہ کہیں نہیں جا رہے ہیں؛ کہ اس کے آگے کہیں جانا نہیں ہے۔ اندیشہ ٹرین کے ٹھہرنے پر نہیں، اپنی یاترا کی منزل پر ہونے لگتا ہے...

میں جب ان دنوں کے بارے میں سوچتا ہوں تو ایک پردہ سا کھنچ جاتا ہے۔ بیتے ہوئے دنوں کا سلسلہ برف کے لوندے سا جما جان پڑتا ہے، پرت در پرت بڑھتا ہوا، پر اپنی جگہ سے ایک انچ بھر تہ ملتا ہوا۔ ٹھہرا ہوا، بے نہیں، بہتے ہوئے سے کا بھنور، جو اپنی گہرائی میں اتنی تیزی سے گھومتا ہے کہ سطح پر پتھرایا سا، ساکت جان پڑتا ہے۔

پرانے نوٹس کو دیکھتا ہوں تو آنکھیں نوٹ بک کے اس صفحے پر اٹک جاتی ہیں جب انھوں نے مجھے باڑھ کا قصہ سنایا تھا، جب برسوں پہلے وہ ایک قصباتی اسٹیشن میں پھنسے رہ گئے تھے۔ چڑھتے پانی کے سامنے کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اتھاہ جل میں تیرتے ہوئے پوسٹ مین شہر سے ٹیلیگرام لایا تھا... وہ بٹیا کے دنیا میں آنے کی خبر لے کر آیا تھا، جب وہ ساری دنیا سے الگ کٹے ہوئے اپنی فائلوں میں کھوئے بیٹھے تھے۔ سے بھی کیسا چکر لیتا ہے۔ آج ہم بٹیا کے آنے کا انتظار کر رہے تھے جبکہ انھیں پتا بھی نہیں تھا کہ بیچ میں کتنا پانی بہہ نکلا ہے۔

دوسرے دن جب مرلی دھر بھیتر صاحب جی کے ساتھ بیٹھا تھا اور میں باہر برآمدے میں اپنی پرانی نوٹ بکس پڑھ رہا تھا، مجھے اتا جی آتی دکھائی دیں۔ میں نے انھیں دور سے ہی پھاٹک سے نیچے اترتے دیکھ لیا تھا۔ وہ براؤن رنگ کے مخمل کی لمبی میکسی اسکرٹ پہنے تھیں۔ کالے اون کے ٹوپے سے سر ڈھا تھا، اور ہاتھ میں چھوٹی سی چھڑی تھی۔ ان کے ساتھ ان کی نیپالن نوکرانی بھی آ رہی تھی... اس کا پیلے رنگ کا چوڑی دار پاجامہ دور سے ہی چمک رہا تھا۔ اس نے اتا جی کے خالی ہاتھ کو پکڑ رکھا تھا، دوسرے ہاتھ سے اتا جی دھیرے دھیرے چھڑی ٹکاتے ہوئے آ رہی تھیں۔ اترائی ختم ہوتے ہی، جیسے ہی وہ کاٹیج کے سامنے آئے، اتا جی نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور مچاتی آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگیں۔

"کیسے ہیں اب؟" انھوں نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔ لیکن میرے جواب کا انتظار کیے بنا برآمدے کی سیڑھیاں چڑھنے لگیں۔ اوپر پہنچتے ہی وہ کرسی پر بیٹھ گئیں اور چھڑی کو جنگلے پر ٹکا دیا۔ وہ ہانپ رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد جب ان کی سانسیں ٹھیک طرح سے چلنے لگیں، تب انھوں نے آنکھیں اوپر اٹھائیں۔

"کون ہے ان کے ساتھ؟"

Scanned with CamScanner

''مرلی دھر،'' میں نے کہا۔ ''ابھی ناشتہ کر کے لیٹے ہیں۔''

''کیا لیا تھا ناشتے میں؟''

''ناشتے میں دودھ اور دلیا۔ دوپہر اور شام کو سوپ بنا دیتے ہیں۔ آپ کو ڈاکٹر سنگھ نے بتایا ہوگا؟''

وہ بولیں کچھ نہیں، دھوپ میں جھلملاتے چیڑوں کو دیکھتی رہیں۔

''کل نرنجن بابو سے پتا چلا تھا۔''

''نرنجن بابو؟'' میں نے حیرانی سے انھیں دیکھا۔ ''انھیں کیسے معلوم ہوا؟''

''ڈاکٹر سنگھ سے کلب میں ملے تھے۔ وہ یہاں نہیں آئے؟''

''نہیں، ابھی تو نہیں۔''

اپنی نیلی آنکھوں سے اماجی دھوپ میں جھلملاتے پائلر پیڑوں کی ننگی ٹہنیوں کو دیکھتی رہیں۔ کچھ دیر بعد میں نے کہا: ''آپ بھیتر چل کر انھیں دیکھنا چاہیں گی؟''

وہ کچھ دیر تک چپ چاپ بیٹھی رہیں... پھر اپنی چھڑی کے سہارے اوپر اٹھیں، میری طرف دیکھا۔

''وہ سو تو نہیں رہے؟''

''نہیں... چل کر دیکھ لیجیے۔''

وہ کچھ دیر جھجکتی سی کھڑی رہیں... پچھلی بار جب ان سے ملا تھا، تب سے بڑھاپا کتنے دھیمے قدموں سے آ کر ان کے جسم کے کونے کونے میں اپنا گھر بسا گیا تھا، انھیں شاید اس کا پتا بھی نہیں تھا۔ مجھے بھی شاید پتا نہ چلتا، اگر وہ ڈری ہوئی آنکھوں سے مجھے نہ دیکھتیں۔ ''کیا مجھے پہچان پائیں گے؟''

''کیوں نہیں... کئی بار آپ کے بارے میں پوچھتے ہیں،'' میں نے جھوٹ بولا، جو شاید بالکل جھوٹ بھی نہیں تھا: ان کی لڑکھڑاتی زبان سے جو آواز نکلتی تھی اس سے کسی بھی نام کی بے چین آواز سنائی دے سکتی تھی۔

میں نے ان کے کمرے کا دروازہ کھولا تو انھوں نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''نہیں، تم نہیں... میں اکیلے ہی انھیں دیکھوں گی۔''

میں برآمدے میں آ کر بیٹھ گیا۔ نیچے پیڑ کی چھاؤں میں اماجی کی میپالن نوکرانی جسی کی ماں

کے ساتھ بیٹھی تھی۔ دونوں کی ہنسی اور باتیں اوپر تک سنائی دیتی تھیں۔ جنسی ایک کالا سویٹر پہنے ہوئے کالی کے ساتھ بیڈمنٹن کورٹ پر دوڑ رہا تھا... کالی مطمئن ہو کر اپنی لمبی پونچھ ہلاتی ہوئی دو پیروں پر بیٹھ جاتی، پھر لپک کر چھلانگ لگا کر بھونکتے ہوئے جنسی کے پیچھے بھاگنے لگتی۔ نیپالن بھی بھی اوپر دیکھ لیتی، پھر باتوں میں مگن ہو جاتی۔

کمرے میں سناٹا تھا۔ کچھ دیر تک جب کوئی باہر نہیں آیا تو میں نے دھیرے سے دروازہ کھول کر بھیتر جھانکا۔ باہر کی دھوپ کے بعد آنکھوں کو صرف دھندلی سی شکلیں دکھائی دیں... دھیرے دھیرے صاف ہوتی ہوئی اوپر آئیں۔ مرلی دھر بستر کے پیتانے پر صاحب جی کی ٹانگوں کو دبا رہا تھا... کرسی پر اماں جی بیٹھی تھیں۔ انھوں نے مہرا صاحب کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا اور وہ کھلی، سپاٹ آنکھوں سے اماں جی کو دیکھ رہے تھے۔

میں نے دروازہ بند کیا اور الٹے پاؤں برآمدے میں لوٹ آیا۔

کچھ دیر بعد اماں جی لاٹھی ٹیکتے ہوئے باہر آئیں۔ میری اور اڑتی نگاہوں سے دیکھا، پر دھیان کہیں اور تھا، جیسے کہیں بہت دور جا کر لوٹی ہوں۔ بہت دیر تک کچھ نہیں بولیں۔

''اماں جی!'' میں نے ان کا ہاتھ پکڑا اور دھیرے سے انھیں کرسی پر بٹھا دیا۔ وہ بیٹھ گئیں لیکن ان کا دھیان ابھی بھی ٹوٹا نہیں تھا۔

''کیا ایسے ہی لیٹے رہتے ہیں؟'' انھوں نے میری اور دیکھا۔

''جی۔''

''بولتے کچھ نہیں؟''

''بولتے ہیں، پر کیا کہتے ہیں، وہ سب سمجھ میں نہیں آتا، صرف آواز سنائی دیتی ہے۔''

وہ سر پر ہاتھ رکھ کر بیٹھی رہیں۔ بیوی کی بھی کیا ایک حد ہوتی ہے جس کے آگے نہیں جایا جا سکتا؟ پھر کچھ یاد آتا ہے، وہ سر اٹھا لیتی ہیں۔

''کون کہہ سکتا تھا ان کے ساتھ ایسا ہوگا... میں ان کے گھر آؤں گی... اور وہ مجھے پہچانیں گے نہیں۔'' اماں جی نڈھال ہو کر کرسی پر بیٹھ گئیں۔ ''کیا اب بہت دیر نہیں ہو گئی؟''

''دیر؟'' میں نے انھیں دیکھا۔

Scanned with CamScanner

"تیا آئے گی تو کیا دیکھے گی..." انھوں نے ایک گہری سانس لی۔ "وہ جو اتنا بولتے تھے، ایک ایک شبد کے لیے ترس جائیں گے۔"

نہیں، یہ سچ نہیں ہے۔ میں ان سے کہنا چاہتا تھا۔ وہ اس سے مکتی پا گئے تھے جو بار بار ان کے بھیتر ایک ہول کی طرح اٹھتا تھا... کچھ بھی نہ کہہ سکنا، شبدوں کے بونڈر سے باہر چلے آنا، اس سے بہتر مکتی کیا ہو سکتی ہے؟

پر میں نے کہا نہیں۔ میں ان کی اور سے کیا کہہ سکتا تھا جو اپنی اور سے بالکل چپ ہو گئے تھے؟

"ڈاکٹر سنگھ کیا بتاتے تھے؟"

"کہتے تھے، ہلکا سا اسٹروک ہے، جو بلڈ پریشر اونچا ہو جانے سے ہوا ہے۔ کچھ دنوں تک بہت احتیاط برتنی ہوگی۔"

"تم اکیلے انھیں سنبھال لوگے؟"

"بہت سا کام مری دھر کر لیتا ہے... مجھے تو صرف ان کے پاس بیٹھنا ہوتا ہے... یہ تو میں پہلے بھی کرتا تھا۔"

وہ میری اور دیکھتی رہیں۔

"پہلے میں سوچتی تھی، تم یہاں آکر اپنی زندگی برباد کر رہے ہو... مجھے نہیں معلوم تھا، دیوان کی زندگی تمھارے ہاتھ سونپ کر مری ہے۔"

میرے ہاتھ؟ میں ان سے کہنا چاہتا تھا، کیسے پچھلے دنوں میں انھوں نے مجھے اپنے ہاتھوں میں لے لیا تھا، اس اندھیری سرنگ سے باہر لے آئے تھے جہاں سے گزرنے کی ہمت میں کبھی نہ بٹور پاتا۔ انھوں نے مجھے وہ سکھایا تھا جسے آج تک میں نوٹ بک میں ٹیپتا آیا تھا۔

ان کا ہاتھ اب میرے ہاتھ پر پڑا تھا۔ صبح کی سنہری دھوپ ان کے سفید بالوں پر گر رہی تھی۔

"اب کیا ہوگا؟" انھوں نے میری اور دیکھا۔

"تائی جی..." میں ان کا ہاتھ سہلانے لگا۔ "صرف کچھ دنوں کی بات ہے۔ وہ دھیرے دھیرے سنبھل جائیں گے۔"

"تم کبھی نہیں جانو گے... اس شہر میں میں ان کے بھروسے پر تھی... بہت سال پہلے میں

انھیں سڑک پر دیکھا تو کرتی تھی، پر ان سے بات کرنے کا حوصلہ کبھی نہیں ہوا۔ سیر کرتے وہ مجھے مل جاتے تو میں منھ موڑ کر پہاڑوں کا نظارہ دیکھنے لگتی تاکہ ان کی نظروں کا سامنا نہ کرنا پڑے۔"

وہ بھیتر لیٹے ہیں۔ کیا اماجی کی باتیں سن رہے ہیں؟ لگتا ہے، ہم کسی اور کی باتیں کر رہے ہیں، جو دو میں بٹ گیا ہے، ایک وہ جس کے بارے میں اماجی بتا رہی ہیں، دوسرا وہ جو کمرے میں لیٹا ہے... کیا اسی طرح ہر آدمی انت تک بٹا جاتا ہے؟ آخر تک پتا نہیں چلتا، اس کی اصل اور نقل کاپی کیا ہے؟

اماجی اپنے بہاؤ میں بہتی جاتی ہیں۔

"میں جب یہاں آئی تھی تو کسی کو نہیں جانتی تھی۔ اب تو عادت چھوٹ گئی۔ ان دنوں جب خالی وقت ملتا تو اپنے پیانو کے سامنے بیٹھ جاتی تھی۔ پیانو بجاتے وقت بھول جاتی تھی کہ میں اپنے دیش میں نہیں، کہیں اور ہوں۔ ایک بار ہلکی سی کھٹکھٹاہٹ ہوئی تو باہر آئی۔ دیکھا، مہرا صاحب کھڑے ہیں۔ کہنے لگے کہ میں سیر کرنے کے لیے باہر نکلا تھا کہ آپ کے ریڈیو پر بہت سندر سنگیت کی آواز سنائی دی۔ ریڈیو؟ میں ہنسنے لگی۔ انھیں بھیتر بلایا تو وہ پیانو دیکھ کر حیران ہو گئے۔ کہنے لگے، آپ بجاتی ہیں؟ پھر تو ہر تیسرے چوتھے دن وہ گھر پر آ جاتے... چپ چاپ کونے میں بیٹھ کر سنتے رہتے۔ ایک بار کہنے لگے، جب میں آپ کا پیانو سنتا ہوں تو من کے سارے چھلکے اترنے لگتے ہیں، بھیتر کچھ نکھرنے سا لگتا ہے... یہ کیسا سنگیت ہے جو آپ کے پیانو سے باہر نکلتا ہے؟... میں ہنس کر کہتی، مہرا صاحب، آپ اور کوشش کریں، مگن کر پیانو سنا کریں۔"

ایک عجیب سی ہونکار اوپر آتی ہے، دروازے کو پار کرتی ہوئی۔ باہر برآمدے میں ایک پیلے جھاگ بھرے جوار کی طرح اس کی آواز گونجنے لگتی ہے۔ گوں، گوں، گوں، گوں، گوں... جیسے جہاز کی میں پڑا کوئی زخمی پنچھی باہر آنے کے لیے تڑپ رہا ہو۔

اماجی نے اٹھنے کی کوشش کی، پر میں نے ان کے کندھے پکڑ کر بٹھا لیا۔

"آپ بیٹھیے، میں آتا ہوں۔"

بھیتر گیا تو دیکھا کہ صاحب جی بستر سے اٹھنے کی کوشش کر رہے ہیں اور مرلی دھر انھیں لٹانے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ بار بار اپنا ہاتھ چھڑا کر نیچے آنا چاہتے ہیں اور مرلی دھر انھیں واپس بستر پر کھینچ

Scanned with CamScanner

لیتا ہے...

''بابوجی...'' میں نے لگ بھگ چیختے ہوئے ان کے جھپٹتے ہوئے ہاتھوں کو پکڑ لیا اور وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑتے ہوئے مجھے دیکھنے لگے، ایک گہری شرم اور ذلت میں بھیگے ہوئے، جیسے مرلی دھر کے سامنے کوئی بھی تماشا کر سکتے تھے، پر مجھے تماش بین کی طرح وہاں نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔

وہ لیٹ گئے۔ میری طرف سے منھ موڑ لیا۔ دونوں کہنیوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔ میں وہاں سے ہٹ گیا... شرم کو کیا ایسے چھپایا جاتا ہے؟

''میرے ساتھ بچوں کی سی ضد کرتے ہیں، آپ کے آتے ہی سنبھل جاتے ہیں،'' مرلی دھر نے کہا۔

اسے شاید نہیں معلوم تھا کہ بیمار آدمی جو اپنوں کے ساتھ غصہ کر سکتا ہے وہ باہر کے آدمیوں کے ساتھ نہیں! وہاں صرف شرم اور بے بسی اور ذلت کی تپش ہے جسے چوبیس گھنٹے سہنا پڑتا ہے۔

میں نے لحاف سے انھیں ڈھک دیا اور باہر چلا آیا۔

''کیا کہہ رہے تھے؟''

''تھوڑی سی بے چینی محسوس کر رہے تھے۔ اب ٹھیک ہیں۔''

''کوئی اس طرح چلاتا ہے؟ وہ کچھ تو چاہتے تھے؟''

''کیا معلوم اماجی؟ ہم میں سے کون جان سکتا ہے، کوئی کیا چاہتا ہے؟ جان بھی لیں تو کیا ہم کچھ کر سکتے ہیں؟''

پچھلے دنوں کا غبار جیسے اچانک میرے بھیتر پھوٹ پڑا۔ میری آواز ان کے جیسی ہی ہو گئی تھی جو بھیتر تھے۔ تب مجھے پتا چلا، باہر اور بھیتر کا پردہ کتنا باریک ہے، جو کبھی بھی پھٹ سکتا ہے۔

وہ بھی آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگیں۔ نیلی آنکھوں میں دھوپ کی دو گولیاں تیر رہی تھیں۔

''میں تم سے کچھ کہنے آئی تھی۔'' ان کی آواز اب بالکل سنبھل گئی تھی۔

''کیا اماجی؟''

''جب تک تیا نہیں آتی، میں یہاں رہ جاتی ہوں۔ تمھاری مدد تو کیا کر سکتی ہوں، پر ان کے ساتھ بیٹھ تو سکتی ہوں۔ ان کے ساتھ بیٹھ کر میرا دل بھی بہل جائے گا۔ گھر میں بھی تو اکیلی پڑی رہتی ہوں۔''

Scanned with CamScanner

''جی جی... ابھی نہیں۔ کل ایک بار ڈاکٹر سنگھ دیکھنے آئیں گے تو میں آپ کو خبر کروں گا۔ ہوسکتا ہے انھیں اسپتال لے جانا پڑے۔''

''اسپتال... کیا ڈاکٹر سنگھ کہتے تھے؟''

''فی الحال نہیں... اگلے دو تین دنوں میں ان کی حالت میں کوئی فرق نہیں آیا تو شاید لے جانا پڑے۔ وہ یہاں ملٹری اسپتال کے ڈاکٹر کو جانتے ہیں۔''

ان کے چہرے پر کالی چھایا اتر آئی۔ شک، ڈر، اندیشہ، دہشت ساتھ ساتھ تر آئے۔

''تم تو کہتے تھے، لائٹ اسٹروک ہے جو بلڈ پریشر سے کبھی کبھی ہوجاتا ہے؟''

''ڈاکٹر سنگھ یہی کہتے تھے۔''

''پھر؟''

''کل ایک بار ٹیسٹ کر دیکھیں گے، اس کے بعد فیصلہ لیں گے۔''

وہ سونی آنکھوں سے سامنے دیکھنے لگیں... جہاں پہاڑوں پر تیرتے بادلوں کی چھایا اترنے لگی تھی۔

''میم صاحب، ابھی ٹھہریں گے؟''

ہم دونوں چونک گئے۔ برآمدے کے نیچے سے نیپالن نوکرانی کی آواز سنائی دی۔

''میں آتی ہوں۔''

انھوں نے اپنی چھتری کھولی اور سیڑھیاں اترنے لگیں۔ میں ان کے ساتھ گیٹ تک آیا۔ جانے کے پہلے وہ پیچھے مڑیں، میری اور دیکھا۔ وہ لمحہ بھر کو ٹھٹکیں۔ ''تیا کے آنے سے پہلے کچھ بھی مت کرنا۔ تم اسے جانتے ہو۔''

کچھ دیر تک میں انھیں اور نیپالن کو جاتا ہوا دیکھتا رہا۔

کمرے میں واپس لوٹا تو مرلی دھر پہلے سے ہی دروازے پر کھڑا تھا۔ مجھے دیکھ کر منھ پر ہاتھ رکھا۔ ''سو رہے ہیں۔ آپ بھی اپنی کوٹھری میں جا کر آرام کیجیے۔ میں ان کے پاس ہوں۔''

''کوئی ضرورت پڑے تو مجھے بلوا لینا۔ میں اپنے کمرے میں ہی رہوں گا۔''

Scanned with CamScanner

اما جی کے جانے کے بعد میں اپنی کوٹھری میں لوٹ آیا۔ پچھلی رات کی نیند، جو بیچ بیچ میں ٹوٹ جاتی تھی، اب دوبارہ سے میری پلکوں کو کھٹکھٹا رہی تھی۔ سارا شریر بھاری تھا۔ جیسا تھا ویسے ہی میں اپنے پلنگ پر لیٹ گیا۔

پہاڑی شہر کی دوپہر۔ سردیوں کی ہلکی دھوپ اور سناٹا۔ دور جنگل کے اندر سے اٹھتی ہوئی خوشبوئیں میری نیند میں راستہ بناتی ہوئی چلی آتی تھیں۔ کھلے دروازے سے جو چیلیں آکاش میں اڑتی دکھائی دیتی تھیں، وہی کسی خواب کے بھیتر آکر کالے دھبے میں چپکنے لگتی تھیں، جیسے میں کسی پرانی گھسی پٹی فلم کو دیکھ رہا ہوں، جو دکھائی دیتا ہے اسے سننے لگتا ہوں، چیلوں کی چونچوں میں پھنسی آوازوں کی کترنیں... گوں، گوں، گوں... ایک کے بعد دوسری باہر آنے کو بے چین، جیسے گدلے پانی کا تال نیند کے سوراخوں سے بہتا ہوا آ رہا ہے، بند دروازوں کے آگے چوبچے سا جمع ہو جاتا ہے... اور جب آنکھیں کھول کر پتا چلتا ہے کہ وہ اور کوئی نہیں، میری کوٹھری کا دروازہ ہے، اور جب میں پسینے سے تر بتر اسے ہڑبڑا کر کھولتا ہوں تو پیچھے ہٹ جاتا ہوں۔ آدمی نیند کے اتھلے پانی میں جو چہرہ دکھائی دیتا ہے، وہی تو ہے جسے میں جانتا ہوں، پر ایک دم پہچان نہیں پاتا۔ سر پر گول ٹوپی، خاکی رنگ کا تنگ موہری والا پاجامہ، دھول میں سنے، منھ اٹھائے پہاڑی جوتے اور ہونٹوں پر کھیلتی چالاک، چمکیلی مسکراہٹ...

''ارے ٹنکو تم؟ کیسے آئے؟'' میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

''صاحب جی کے بارے میں پتا چلا، ابھی مرلی دھر سے مل کر آ رہا ہوں۔''

''نرنجن بابو کیسے ہیں؟'' میں نے کھلے دروازے سے باہر جھانکا، مانو وہ کہیں باہر کھڑے ہوں۔

''انھوں نے ہی مجھے بھیجا ہے... وہ خود آتے، پر جانے سے پہلے انھیں بہت سے کام نپٹانے تھے۔''

''جانے سے پہلے؟'' میں نے ٹنکو کو دیکھا۔

''جی... کل صبح کی بس سے... آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔''

نرنجن بابو جا رہے ہیں۔ کیا دوپہر کے سپنوں کا سندیش اسی طرح آتا ہے، ٹنکو کے بھیس میں، جب اس کا اندیشہ دور دور تک دکھائی نہیں دیتا؟

''وہ گھر میں کب ملیں گے؟''

''گھر میں نہیں... انھیں بازار سے کچھ خریداری کرنی ہے... وہیں سے لوٹتے ہوئے کچھ دیر

Scanned with CamScanner

کلب میں ٹھہریں گے۔ آپ کو اوپر نہیں چڑھنا پڑے گا۔ وہیں آپ سے مل لیں گے۔"

ان کے چلے جانے کا جھٹکا میں ابھی تک نہیں جھیل پایا تھا۔ بے خیالی میں ٹنکو کو دیکھتا رہا۔

"ٹنکو، میرے اور مرلی کے علاوہ صاحب جی کے پاس کوئی نہیں ہے۔"

"بابو جی، آپ چلے جائیں... میں تو ان کے پاس رہوں گا ہی۔" دروازے کے پیچھے سے مرلی دھر کی آواز سنائی دی۔ وہ نہ جانے کب وہاں آ گیا تھا۔

"آپ کچھ دیر کے لیے ہو آئیں، بابو جی... جانے سے پہلے وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

2.7

کلب کی ڈھلواں چھت شام کی ڈھلتی دھوپ میں چمک رہی تھی۔ بلیرڈ ٹیبل پر جب گیندوں کی کھڑکھڑاہٹ ہوتی تو باغ کی چڑیوں کا ریلا ایک ہوائی جہاز سا اڑنے لگتا۔ پچھم کے سرخ پیلے رنگ پہاڑوں پر اتر رہے تھے، پر نیچے گھاٹی میں اندھیرا تھا۔ اسی پر سفید موم سا آدھا چاند دھیرے دھیرے اوپر اٹھ رہا تھا۔

وہیں میں بیٹھا تھا، اپنی پرانی جگہ پر، لائبریری کے پارٹیشن کے پیچھے، جہاں کبھی میں صاحب جی کے ساتھ آیا کرتا تھا۔ کلب کی آوازیں اب میرے بیچ تھیں، جبکہ ان دنوں میں ان کے بیک گراؤنڈ میں صاحب جی کو ٹامس ہارڈی اور جارج ایلیٹ کے ناول پڑھ کر سنایا کرتا تھا۔ آدھے آدھے چیپٹروں کے بعد ان کی چھڑی ہلتی دکھائی دیتی۔ "بس، یہ بند کرو، اب کوئی دوسرا پڑھو۔"

وہ اب اپنے کمرے میں تھے... بھیتر کی آوازیں سنتے ہوئے، میں یہاں دنیا کے شور کے بیچ۔ باہر کی بنچوں پر تین لوگ بیٹھے تھے، اپنے اپنے گلاسوں کے دھیان میں ڈوبے۔ بار میں ہمت سنگھ گلاسوں کو دھو رہا تھا۔ ہر گلاس کو بڑے جتن سے اپنی جھاڑن سے صاف کرتا، پھر ایک آنکھ بند کر کے دھلے ہوئے کانچ کو دیکھتا — کوئی دھبا تو نہیں رہ گیا ہے؟ ٹین کی چھت پر ٹہنیوں کی ٹھک ٹھک سنائی دیتی، تب پتا چلتا، ہوا میں کلب کا بوڑھا باغ دھیرے دھیرے ڈول رہا ہے۔

نرنجن بابو دکھائی دیے تو اچانک سب کچھ چپ سا ہو گیا۔ انھیں مجھے ڈھونڈنا نہیں پڑا۔ ہمت سنگھ کی نگاہوں سے ہی پتا چل گیا، میں کہاں بیٹھا ہوں۔ وہ تیز قدموں سے میرے پاس آئے... ہاتھ

کے تھیلوں اور پوٹلیوں کو بیچ رکھا۔

''کیا بہت دیر سے بیٹھے ہو؟''

''نہیں، ابھی کچھ دیر پہلے ہی آیا ہوں۔''

میں انھیں دیکھ رہا تھا۔ ڈاڑھی کے کچھ اور بال سفید ہو گئے تھے، گلے کے نیچے ماس کی سلوٹیں اور زیادہ پھیل گئی تھیں۔ لیکن آنکھوں میں ایک عجیب قسم کی چیونتا تھی، جیسے چیلوں کی راکھ کے بھیتر کوئی آگ کی چنگاری بچی رہ جاتی ہے۔ وہ کرسی کھسکا کر بیٹھ گئے۔ ہمت سنگھ کو اشارے سے بلایا، کچھ دیر تک اس سے بات چیت کرتے رہے۔ پھر میری اور دیکھا۔ ''آج وہسکی منگوا لیں...'' اور دوسرے لمحے بھول گئے، مجھ سے کیا کہا ہے۔ اپنا پائپ اور لائٹر نکال کر بیٹھے رہے۔ جب ہمت سنگھ دو گلاس اور آئس باکس میز پر رکھ گیا تو انھوں نے گٹا گٹ آدھا گلاس ختم کر دیا۔ ٹشو پیپر سے منھ پونچھا... ''میں تم سے معافی مانگنے آیا تھا۔''

''معافی کیسی؟'' میں نے انھیں دیکھا۔

''مجھے معلوم ہے، تم پر کیا گزر رہی ہے... پر میں آ نہیں سکتا تھا۔ معلوم بھی نہیں تھا، ایسا ہوگا۔ کیا کچھ ہوا تھا... کوئی ایسی بات جس سے انھیں شاک لگا ہو؟''

''نہیں، ایسا کچھ نہیں۔ لیکن پچھلے دنوں ان کا برتاؤ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ کبھی کبھی وہ اکیلے باہر نکل جاتے تھے۔ مرلی دھر انھیں ڈھونڈنے نکلتا تھا تو دیکھتا تھا کہ وہ کبھی کسی بنچ پر بیٹھے ہیں، یا کسی پیڑ کے نیچے سو رہے ہیں... انھیں پتا بھی نہیں چلتا تھا کہ وہ بھیتر نہیں... گھر کے باہر ہیں۔''

''کچھ تو بات ہوئی ہوگی... ایسے ہی اچانک؟''

میں ان سے کیا کہتا... کس گھڑی یا گھنٹا پر انگلی رکھ کر ٹھیک کہا جا سکتا ہے کہ آدمی کسی ایک لگی بندھی پٹری کو چھوڑ کر کب بالکل انجانی دشا میں چلنے لگتا ہے؟

دو نوجوان بلیرڈ روم سے بار میں آئے اور ہمارے سامنے کے کونے کی میز پر بیٹھ گئے۔ اتنی سردی میں بھی وہ صرف ٹی شرٹ پہنے تھے۔ ہمت سنگھ ان کی میز پر بیئر کی بوتلیں اور گلاس رکھ گیا۔

''کیا یہ سچ ہے، آپ جا رہے ہیں؟''

''سیبوں کا سیزن ختم ہو گیا... اور وہاں سے برابر چٹھیاں آتی رہتی ہیں، میں کب لوٹوں گا۔

Scanned with CamScanner

میں اب تک ٹالتا آیا تھا۔"

"آپ واپس تو آئیں گے؟"

وہ چپ اپنے گلاس کو دیکھتے رہے۔

"اتنے دنوں سے آپ دکھائی نہیں دیے تو میں سمجھا، آپ چلے گئے۔"

"چلا گیا؟" وہ ہنسنے لگے۔ گلاس اٹھا کر چھوٹا سا گھونٹ لیا۔ "ابھی کچھ دن تو یہاں رہنے کے ہوتے ہیں... جب چھوڑنے کو نہیں ہوتا۔ میں سوچتا تھا، تم کبھی آؤ گے تو دکھاؤں گا۔" ان کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ جب وہ آگے کچھ نہیں بولے تو میں نے پوچھا: "کیا دکھائیں گے؟"

"گیسٹ ہاؤس... جہاں تم ایک رات ٹھہرے تھے۔ اب وہ پہلے جیسا بیرک نہیں ہے... پورا ایک آبزرویٹری میں بدل گیا ہے۔ میں نے وہاں ٹیلی اسکوپ لگوایا ہے۔ میرے ایک دوست سے پیرس سے لائے تھے۔ بہت سال پہلے یہاں آئے تو میرے گھر کی اونچائی دیکھ کر کہا، یہ اس کے لیے سب سے اچھی جگہ ہے۔ تینچے کے، یہاں سے تو تم دن میں بھی تارے دیکھ سکتے ہو۔" انھوں نے گلاس خالی کیا، پھر جنت سنگھ کو بلایا اور جب وہ دوسرا گلاس بھر کر لایا تو انھوں نے میری اور دیکھا۔

"میں نے غلطی کی... لاجک کی جگہ مجھے ایسٹرانامی پڑھنی چاہیے تھی... جب بھی رات کو آکاش گنگا اور کہکشاں کو دیکھتا ہوں تو ان کے سامنے کانٹ اور ہیگل بالکل پھیکے جان پڑتے ہیں۔"

میں سمجھ نہیں، وہ کیا جاننا چاہ رہے ہیں... کس کے بارے میں؟ پھر یاد آیا، یہ اس کے بارے میں ہے جسے جاننے کے لیے وہ برسوں پہلے یہاں آئے تھے۔

کچھ دیر تک وہ چپ چاپ پیتے رہے۔

"مہرا صاحب کو نہیں دیکھ سکا...... اس کا افسوس رہے گا۔ اچانک یہ سب کیسے ہو گیا؟"

"نہیں، ایسا کچھ نہیں... بس ایک صبح بستر سے نہیں اٹھ سکے... جسم کے بائیں حصے پر اسٹروک ہوا ہے... بول بھی نہیں پاتے۔"

"کچھ تو ہوا ہو گا یا ایسے اچانک ہی؟"

"نہیں، ایسا کچھ بھی نہیں۔ تیا کے جانے کے بعد کچھ چپ سے رہتے تھے۔ پچھلے دنوں وہ اپنے بارے میں مجھ سے کچھ نہیں کہتے تھے... صرف ایک بار اپنی پہلی پتنی کے بارے میں بتاتے

Scanned with CamScanner

ہوئے بہت ہیجان میں آ گئے...''

زنجن بابو چپ بیٹھے تھے۔ کیا وہ میری بات سن رہے تھے؟

کچھ دیر بعد انھوں نے پائپ منھ سے نکالی اور میری طرف دیکھا۔

''ہم لوگوں میں مہرا صاحب سب سے قسمت والے ہیں۔ انھیں اب تنگ کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ پہلے سے ہی تیاری کر چکے ہیں۔''

''کیسی تیاری؟''

''اپنی دنیا سے باہر جانے کی... کتنے لوگ ایسا کر پاتے ہیں، تم بتا سکتے ہو؟''

معلوم نہیں... کیا یہ اتنا آسان ہے؟ کوئی جیتے جی نہ جینے کی تیاری کر لیتا ہے، جیسے کوئی ایک دن کسی لمبی یاترا پر نکل جائے اور گھر والے یہی سوچتے رہ جائیں کہ وہ اپنے کمرے میں لیٹا ہے...

''جانتے ہو، میں ان سے ملنے کیوں نہیں آیا؟''

ایک عجیب سی مسکراہٹ زنجن بابو کے چہرے پر چلی آتی ہے، بے چین سی کر دینے والی، جیسے زمین میں گڑی کوئی چھایا باہر نکلی ہو۔ ''مجھے دیکھ کر وہ رک جاتے... اتنی آسانی سے نہ کھو جاتے۔ انھیں وہ سب کچھ یاد آتا جو سکھ کے دنوں کے ساتھ جڑا ہوتا ہے... مجھے دیکھ کر انھیں وہ سب یاد آتا جو ادھورا پڑا رہ گیا ہے۔''

''ادھورا کیسے؟''

''سکھ کبھی پورا ہوتا ہے؟'' وہ میرے سے بھسے۔ ''میں جب یہاں آیا تھا تو میں نے سوچا تھا، میری پیچھے والی زندگی پوری ہو گئی ہے... میں سب کچھ نئے سرے سے شروع کر سکتا ہوں... نیا سرا!'' انھوں نے میری اور دیکھا۔ ''اس سے بڑا کوئی دھوکا نہیں... کوئی بھی سرا پکڑو، وہ آگے کسی اور سرے سے بندھا ہوتا ہے۔ اور تو اور، جب آدمی پیدا ہوتا ہے تو بھی وہ کوئی شروعات نہیں ہے۔ پتا نہیں اپنے ساتھ کتنے سارے پرانے کیے گزرے کی پوٹلی ساتھ لے آتا ہے...''

وہ لحہ بھر ایک ٹک مجھے دیکھتے رہے۔ سفید چٹیوں پر ایک ہیبتناک سایہ وہ اتر آیا تھا۔ پر مسکراہٹ ویسی ہی تھی، برف کے گچھے سی، ڈاڑھی میں اٹکی ہوئی۔ پہلی بار انھیں دیکھ کر ایک عجیب سا ڈر مجھے گھیرنے لگا۔ وہ گلاس کو الگ ہٹا کر آگے کھسک آئے... بالکل میرے سامنے۔ ایک پھنکارتی سی

Scanned with CamScanner

سانس مجھے چھونے لگی۔ سانس نہیں... یہ ان کی آواز تھی، دھیمی، پر کرخت، ان کے پورے جسم سے باہر نکلتی ہوئی...

''پوٹلی... جنم جنمانتر کی پوٹلی۔ جانتے ہو، ہمارے یہاں کسی آدمی کو سادھو سنیاسی بننے سے پہلے کیا کرنا پڑتا ہے؟... اسے اپنے ہونے کی پوٹلی گنگا میں بہا دینی ہوتی ہے... اس سے پہلے کہ وہ مر جائے، سے وہ سب بھلا دینا ہوتا ہے جو اب تک وہ تھا۔'' وہ چپ ہو گئے... پھر دیر سے کہا، ''یادوں کو بھلا دینا ہمارے یہاں پاپ مانا جاتا ہے... لیکن اسے ایک بڑے وردان میں بھی بدلا جا سکتا ہے... تمھارے مہرا صاحب بھی کر رہے ہیں۔ تمھیں برا لگے گا... پر میری مانو تو اس وقت انھیں اکیلا چھوڑ دو... ان پر سب سے بڑا احسان یہی ہوگا۔''

''آپ کیا کہہ رہے ہیں؟''

''تم کچھ بھی نہیں جانتے!'' انھوں نے ہمت سنگھ کو بلایا، اور ہمارے دونوں خالی گلاسوں کی اور اشارہ کیا۔ میری طرف دیکھ کر کہا، ''منع مت کرو... کل میں جا رہا ہوں، پھر پتا نہیں کب ملنا ہو۔''

''آپ لوٹیں گے تو؟''

میرے لہجے میں کچھ ایسی بے چینی تھی کہ لمحے بھر کے لیے وہ، وہی، ہنسی سی مسکراہٹ، جو ایک چھپکلی کی طرح ان کے چہرے پر آ گئی تھی، تھوڑا سا ہلی ''کیوں، مہرا صاحب تمھارے لیے کافی نہیں ہیں؟'' محبت تھی یا ہمدردی، کہنا مشکل تھا پر پرانی دوستی کی ایک بھولی ہوئی چمک تھی جو ان کی آنکھوں میں چلی آئی تھی۔ ''تمھاری طرح میں آزاد نہیں ہوں۔ جب بھی نیچے سے بلاوا آتا ہے، مجھے جانا پڑتا ہے۔ جب یہاں رہتا ہوں تو پتا بھی نہیں رہتا، وہ کہاں ہیں۔ پھر وہاں جاتا ہوں اور کچھ مہینے ان کے ساتھ رہ کر حیرانی ہوتی ہے کہ جینے کی قابلیت کیسے میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ اپنے ہی گھر میں چھپ کر رہنا پڑتا ہے کہ کہیں کوئی پرانا دوست، کوئی پروفیسر مجھ سے ملنے نہ آ جائے۔ وہ مجھ سے مل کر جب فلاسفی اور سائنس کی باتیں کرنے لگتے ہیں تو میں انھیں ایک ایڈیٹ کی طرح تکتا رہتا ہوں۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آتا، وہ کیوں اتنے جوش سے ایسے موضوعات پر مجھ سے باتیں کر رہے ہیں جن کا میرے جیون سے کوئی واسطہ نہیں!''

''آپ کا جیون نہ سہی... پر ان کا جیون جو آپ کے پاس آتے ہیں؟''

"وہ کون؟" انھوں نے ترچھی آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ "وہ میں ہی تو ہوں، جو میں بن جاتا اگر ان سے بچ کر میں یہاں نہ چلا آیا ہوتا۔"

وہ لوٹ کر نیچے کیوں جاتے ہیں؟ میں ان سے پوچھنا چاہتا تھا لیکن نہ جانے کیوں شراب کا نشہ، ان کی آنکھیں، کمرے میں لیٹنے فالج کے مارے مہرا صاحب... اور میں خود، جو ان کے سامنے بیٹھا تھا... یہ سب مجھے اس سچ سے باہر جان پڑے جو نرنجن بابو مجھ سے کہنا چاہ رہے تھے... ایک جگہ کا سچ کسی دوسری جگہ جا کر کتنا پھیکا پڑ جاتا ہے۔ وہ وہیں ٹھیک ہے جہاں سے اٹھتا ہے... ہم تک پہنچتے پہنچتے وہ جھوٹ جان پڑتا ہے۔ انھوں نے بچی ہوئی وسکی ختم کی، اپنی جیب سے کچھ باہر نکالا، بندھی ہوئی مٹھی نیلی نسوں میں چمکتی ہوئی خالی گلاس کے پاس بیٹھی تھی۔

"جانتے ہو، میں نے تمھیں یہاں کیوں بلایا تھا؟" انھوں نے مٹھی کھول دی... ایک لمبی چابی ان کی ہتھیلی کے پسینے میں لتھڑی ہوئی چمک رہی تھی۔

"یہ میری کوٹھی کی چابی ہے... تمھیں یاد ہے، ایک بار میں نے تم سے کیا کہا تھا؟"

میں انھیں دیکھتا رہا۔

"لو... اپنے پاس رکھ لو۔ یہ کام آئے گی۔"

"کس لیے؟... میں اس کا کیا کروں گا؟"

"لوگ چابی کا کیا کرتے ہیں؟..." ایک معنی خیز مسکراہٹ ان کے چہرے پر چلی آئی۔ "جب باقی سب دروازے بند ہو جائیں تو کوئی تو دروازہ ایسا ہونا چاہیے جسے تم کھول سکو۔ تم سمجھتے ہو، تم ہمیشہ مہرا صاحب کے گھر میں رہ سکتے ہو؟"

"ان کے گھر میں نہیں... ان کے پاس،" میں نے کہا۔ "وہ مجھے ان کے پاس چھوڑ گئی تھیں۔"

"وہ کون؟" انھوں نے خالی نگاہوں سے میری اور دیکھا۔ "وہ جو سمٹری میں لیٹی ہیں؟ تم ایک مری ہوئی عورت کے کہنے پر ایسے آدمی کے ساتھ رہ رہے ہو جو خود جانے والے ہیں؟" وہ ہنسنے لگے، ایک عجب تنک سی ہنسی جس کے سامنے ہمیں اپنے سب فیصلے کھوکھلے سے جان پڑتے ہیں۔

"اور جب وہ نہیں رہیں گے، تب؟"

"تب کیا؟ میں ان کے لیے نہیں آیا تھا۔ نرنجن بابو، یہ لوگ میرے کچھ بھی نہیں لگتے۔ میں

صرف اخبار میں ایک اشتہار دیکھ کر یہاں چلا آیا تھا... مجھے معلوم بھی نہیں تھا، یہ لوگ کون ہیں۔ میں جس نیند میں سے گزر رہا تھا، وہاں یہ چیز کوئی معنی بھی نہیں رکھتی تھی... میں ان کے لیے نہیں، اپنے لیے یہاں آیا تھا۔"

"اپنے لیے؟ تمھیں یہاں کس نے روک رکھا ہے؟"

"کسی نے نہیں!"

وہ مجھے گھور رہے تھے۔ وہ دیکھ رہے تھے، میں اپنے سے کتنی دور جا چکا ہوں۔

"کیسے ہو تم؟ اگر یہاں کسی کے لیے نہیں آئے تھے تو یہاں رہو، کہیں اور چلے جاؤ، کوئی فرق پڑتا ہے؟"

فرق پڑتا ہے، میں کہنا چاہتا تھا۔ وہ نہیں جو وہ مجھ سے کہہ رہے تھے، بلکہ وہ جو وہ میرے پاس چھوڑ گئی تھیں، سکھ اور عمر کشا سے الگ ایک دوسرا آنگن، جہاں پہلی بار میں نے اپنے کو نچوڑ کر تار پر ٹانگا تھا۔ کھلے آکاش تلے اپنے کو جلتے ہوئے دیکھا تھا، بوند بوند ٹپکتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہی تھیں جو آکاش تلے لیٹی تھیں۔ مردے ہمیشہ وہی رہتے ہیں، پر میں کیا وہی تھا جو تین سال پہلے یہاں آیا تھا؟ اپنے اندھیرے ماضی کو چھوڑ کر ایک دوسرے حال کی روشنی میں، جہاں سب دروازے کھلے تھے؟... میں کہیں بھی جا سکتا تھا۔ مجھے اب کسی چابی کی ضرورت نہیں تھی...

"نرنجن بابو، اب چلیں؟"

انھوں نے میری اور دیکھا۔ "ٹھہرو، ایک اور منگواتے ہیں... کل صبح تو مجھے جانا ہی ہے۔" پر جب انھوں نے میرے چہرے کو دیکھا تو زیادہ ضد نہیں کی۔ اپنا پائپ اور رومال جیب میں رکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے... اپنے لڑکھڑاتے پیروں کو سنبھالتے ہوئے بار کے کاؤنٹر پر آئے، جہاں اب ایک چھوٹی سی بھیڑ جمع ہو گئی تھی۔ ہمت سنگھ کو بلا کر بل پر دستخط کیے۔ چاروں طرف ایک بار چھپ چھپاتی آنکھوں سے دیکھا... روشنی، لوگ، شور، شراب... ان سب کو پار کر کے ہم باہر آ گئے...

باہر، جہاں رات پھیلی تھی۔ نیچے پہاڑوں کے پیروں پر چاندی کی کٹوری سی گھاٹی چمک رہی تھی۔ کچھ دور تک ہم چپ چاپ چلتے رہے... ایک دوسرے کے پیروں کو سنتے ہوئے۔ پوسٹ آفس کے پاس باج کے پیڑ کے کھوکھل میں چائے کا ڈھابہ بند پڑا تھا، جہاں میں آخری بار ان کے ساتھ بیٹھ

Scanned with CamScanner

تھا۔ صرف پاس کی کوٹھری سے روشنی کا ایک دھبا باہر جھاڑیوں پر گر رہا تھا۔ موڑ پر آ کر ان کے پیر اپنے آپ رکنے لگے۔ آکاش، تارے، ہوا میں سرسراتی جنگل کی سائیں سائیں... کچھ دیر تک ہم چپ کھڑے رہے، پھر ان کی دھیمی آواز سنائی دی۔

"جانتے ہو، میں نے کالج میں فلاسفی کو کیوں چنا تھا... بچپن میں میں نے ایک کتاب پڑھی تھی... یاد نہیں، کیا نام تھا اس کا۔ مسٹیریس یونیورس یا کچھ ایسا ہی... تم نے پڑھی ہے؟ آج جب میں وہ فلاسفی کی کتابیں بھول چکا ہوں جو میں نے یونیورسٹی میں پڑھی تھیں، وہ کتاب اب بھی یاد رہ گئی ہے... تب مجھے معلوم نہیں ہوا تھا کہ جس دنیا میں میں رہتا ہوں، اس کا اپنا گھر ہے — اور اس گھر کا اپنا گھر..." وہ ہنسنے لگے۔ "عجیب بات یہ ہے کہ جب میں نیچے اپنے شہر جاتا ہوں تو یہ سارے گھر جانے کہاں لوپ ہو جاتے ہیں اور مجھے یاد بھی نہیں رہتا ہے کہ یہ دنیا کسی حویلی کی صرف ایک منزل ہے، باقی سارے کمرے کسی اوپری منزل پر ہیں جو تبھی دکھائی دیتے ہیں جب ہم اپنی منزل سے باہر نکلتے ہیں... تم نے ایک بار مجھ سے پوچھا تھا کہ میں سب کچھ چھوڑ کر یہاں کیسے آ گیا... یہاں آ کر مجھے لگتا ہے جیسے میں اس دنیا میں رہ کر بھی اس کے باہر چلا آیا ہوں..."

کچھ دیر تک وہ کچھ نہیں بولے، پھر میری طرف مڑے۔ "مجھے نہیں معلوم تھا، اتنے برسوں بعد تم سے یہاں ملاقات ہوگی۔ کوئی ایسٹرانامر خلا میں نیا نکشتر کھوج لیتا ہے تو یہ بڑی بات مانی جاتی ہے، لیکن اس دنیا میں کھوئے ہوئے انسانوں کو دوبارہ پا لینا، اس سے بڑی مسٹری اور کیا ہو سکتی ہے؟" انھوں نے مجھے اپنے میں لپیٹ لیا... جب مجھ سے الگ ہوئے تو جلدی سے قدم بڑھاتے ہوئے چلنے لگے، جیسے انھیں اپنے جذباتی ہونے پر شرم ہو۔ انھوں نے نہ کچھ کہا، نہ پیچھے دیکھا۔

نرنجن بابو چلے گئے۔ میں دور تک انھیں جاتا دیکھتا رہا۔ کچھ دیر میں وہیں کھڑا رہا، باہر... تاروں کی پھیکی روشنی، ہوا میں ساکت کھڑے دیودار، دور ٹیلے پر اندھیرے میں چھپی مسٹری، اتا جی کی کاٹیج... ایک گھنا سناٹا چاروں طرف چھایا تھا، جس کا نہ کوئی انت تھا نہ آرمبھ... سے کی طرح اسیم۔ ایک عجیب سی حسرت ہوئی، میں بھی بھاگتا ہوا نرنجن بابو کے پیچھے چلا جاؤں، ان سے کہوں... کہوں، لیکن کیا؟... کیا یہ کہ وہ نہ جائیں؟... یا ٹھہریے، میں بھی آپ کے ساتھ آتا ہوں... یا... صرف یہ... کہ پلیز، پلیز، پلیز، کیا؟... میں کیا کہنا چاہتا تھا ان سے؟ میں نے کچھ نہیں کہا اور وہ دوسرے موڑ پر

جا کر لوپ ہو گئے۔

جب میں واپس لوٹا تو ساری کاٹیج کی بتیاں جل رہی تھیں۔ ایک بھیانک سے اندیشے نے مجھے جکڑ لیا... میں بھاگنے لگا... بیڈمنٹن کورٹ، دالان، برآمدہ، سب کو پار کرتا ہوا... تبھی مرلی دھر لالٹین لے کر میرے پاس آیا۔

"میں آپ کے پاس ہی آرہا تھا۔"

"میرا صاحب تو ٹھیک ہیں؟" میں نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"ہاں، وہ ٹھیک ہیں... بٹیا آگئیں..."

"تیا..." میں نے اس کی طرف دیکھا۔ "وہ کب آئیں؟"

"آپ کے جانے کے کچھ ہی دیر بعد... صاحب جی کے کمرے میں بیٹھی ہیں۔ آپ جا کر آرام کیجیے۔ جب وہ کہیں گی، میں آپ کو بلا بھیجوں گا۔" مرلی دھر نے کہا۔ صاحب جی کا کمرہ بند تھا۔ ان کی چپلیں دروازے کی دہری پر پڑی تھیں۔ انھیں دیکھ کر مجھے یاد آیا، یہ وہی چپلیں ہیں جنھیں پہن کر وہ پچھلی بار یہاں آئی تھیں۔

اس رات میں دیر تک اپنے کمرے میں نہیں جا سکا۔ باہر برآمدے میں بیٹھا رہا، آدھا بھیتر، آدھا باہر... جھاڑیوں سے آتی جھینگروں کی مستقل تان سنتا رہا۔ بھیتر سے کوئی بھی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی... باپ بیٹی جیسے سارا گھر مجھ پر، مرلی دھر پر چھوڑ کر کہیں چلے گئے تھے۔ یا شاید انھیں یاد بھی نہ رہا ہو کہ مرلی دھر کے علاوہ کوئی اور بھی ہے جو ان کے ساتھ رہتا آیا ہے۔ میں باہر کا آدمی جو ٹھہرا۔ پہلی بار مجھے اپنی حالت کچھ عجیب بے ڈھب سی جان پڑی، جو گھر میں رہ کر بھی گھر کا آدمی نہیں ہے... اتنی دیر سے وہ یہاں آئی ہیں، انھوں نے مجھے بلانا بھی ضروری نہیں سمجھا؟

نہیں، یہی ٹھیک ہے۔ اتنے دنوں بعد آئی ہیں تو کچھ دیر انھیں، اکیلے میں دیکھیں گی ہی، جیسے وہ ہو گئے تھے... ہو گئے تھے اور نہیں رہے تھے۔ پوچھتا چھ کے لیے تو ستے دن پڑے ہی ہیں، لیکن نہ کھینچ کی گھڑی کو تو اکیلے میں ہی سہنا پڑتا ہے۔ اس میں بھلا کون ساجھا کر سکتا ہے؟ کچھ دیر بعد اچانک مجھے روشنی کی شہتیر دکھائی دی... صاحب جی کے کمرے سے کیاریوں کی طرف جاتی ہوئی۔

Scanned with CamScanner

دروازہ آدھا کھلا ہوا تھا۔ کوئی چھایا دہری پر دکھائی دی۔ کیا یہ وہی تھیں؟ جہاں میں بیٹھا تھا وہاں سے صرف ان کی شال دکھائی دیتی تھی، شریر نہیں... لیکن جیسے وہ کھڑی تھیں، اس میں ان کی دیہہ ہی آ سکتی تھی، کوئی اور نہیں۔ دروازے کی چوکھٹ پر کھڑی ہوئی وہ اندھیرے کو دیکھ رہی تھیں۔ وہ مجھے نہیں دیکھ سکتی تھیں، کیونکہ میں ایک دوسرے اندھیرے میں بیٹھا تھا جسے برآمدے نے گھیر رکھا تھا۔

اچانک ایک چیخ سنائی دی... جیسے اپنے کو ہی سن کر چپ ہو گئی۔ بالکل چپ نہیں، اس کی گونج دور تک اس کا پیچھا کرتی رہی... اتنی پیڑا کہ جنگل کا سناٹا بھی کانپ گیا۔ جھاڑی میں چھپے، سوئے دو پنچھی اپنے پنکھوں کو پھڑپھڑاتے ہوئے اوپر اڑے... ان کے پنکھوں کی چھایا لالٹین کی روشنی میں دکھائی دی، جسے لے کر مرلی دھر اپنے کوارٹر سے باہر نکلا تھا۔ میں برآمدے کی سیڑھیاں اتر کر ادھ کھلے دروازے پر آیا تو بھی وہیں کھڑی تھیں اور جب مرلی دھر بھاگتا ہوا آیا تو بھی ان کی خاموشی ویسی ہی بنی تھی۔ وہ ہم دونوں کو دیکھ رہی تھیں...

"بابو جی چلے گئے؟ میرے آنے کے پہلے ہی؟"

"کیوں۔ بھیتر نہیں ہیں؟" مرلی دھر اپنی لالٹین اٹھا کر ان کے چہرے تک لے آیا۔

کیا وہ تیا تھیں، یا صرف ان کا چہرہ لیمپ کی چکا چوند میں ہی بدل گیا تھا؟ لیکن ان کی آواز میں کوئی فرق نہیں آیا تھا، وہ ویسی ہی شانت تھی۔

اس بار میں اپنے کو نہیں روک سکا... انھیں دروازے سے دھکیل کر بھیتر گیا۔ وہ پلنگ پر اوندھے لیٹے تھے... ایک ہاتھ پلنگ سے نیچے لٹک رہا تھا۔ پلکیں کھلی تھیں، لیکن پتلیاں ٹھہری ہوئی تھیں۔

وہ کہیں نہیں گئے تھے... وہ بھیتر ہی تھے، ایک ایسی جگہ چھپ گئے تھے جہاں سے اب کوئی انھیں ڈھونڈ کر اپنے ساتھ نہیں لا سکتا تھا۔

❁❁❁

3

3.1

میں نے کہا: ”وہاں نہیں، یہاں دیکھیے... گیلے میں تو صرف راکھ ہاتھ میں چپک جائے گی۔“

ان کی انگلیاں جھجکتے ہوئے بھٹک رہی تھیں، ادھ جلی لکڑیوں کے بیچ۔ راکھ کالی پڑ گئی تھی۔ کہیں کہیں پانی کے چوبچے جمع ہو گئے تھے۔ پچھلی رات بارش ہوئی تھی۔ دراصل ہلکی سی بوندا باندی تو تبھی شروع ہو گئی تھی جب ان کی دیہہ کو لکڑیوں سے دبا رہے تھے، اوپر نیچے سینڈوچ کی طرح، تا کہ کوئی انگ ایسا نہ چھوٹ پائے جہاں آگ کی لپٹیں نہ پہنچ سکیں۔ دھند اتنی تھی کہ لکڑیوں سے اٹھتا دھواں صرف ایک کالی لکیر سا دکھائی دیتا تھا۔ آگ کی اندھی انگلیاں ان کے جسم پر پھسلتی ہوئی جہاں بھی جاتی تھیں وہاں ایک بلبلاتی سی لپٹ اوپر اٹھ جاتی تھی: ہم سب کو بھونچک سا چھوڑ کر، ان کی دیہہ کے کسی اور انگ میں اپنا ٹھور ڈھونڈنے لگتی تھی... کیا یہ ان کا ہاتھ ہے جسے میں سہلاتا تھا؟ یا آنکھیں جو ہر شام میرے آنے پر نوبتی ہوئی اوپر اٹھتی تھیں؟... کیا وہ الگ سے ان کے شریر کو جلتا ہوا دیکھ سکتی ہیں؟ ہمیں دیکھ سکتی ہیں، جو دس فٹ کے فاصلے پر ان کی جلتی دیہہ کو دیکھ رہے تھے؟

کتنا ٹھیک نام دیا تھا کسی نے بیابان کے بیچ اس سفید، سپاٹ زمین کے ٹکڑے کو... موٹر روڈ کے نیچے وہ کھلی ہتھیلی سا لیٹا تھا، جیسے لینڈ سلائیڈ کے کارن کوئی پہاڑی چٹان لڑھکتے ہوئے ادھر میں اٹک گئی ہو۔ دونوں طرف لمبی قطار میں سفید پتھروں کے ٹیلے کھڑے رہتے تھے۔ کہتے ہیں، سینکڑوں سال پہلے بن باسی اس جگہ پر اپنے دیوتا کو خوش کرنے بلی دینے آتے تھے... اب وہ سنسکار کے لیے انھی چٹانوں پر مُردوں کو لٹایا جاتا تھا۔ تبھی سے اس کا نام 'مُردوں کا ٹیلا' پڑ گیا تھا... آکاش اور دھرتی کے بیچ شمشان بھومی، پہلے بلی کے لیے دیوتا آکاش سے نیچے اترتے تھے، اب مردہ جسموں کی لپٹوں سے اٹھتا ہوا دھواں سیدھا دیولوک کو جاتا تھا۔

پر اس شام وہاں دھند کے علاوہ کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا، صرف سلگتی ہوئی لکڑیوں سے لپٹاتی لپٹوں میں آس پاس سمٹے ہوئے چہرے دکھائی دے جاتے تھے... ماما جی، ڈاکٹر سنگھ، مرلی

Scanned with CamScanner

دم... تیا پروہت جی کے پاس بیٹھی تھیں۔ سر پر پلو تھا اور چہرہ ایک سوکھی سی جھلسن میں تپ رہا تھا۔ وہ سونی آنکھوں سے اٹھتی ہوئی لپٹوں کو دیکھ رہی تھیں —— دھند اور دھویں میں چمکتی شکلیں۔ اور تب مجھے عجیب سا خیال آیا۔ آدمی جیتا ایک جگہ پر ہے لیکن مرنے کے بعد وہ ہر آدمی کے بھیتر اپنی جگہ بنا لیتا ہے۔ اس کا ہونا دھندلا پڑتا جاتا ہے؛ اس کا نہ ہونا اجلا ہوتا جاتا ہے، تتنا اجلا اور صاف لگتا ہے کہ وہ ہم سب کے بیچ بیٹھا ہے، ایک جیسا نہیں، بلکہ الگ الگ۔ آگ میں جلنے والی لاش ایک ہی رہتی ہے، لیکن ہم میں سے ہر کوئی اپنے اپنے صاحب جی کو اس میں جلتا ہوا دیکھ رہا تھا... جتنا ہی وہ تل تل بھسم ہوتے جاتے تھے... ان کے ناخن، ان کے بال، ان کا ماس، ان کا ماتھا... اتنے ہی وہ ہمارے بھیتر مکمل ہوتے جاتے تھے۔

لکڑیاں مکمل رکھ کر کے جلنے لگی تھیں۔ جب کبھی اوپر اٹھتا ہوا دھواں بہت گاڑھا ہو جاتا تو اگن کے سامنے بیٹھے پروہت جی چوڑے چاندی کے چپلے میں چمچ ڈال کر گھی کا سفید لوندا باہر نکالتے اور دھندلاتی لکڑیوں پر ڈال دیتے۔ بجھتی ہوئی آگ پھر سے دھو دھو کرتی جلنے لگتی۔ کبھی کوئی تڑ تڑی آواز اچانک آگ کے اندر سے آتی سنائی دیتی۔ ایک پھول سی چنگاری دھند اور دھویں کو چھیدتی ہوئی باہر آتی اور تب ایسا جان پڑتا جیسے ان کے استھی پنجر سے کوئی بے چین، پھڑ پھڑاتی سی چیز اپنے کو مکت کرا نے باہر نکلی ہے۔ آدمی مرنے کے بعد دو بار مکت ہوتا ہے، پہلی بار دوسروں سے، دوسری بار اپنے آپ سے... میرا صاحب اپنے استھی پنجر سے اس طرح باہر نکل آئے تھے جیسے کوئی آدمی اپنے جلتے گھر سے باہر نکل آتا ہے، ہلکا، مکت، بدحواس... اور تب مجھے یاد آیا، کیوں مسز مہرا دفن ہونے سے پہلے تھوڑا سا اگن کا لمس چاہتی تھیں؛ وہ شاید جاننا چاہتی تھیں کہ ماس ہڈیوں کی ٹھونٹھ کٹھڑی کے کسی کونے میں جینے کی حسرت تو نہیں بچی رہ گئی ہے... یہ حسرت ہی تو تھی جو ان کی کھلکھلاتی ہنسی میں باہر چھلکتی تھی۔

اگر وہ آج ہمارے ساتھ یہاں بیٹھی ہوتیں؟ مجھ سے نہ پوچھتیں، کہاں گئے وہ جنھیں میں تمھارے سپرد چھوڑ گئی تھی؟ تمھیں میں نے اسی لیے تو بلایا تھا... کیا اس دن کے لیے؟ یہ دن دیکھنے کے لیے؟ کیا وہ صاحب جی کو دیکھ سکتی تھیں، پر مجھے نہیں بتا سکتی تھیں، صرف مجھ پر ہنس سکتی تھیں، جیسے نیچے تابوت میں جاتے ہوئے وہ ہنسی تھیں... یکایک برسوں پرانے دبے ہوئے آنسو، جو ان کے جانے

Scanned with CamScanner

کے بعد رکے رہے تھے، وہ اب یکایک امنڈتے ہوئے چلے آئے تھے۔ اور تب میں جان نہیں پایا تھا کہ وہ ان کے لیے تھے جنھوں نے مجھے اپنے گھر بلایا تھا، یا ان کے لیے جو دس فٹ کی دوری پر گیلی لکڑیوں کے بھیتر سے اڑتے دھوئیں میں چلے جا رہے تھے، آس پاس کی نیلی دھند میں گھلتے جا رہے تھے... دھندلی آنکھوں کے سامنے مجھے سب کچھ ایک بے انت خلا میں ڈبڈباتا سا دکھائی دے رہا تھا... لوگ، پہاڑیاں، دھند، ماس، ہڈیاں... اور تب اچانک لگا جیسے کوئی ان سب کے ساتھ مجھے زور زور سے جھنجھوڑ رہا ہے۔

"اٹھیے... بارش شروع ہو گئی ہے۔"

بارش کی بوندوں کے بیچ تیا کا بھیگا، چمکتا چہرہ دکھائی دیا... چھاتا لیے اما جی، مرلی دھر، چنبی، چوں چوں کرتی ہوئی پونچھ دبائے کالی۔

ہم سب بھاگتے ہوئے شیڈ کے نیچے چلے آئے۔ صرف پروہت جی اب بھی چھاتا کھول کر دھندواتی لکڑیوں کے آگے بیٹھے تھے، اور ان کے ساتھ تیا — خاموش آنکھوں سے اڑتے دھوئیں کو تکتی ہوئی۔

"کیا وہ اب بھی جل رہے ہیں؟" اما جی نے مجھے دیکھا۔

میں ایکدم سمجھ نہیں سکا، وہ کس کے بارے میں پوچھ رہی ہیں۔ وہ شاید اپنے سے بول رہی تھیں۔ انھوں نے براؤن اون کی کیپ پہن رکھی تھی جس کا رنگ پانی میں چھوٹ گیا تھا، جس سے دو کالی دھاریاں ان کی کنپٹیوں پر بہہ رہی تھیں۔ وہ بہت بے چین سی دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ شیڈ کے نیچے چھاتا کھول کر بیٹھی تھیں، جس کی سینکوں سے بہتا بارش کا پانی بوند بوند نیچے ٹپک رہا تھا۔

مجھے دھندلا سا خیال آیا کہ اگر صاحب جی کا بیٹا ہوتا تو اسے وہاں بیٹھنا چاہیے تھا جہاں تیا پروہت جی کے ساتھ بیٹھی ہے۔ آگ کے سامنے کانپتی دو دھندلی پرچھائیاں — بارش میں بھیگتی ہوئی... اور تب اچانک لکڑیوں کے بیچ آگ کی لپٹیں ایک ساتھ اوپر لپکنے لگیں... شاید پروہت جی نے تھالی میں بچا کھچا سارا گھی لکڑیوں پر انڈیل دیا تھا اور اب وہ آزاد نشے کا جشن مناتی، مدماتی جوار میں لپلپاتی ہوئی اندھیرے کو چیر رہی تھیں۔ کیسی تھی یہ آواز، جو آگ کے نیچے کسی اندھیرے گڑھے سے باہر آ رہی تھی، ہر لپٹ کی نوک پر الگ الگ ٹوٹ پر کراہتی ہوئی، دوسری دنیا کے ایک بلاوے جیسی؟

Scanned with CamScanner

"تم نے کچھ سنا؟ کیا ہے یہ؟" اما جی نے میرا ہاتھ پکڑ کر پھٹی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ ڈاکٹر سنگھ کچھ نہیں بولے، صرف رومال سے اپنے چشمے کے شیشوں کو پونچھا اور چتا کے پیچھے بادلوں میں ڈوبتے سورج کی پیلی، نیولی روشنی کو دیکھتے رہے، جس کی مہین تھکی ہوئی چھایا پہاڑیوں پر گر رہی تھی...

کیا تھا جو جلتی لکڑیوں کی راکھ سے نکل کر باہر آیا تھا؟... کوئی اشارہ جو مرنے والا آخری بار اپنے زندوں کے لیے چھوڑ جاتا ہے، دنیا میں ہونے کا اپنا کوئی نشان، کوئی بیتا ہوا کبھی دن، کوئی بچا ہوا دکھ، کوئی چھوٹا ہوا پچھتاوا، جسے آخری بار لپٹیں اپنے میں سمیٹ کر گم ہو جاتی ہیں، راکھ ہو جاتی ہیں؟ پتا بھی نہیں رہتا، یہ آدمی کبھی دنیا میں آیا تھا۔ آدمی خالی ہاتھ آتا ہے، لیکن جاتا ہے تو اپنے ساتھ سب کچھ لے جاتا ہے۔

دوسرے دن جو بچا رہ گیا تھا، اسے ہی ہم اس راکھ میں کھوج رہے تھے۔

استھیوں کو، جو اگتے سورج کو چھو کر 'پھول' بن گئی تھیں۔ صبح ہی انھوں نے میری کوٹھری کا دروازہ کھٹکھٹایا تھا۔ پتا نہیں وہ کتنی دیر سے باہر کھڑی تھیں... میں نے ہڑبڑا کر سانکل کھولی تو دیکھا، دہری پر تنہا کھڑی ہیں... سفید سوتی ساڑی میں انھیں پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ نہا کر آئی تھیں، بال کندھوں پر گرے تھے۔ ہاتھ میں ایک لال تھیلی تھی۔

"میرے ساتھ چلیں گے؟" انھوں نے دھیرے سے کہا۔

"کس لیے؟"

"ان کی استھیاں چننی تھیں۔ پروہت جی نے صبح ہی آنے کے لیے کہا تھا۔"

میری الجھن صرف کچھ لمحوں کے لیے ہی تھی۔ "آپ بیٹھیے... میں ابھی آتا ہوں۔"

مجھے اپنے کپڑوں پر شرم آ رہی تھی۔ کل رات شمشان بھومی سے آ کر میں سیدھا بستر پر پڑ گیا تھا۔

"میں باہر برآمدے میں بیٹھی ہوں۔"

کچھ دیر بعد جب میں باہر آیا تو صبح کا اندھیرا چھٹنے لگا تھا۔ کل کے بادل اب سفید پھاہوں سے، ہلکی سرخی لیے آکاش میں بکھرے تھے۔

وہ بیٹھی نہیں تھیں۔ برآمدے کے کھمبے سے سٹ کر کھڑی تھیں۔ میرے دروازے بند کر دینے کی آواز سن کر پیچھے مڑیں... میری اور دیکھا، جیسے کچھ پرکھ رہی ہوں جو لمبے وقفے کے بعد دکھائی دیتا ہے۔ "چلیں؟"

اس بار پکی سڑک چھوڑ کر ہم نے چھوٹی سی پگڈنڈی پکڑ لی جو ایک طرح کا شارٹ کٹ لے کر گول میدان کی طرف چلی جاتی تھی۔ پگڈنڈی اتنی تنگ تھی کہ ہم دونوں ایک ساتھ نہیں چل سکتے تھے... وہ ہمیشہ کی طرح لمبا ڈگ بھرتی ہوئی چلی جا رہی تھیں، جیسا میں انھیں جھرنے کی طرف جاتے ہوئے دیکھتا تھا۔ سفید اسنیکر زکی جگہ انھوں نے چپلیں پہن رکھی تھیں۔ چلتے ہوئے انھوں نے بے خیالی میں بکھرے بالوں کو سمیٹ کر ہلکے جوڑے میں باندھ لیا تھا۔ ایک بار انھوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تھا، پھر نپے تلے قدموں سے چلنے لگی تھیں۔ پچھلی شام بارش سے پگڈنڈی پر جگہ جگہ پانی کے چوبچے جمع ہو گئے تھے... جہاں مٹی گیلی تھی وہاں پاؤں بار بار پھسلتے تھے۔

کچھ ہی دیر میں پگڈنڈی سوکھی اٹھان پر آ کر پکی سڑک سے مل گئی۔ دور سے ہی شمشان گھاٹ دکھائی دیا... صبح کی ہلکی دھوپ میں سفید پتھروں کی چٹانیں چمک رہی تھیں، جہاں ہم کل شام انھیں کندھوں پر رکھ کر لائے تھے۔ کل جو جگہ گھر سے اتنی دور جان پڑتی تھی، آج وہاں اتنی جلدی پہنچ جائیں گے کہ ایک لمحے کے لیے بھرم ہوا کہ ہم غلطی سے کسی دوسری جگہ پر تو نہیں آ گئے؟ کبھی کبھی اوپر موٹر روڈ سے کوئی بس یا لاری بھڑبھڑاتی ہوئی نکل جاتی، تب خیال آتا کہ ہم کسی انجانے اجاڑ بیابان جنگل میں نہ ہو کر اپنے ہی شہر کے کنارے پر ہیں۔

وہ وہیں بیٹھ گئی تھیں جہاں پچھلی شام ان کی دیہہ کو سنایا تھا۔ وہ کچھ بھی نہیں کر رہی تھیں، ساکت بیٹھی تھیں۔ جب میں ان کے پاس پہنچا تو انھوں نے سر اٹھایا۔ وہ جو پوچھنا چاہتی تھیں، مجھے معلوم تھا۔ میں پہلے بھی یہ کر چکا تھا۔ مجھے خوشی ہوئی کہ میں گھر سے نہا کر آیا تھا، پھر بھی شمشان گھاٹ سے کچھ دور روڈ کے پاس نل کی ٹونٹی سے اپنے ہاتھ دھوئے، انھیں بھی یہی کرنے کو کہا... جلدی میں اپنا رومال لانا بھول گیا تھا، اس لیے انھوں نے اپنے آنچل کا ایک سرا مجھے پکڑا دیا، جس سے وہ اپنے ہاتھ پونچھ رہی تھیں۔ اس سے میں نے اپنے ہاتھ بھی پونچھے... ادھ جلی لکڑیوں کو ڈھیرے ڈھیرے راکھ کے ڈھیر سے الگ کیا۔ اور پھر اپنے ہاتھوں سے انھیں ٹٹولنے لگا جن کے بچے ہوئے حصے اپنے ساتھ لینے آئے تھے...

"یہاں نہیں، یہاں دیکھیے،" میں نے کہا۔ "گیلے میں تو صرف راکھ ہاتھ سے چپک جائے گی۔"

راکھ اب بھی گرم تھی، بارش کے کارن اس میں ایک نم، گنگنی سی حرارت پھیل گئی تھی... جب بھی

کوئی بڑی چیز انگلیوں سے ٹکرا جاتی تو میں اسے راکھ کے ڈھیر سے نکال لیتا۔ وہ دیکھنے لگتیں... جو کبھی جسم کا وجود تھا اور اب سفید سوکھی، نم، بجھی ہوئی آگ کی جھلسی ہوئی ہڈیوں میں بٹ گیا تھا۔ ہم سے راکھ سے نکال کر اس لال تھیلی میں رکھتے جاتے تھے جو وہ اپنے ساتھ لائی تھیں۔ کبھی کبھی راکھ کے بھیتر انھیں ٹٹولتے ہوئے میرے ہاتھ ان کے ہاتھ سے چھو جاتے تھے — ایک لمحے کے لیے رکے رہتے تھے۔ میں آنکھیں اٹھا کر دیکھتا، وہ کھوئی سی نیچے کچھ دیکھ رہی ہیں، جیسے ہڈیوں کے بیچ کسی زندہ ہاتھ کا لمس کچھ انہونا سا معلوم ہوتا۔ گیلی راکھ کے بھیتر ایک سوکھی سی بے چینی، جسے وہ کچھ دیر ڈھانپے رہتیں، پھر وہ میرے ہاتھ سے پھسل جاتا، اور وہ تھیلی اپنے ہاتھ میں پکڑ لیتیں اور میرے ہاتھ راکھ میں خالی بھٹکتے رہتے۔ اور تب مجھے اپنے پرانے دن یاد ہو آئے جب خاک چھانتے ہوئے میں نے کتنی قیمتی چیزوں کو گنوا دیا، اور اب راکھ میں، انھیں ٹٹول رہا تھا جو مجھے اتنا کچھ دے گئے تھے۔

"بس... یا ابھی کچھ اور باقی بچا ہے؟" انھوں نے میری اور دیکھا۔

میرے ہاتھ ٹھٹک گئے۔ "آپ نے ٹھیک سے دیکھ لیا... سب جگہ؟"

وہ پورے ہو گئے تھے۔ اتنا لب جیون اس چھوٹی سی تھیلی میں سما گیا تھا۔

ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔ دھوپ پہاڑوں سے اتر کر سر پر چلی آئی تھی۔ شیڈ کے پاس آ کر ہم نے دوبارہ ہاتھ دھوئے... پچھلی شام کی جو شروعات شویا ترا سے ہوئی تھی، وہ جیسے اب، اس صبح، اس گھڑی اپنے آخری پڑاؤ پر پہنچ گئی تھی۔

آخری پڑاؤ! نہیں، یہ نہیں۔ یہاں نہیں۔ یہاں انھوں نے اپنے آپ کو چھوڑا تھا، ہماری طرف سے انھیں چھوڑنا اب بھی باقی تھا...

"کیا کچھ دیر یہاں بیٹھ سکتے ہیں؟" تیا نے میری اور دیکھا۔

شیڈ کی ہری چھت کے نیچے بنچ خالی پڑی تھی۔ ہم وہیں چلے آئے۔ بیٹھ گئے۔ انھوں نے ہڈیوں کی تھیلی کو اپنے پاس بنچ پر رکھ دیا، ہم دونوں کے بیچ۔ ہوا چلتی تو سفید ٹیلوں کے بیچ دبی راکھ کے سفید ذرے کڑی دھوپ میں چمکتے ہوئے ہمارے سامنے سے نکل جاتے۔

"آپ کے لیے تو یہ مشکل دن رہے ہوں گے؟"

کیا وہ پوچھ رہی ہیں یا صرف کہہ رہی ہیں؟ میرے پاس کچھ بھی کہنے کو نہیں تھا۔

Scanned with CamScanner

''کیا وہ کبھی...؟'' وہ بیچ میں رک گئیں۔ میں نے آنکھیں اٹھا کر انھیں دیکھا۔ وہ بہت پیلی سی لگ رہی تھیں۔ آنکھوں میں گہری تھکان تھی، جیسے وہ پچھلی کئی راتوں سے سوئی نہ ہوں۔

''آپ کیا پوچھ رہی تھیں؟''

''نہیں، رہنے دیجیے۔''

''نہیں، بتائیے، آپ کیا کہہ رہی تھیں؟''

''آخری دنوں میں وہ آپ کو کیا لکھاتے تھے؟''

نہیں، انھوں نے بات بدل دی تھی۔ وہ سیدھے نہ آ کر دوسری طرف نکل گئی تھیں۔

''ڈکنز اور ہارڈی...''

انھوں نے کچھ حیرانی سے مجھے دیکھا۔

''میں نے لکھنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ مجھے پڑھنا سکھا رہے تھے،'' میں نے کہا۔ ''آپ کو انھوں نے کبھی چٹھی میں نہیں لکھا؟''

''آپ نے بھی تو نہیں۔'' ان کی آواز بہت دھیمی تھی، پر پھر بھی نیچے سے ایک روکھی سی تپش اوپر چلی آئی۔

''آپ کو لکھا تو تھا... لائبریری کی شاموں کے بارے میں۔''

''ان کے اسٹروک کے بارے میں آپ نے کچھ نہیں لکھا۔''

''ڈاکٹر سنگھ نے منع کیا تھا... انھیں تب یقین نہیں تھا... انھوں نے کہا تھا، وہ خود آپ کو فون پر سب بتا دیں گے۔ پر شاید تب آپ وہاں نہیں تھیں۔''

''میں دورے پر گئی تھی۔ جب لوٹی، تب مجھے ان کا ٹیلیگرام ملا تھا۔''

اوپر موٹر روڈ سے ایک بس چنگھاڑتی ہوئی نکل گئی۔ اس کی گونج دیر تک پہاڑیوں کے آر پار گھومتی رہی۔

''کبھی میرے بارے میں پوچھتے تھے؟'' ان کی آواز ہموار تھی۔ شانت۔ جوشیلی نہیں، صرف ہلکا سا تجسس لیے۔ ''آپ کا پتر آتا تھا تو خود پڑھ کر مجھ سے پڑھواتے تھے...'' میں نے کہا۔ ''آخر میں ہمیشہ پوچھتے تھے، آنے کے لیے تو کچھ نہیں لکھا؟ انھی دنوں ہم نے آپ کے پاس آنا طے کیا

Scanned with CamScanner

تھا... بس کی سیٹیں ریزرو کروائی تھیں... ایک رات پہلے سے انھوں نے اپنا سارا سامان پیک کر لیا تھا۔"

ان کا ہاتھ پاس رکھی ہوئی پوٹلی پر گیا... پھر جھجک کر واپس لوٹ آیا۔

"آپ اس طرح کیوں چلی گئیں؟" پر میں نے انھیں دیکھا۔ وہ دکھائی نہیں دیں۔ دھوپ سے بچنے کے لیے انھوں نے ساڑی کے پلّو سے چہرہ چھپا رکھا تھا۔

"آپ کو لکھا تو تھا۔ آپ کو میرا نوٹ نہیں ملا؟"

"میں اپنے بارے میں نہیں، ان کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔ آپ کو معلوم نہیں، آپ کے اس طرح جانے کے بعد وہ کیا ہو گئے تھے؟"

آگے مجھ سے کچھ کہا نہیں گیا۔ ایک پیلا سا بونڈر اٹھنے لگا، جس میں ایک کے بعد ایک دن یاد آنے لگے جو ان کے جانے کے بعد ہمارے بیچ بیتے تھے۔ وہی تو دن تھے جب ہم نے، میں نے، انھیں کھو دیا تھا۔ کیا وہ یہ کبھی جان سکیں گی؛ کیا میں ان سے کبھی کہہ سکوں گا؟

اچانک مجھے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ پر محسوس ہوا۔ وہ اسے دھیرے دھیرے سہلا رہی تھیں؛ جس نے کچھ دیر پہلے راکھ کے بھیتر سے ان کی راکھ کو سمیٹا تھا۔ وہ مجھے چھو رہی تھیں، جیسے جو انھوں نے کہنا تھا، صرف چھونے سے ہی اس کا چھور پکڑا جا سکتا تھا۔

ہم کچھ دیر ویسے ہی چپ چاپ راکھ کے ڈھیر کے سامنے بیٹھے رہے۔ کبھی کوئی چیل چکر کاٹتے ہوئے اوپر سے نکل جاتی اور اس کے پنکھوں کی کالی چھایا سفید چٹانوں پر سرکتی ہوئی نیچے گھاٹی کی طرف اتر جاتی۔ دھوپ پہاڑیوں سے اتر کر پرانی بجھی ہوئی چتاؤں کی کالی قطار پر چلی آئی تھی۔

"آپ سے انھوں نے کچھ کہا تھا؟" انھوں نے بنا سر اٹھائے کہا۔

"کس بارے میں؟"

انھوں نے بیچ پر رکھی تھیلی کو دیکھا۔ "اس کا کیا کرنا ہوگا؟"

کیا کرنا ہوگا، جو وہ اپنے پیچھے چھوڑ گئے ہیں؟

"نہیں... مجھ سے کبھی اس بارے میں بات نہیں ہوئی، لیکن..."

انھوں نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا... آنکھوں پر دھوپ چمک رہی تھی۔

Scanned with CamScanner

''آپ سے تو کچھ کہا ہوگا... شاید اپنی کوئی اچھا بتائی ہو؟''

انھوں نے سر ہلایا۔ ''کچھ بھی نہیں۔''

وہ اپنے بارے میں اتنی باتیں کرتے تھے، پر اپنے پیچھے جو بچارہ جائے گا، اس کے بارے میں ایک شبد بھی نہیں؟

''کیا وہ وشواس کرتے تھے؟'' میں نے پوچھا۔

''کس بارے میں؟''

''آخری سنسکاروں کے بارے میں؟''

''مجھے نہیں معلوم وہ انت کے بارے میں کیا سوچتے تھے۔ آپ تو جانتے ہی ہیں، وہ ان معاملوں میں کیسے تھے... دیوا کی برسی پر جب اماجی انھیں سمشری جانے کے لیے کہتی تھیں تو ہمیشہ منع کر دیتے تھے۔''

مسز مہرا؟ وہ کیسے اس دوپہر سمشری کی اونچان سے اتر کر ہمارے پاس شمشان بھومی میں چلی آئی تھیں...

''کیا ان کی استھیوں کو ان کے پاس قبر میں نہیں دبا سکتے؟'' میں نے کہا۔

وہ کچھ دیر چپ بیٹھی رہیں۔ ایک پھیکی سی مسکراہٹ چہرے پر چلی آئی۔

''شاید انھیں اچھا نہیں لگے گا... اننت کال کے لیے اتنے پاس پاس رہنا۔''

وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ تھیلی ہاتھ میں اٹھالی۔

''چلیے، اس کے بارے میں گھر چل کر سوچیں گے۔''

ہم نیچے اترنے لگے۔ بادلوں کے ٹکڑوں میں سورج چھپ گیا تھا، پر دھوپ کی پٹیاں اب بھی باقی تھیں۔ ایک سانولی سی مند روشنی پہاڑیوں، شہر کی چھتوں، نیچے کی پچھلی گھاٹی پر اترنے لگی تھی۔

3.2

صبح کا کہرا چھٹ رہا ہے۔ بس کی ہیڈ لائٹس میں سفید پتھروں کی میڑیں نیچے اترتی جاتی ہیں۔ سڑک کے ہر موڑ پر ہچکولا سا لگتا ہے اور میں تھیلی کو اور بھی جکڑ کر چھاتی سے چپکا لیتا ہوں۔ نہیں، ڈر کی کوئی

Scanned with CamScanner

بات نہیں ہے، وہ میرے ساتھ ہیں۔ انھوں نے شاید کبھی خواب میں بھی نہ سوچا ہوگا کہ وہ جو ہر شام مجھے اپنی پچھلی یاتراؤں کے ایڈونچر سناتے تھے، ایک دن خود میرے ساتھ بس کی سیٹ پر آخری یاترا کرنے نکلیں گے۔

•

یہ سب اچانک ہو گیا تھا۔ سوچا بھی نہ تھا کبھی میں یہ فیصلہ آدھی نیند کے دھندلکے میں لے بیٹھوں گا۔ شمشان گھر سے لوٹ کر میں اپنی کوٹھری میں آکر لیٹ گیا تھا... سونے نہ سونے کے بیچ۔ مجھے بیس سال پرانی بات یاد ہو آئی تھی، جب میں بابو کی استھیاں لے کر نکل گیا تھا... سوگ اور درد میں لپٹا ہوا، جو برف کے لوندے کی طرح دل کی تہوں کے نیچے جم گیا تھا۔ تب میں مشکل سے اٹھارہ برس کا رہا ہوں گا، جب ہم پہلا پیار کرتے ہیں، اور میں نے موت کو پہلی بار دیکھا تھا... ایک قریبی ہستی کو اتنے قریب سے۔ اور اب بیس سال کی مشکل بھول بھلیوں سے باہر نکل کر اس پرائے شہر میں ایک بار پھر اس کے سامنے آکھڑا ہوا تھا، جس نے ایک دن مجھے استالاچار اور غیر محفوظ بنا کر چھوڑ دیا تھا۔

میں اپنی کوٹھری سے باہر نکل آیا۔ بادلوں سے بھرے آکاش میں ایک بھی تارا دکھائی نہیں دیتا تھا۔ صرف ان کی کاٹیج کی روشنی جل رہی تھی... اس کمرے میں نہیں جہاں وہ آخری دنوں میں لیٹے رہا کرتے تھے، بلکہ ہال کے دوسری طرف کے ڈرائنگ روم میں، جہاں میں نوٹ بک لے کر ان کے پاس شروع کے دنوں میں جایا کرتا تھا۔

میں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ کچھ دیر تک کوئی آواز سنائی نہیں دی۔ نہ کوئی باہر آیا۔ کیا کمرے کے بھیتر کوئی نہیں ہے؟ میں نے دوبارہ دستک دی اور پھر ہلکے سے دروازے کو دھکیلا۔

وہ لمبی میز کے سامنے بیٹھی تھیں۔ کمرے کے آخری کنارے پر۔ شاید اسی لیے انھوں نے دروازے کی دستک نہیں سنی تھی۔ لمبی شیشوں والی کھڑکی، جو ہمیشہ پردوں کے پیچھے چھپی رہا کرتی تھی، کھلی تھی۔ دونوں پلّوں کے بیچ ٹیبل لیمپ کی روشنی ان کے جھکے سر، میز پر رکھے کاغذوں اور پھولدان پر گر رہی تھی۔ میں نے دروازے کی کھلی سانکل کو دوبارہ کھینچا، لوہے اور لکڑی کے بیچ ایک سدھی سی آواز اوپر آئی۔ تب انھوں نے سر موڑا، وہاں جہاں دہری پر میں کھڑا تھا۔

''آپ؟'' وہ اب بھی مانو کسی دوسرے خیال میں تھیں، جہاں مجھے دیکھ کر بھی میرا وہاں ہونا ـــــ ان کے سامنے ہونا ـــــ درج نہیں ہوا تھا۔

"آپ سے کچھ کہنے آیا تھا۔"

وہ کرسی پیچھے کھسکا کر کھڑی ہو گئیں... "بیٹھیے، میں آپ کو بلانے والی تھی..."

میں میز کے کنارے رکھی بینت کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ اب بھی کھڑی تھیں — چپ، میری طرف نہارتی ہوئی۔

"کس لیے... کچھ کام تھا؟" میں نے پوچھا۔

انھوں نے سر ہلایا۔ کرسی موڑ کر میری طرف کھینچ لی۔ اس کے کنارے ادھر ہو کر بیٹھ گئیں، جیسے کسی فیصلے کے انتظار میں ہوں۔

"آپ نے کچھ سوچا؟"

"میں آپ سے کچھ کہنے آیا تھا... آپ چاہیں تو منع کر سکتی ہیں۔"

وہ میری اور دیکھتی رہیں۔

"میں بہت دنوں سے باہر جانا چاہتا تھا..."

ان کی آنکھوں میں عجیب سی حیرانی تھی۔

"میں کبھی نہیں... باہر کہاں؟"

"میں نے تب کچھ بھی طے نہیں کیا تھا... جب وہ زندہ تھے۔ لیکن اب انھوں نے سب آسان کر دیا ہے۔ کیا میں ان کی اَستھیوں کو ساتھ لے جا سکتا ہوں؟"

وہ چپ تھیں۔ لیمپ کی روشنی ان کے ماتھے کی سلوٹوں پر گر رہی تھی۔

"مجھے معلوم ہے یہ آپ کو ٹھیک نہیں لگے گا... میں ان کا کوئی بھی نہیں لگتا تھا۔ میرا ان پر کوئی بھی ادھیکار نہیں تھا... نہ تب جب وہ زندہ تھے، نہ اب... جب وہ نہیں ہیں۔"

"ادھیکار کی بات نہیں..." ان کی آواز بہت کومل سی ہو آئی تھی۔ "وہ آپ کو بہت مانتے تھے... آپ نہ ہوتے تو یہ آخری برس..."

ان کی آواز اتنی دھیمی ہوتی گئی کہ مجھے پتا نہیں چلا کہ دھیرے دھیرے کس آخری شبد پر جا کر وہ بجھ گئی۔

"آپ کہاں جانے کی سوچ رہے ہیں؟"

Scanned with CamScanner

"پہلے ہردوار کے پاس نکل جانا سوچا تھا... لیکن وہ کافی دور ہے... اس لیے پارول کوٹ جانے کا سوچا ہے... یہاں سے بس سے صرف ڈھائی تین گھنٹے کا راستہ ہے۔"

"پارول کوٹ؟ کبھی نام نہیں سنا۔"

"چھوٹا سا پہاڑی قصبہ ہے... گڑھوال کی سیما پر۔ کہتے ہیں، وہاں ندی جو بہتی ہے، گنگا کی ہی چھوٹی دھارا ہے۔"

"یہ تو یہاں سب ندی نالوں کے بارے میں کہا جاتا ہے۔" ایک ہلکی سی مسکان ان کے چہرے پر چلی آئی۔ "آپ اکیلے ہی جائیں گے؟"

میں نے کچھ حیرت سے انھیں دیکھا۔

"اور کون؟"

"کیا میں آپ کے ساتھ آسکتی ہوں؟"

"آپ آئیں گی؟"

ایک لمحے کے لیے میں بھول گیا کہ وہ مہرا صاحب کی بیٹی ہیں... وہ مجھے صرف وہ لڑکی دکھائی دیں جسے لوگ تیا کہتے تھے، جو ایک کالی شال لپیٹے میرے سامنے بیٹھی تھیں، نیچل لیمپ کے نیچے۔ ناموں کے ساتھ رشتے کتنی جلدی ایک دوسری روشنی میں چمکنے لگتے ہیں۔

"آپ چلیں گی تو انھیں بہت اچھا لگے گا۔ آپ کو نہیں معلوم، ہم دونوں اسی بس میں آپ کے پاس آنے والے تھے... وہ آپ کو سرپرائز دینا چاہتے تھے۔" یہ شبد کیسے میرے منھ سے باہر نکل آئے، جیسے وہ بہت دیر سے اس گھڑی کے انتظار میں بیٹھے تھے۔

"سرپرائز... انھیں دیکھ کر؟" وہ کچھ ایسے بولیں، جہاں سوچ کے ساتھ کوئی پرانا سوگ چلا آتا ہے۔ "ہاں... شاید!" وہ مسکرانے لگیں۔ "میں جب ہاسٹل سے چھٹیوں میں آتی تھی تو دیوا مجھ سے کہتی تھیں... تمھارے پاپا کو نہیں معلوم کہ تم آرہی ہو... میں چاہتی ہوں تمھیں دیکھ کر وہ..." ان کی آواز اچانک بیچ میں رک گئی۔ "ہم ہمیشہ ایک دوسرے کو سرپرائز دیتے رہتے تھے، کرسمس کی سوغاتوں کی طرح!" ان کی آواز بہت عجیب سی ہو آئی تھی۔ کچھ دیر بعد جب وہ بولیں تو جیسے کسی اندھیرے گڑھے کو پار کر کے آئی ہوں۔

Scanned with CamScanner

"آپ کب جانے کی سوچ رہے ہیں؟"

وہ کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ میری کرسی کے پاس چلی آئی تھیں... میں ان کا چہرہ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ صرف ان کے پاس ہونے کا احساس ہوتا تھا۔

"کل صبح۔"

صرف سناٹا تھا، جس میں وہ لپٹی تھیں اور میں اسے اپنے بالکل پاس، اپنی دھڑکن میں سن سکتا تھا۔ ایک سانس، یا صرف ایک آہ یا شاید میری ہی آواز کی میلی سی گونج؟

"ذرا ٹھہریے۔"

ایک ہلکی سی سرسراہٹ ہوئی اور میں نے دیکھا، وہ لال تھیلی میری گود میں آ پڑی ہے۔

"آپ میرے ساتھ نہیں آئیں گی؟" دروازے کے پاس آ کر میں ٹھٹک گیا۔

"آپ کے ساتھ وہ ہیں... ان کے ساتھ بھی تو کوئی یہاں چاہیے!"

"ان کے ساتھ؟"

"آپ جائیے... ان دنوں گھر کو خالی چھوڑ کر جانا ٹھیک نہیں ہے۔" اور وہ مڑ گئیں۔ دھیرے سے دروازہ کھول کر دوسرے کمرے میں چلی گئیں جہاں آخری بار وہ انھیں دیکھنے گئی تھیں، جیسے وہ پوٹلی میں میرے ساتھ اتنے ہی ہیں جتنے اس اکیلے کمرے میں جہاں وہ گئی تھیں۔

میں تھیلی لے کر اٹھ کھڑا ہوا... پیر دہری کی طرف بڑھے، پھر رک گئے، حالانکہ کسی نے مجھے نہیں پکارا تھا، صرف ایک ٹھنڈی سی ٹھٹھرن میری ٹانگوں میں برف سی جم گئی تھی۔ میں مڑ گیا۔ ان کے کمرے میں چلا گیا، جہاں مجھے نہیں جانا چاہیے تھا۔ وہ کھڑی تھیں، دیوار پر سر ٹکا رکھا تھا۔

میں نے اپنا ہاتھ ان کے مڑے ہوئے سر پر رکھ دیا... وہ کچھ نہیں بولیں۔ صرف سر ہلاتی رہیں، ایک طرف سے دوسری طرف، جیسے بھیتر اٹھتے کسی بونڈر کو اوپر آنے سے روک رہی ہوں... میں نے ان کا چہرہ اپنی طرف موڑ لیا اور وہ دیوار میں گھستا ہوا مڑ آیا، ان کا پورا چہرہ، آنسوؤں سے تربتر، آنکھیں مندی ہوئی، کھلتی ہوئی ہر سانس کے ساتھ کسی باڑھ کو بھینچتی ہوئی۔ "تیا... کیا کر رہی ہو!"

"مہربانی کر کے آپ جائیے!" انھوں نے اپنی بانہہ سے چہرے کو پونچھا۔ پھر یکایک انھوں نے میرا ہاتھ، جو ان کے سر پر تھا، اپنے ہاتھ میں لیا، اور اسے دھیرے دھیرے تھپتھپانے لگیں۔

Scanned with CamScanner

آنسوؤں کے بیچ ایک بے بس سی مسکراہٹ دھوپ کی طرح نکل آئی۔

"میں اب ٹھیک ہوں۔ آپ اب جائیے۔ کل صبح ہی آپ کو بس پکڑنی ہے۔"

ان کے جانے کے بعد وہ پہلی بار روئی تھیں۔ بے بس، پاگل سی! موت ایک گھٹنا ہے، وہ صرف برف کی طرح سن کر دیتی ہے۔ پیڑ ابعد میں ہوتی ہے، وقت کی تپش میں بوند بوند پگھلتی ہوئی۔ مجھے لگا، جیسے اس رات آنکھوں کی وہ جھیلی مجھے دے کر وہ اُن سے آخری بدائی لے رہی ہوں...

اب وہ پوٹلی میرے ساتھ تھی۔ خالی سیٹ پر میرے بیگ کے اوپر رکھی تھی۔ بس کے ہچکولوں میں ہلتی، میرے ساتھ چل رہی تھی۔

چھوٹے چھوٹے گاؤں، پہاڑی قصبے کھڑکی کے سامنے سے نکل جاتے تھے۔ بس کہیں رکتی تھی، یاتریوں کو لیتی ہوئی، اتارتی ہوئی، پھر چلنے لگتی تھی۔ مجھے پتا بھی نہیں چلا، بیچ میں کتنے میل کے پتھر آنکھوں سے پھسل گئے ہیں۔ اونگھتے ہوئے آنکھیں کھلتیں تو دکھائی دیتا، سڑک ڈھلان پر اترتی ہوئی چوڑی ہوتی جا رہی ہے، کنارے پر پیڑوں کے جھرمٹ پہاڑی سلسلوں سے نکل کر چھپتے ہوتے جا رہے ہیں۔ چیڑ اور دیودار اب کہیں دکھائی نہیں دیتے تھے۔ دھوپ اور دھول میں جھلسے کہیں پیپل، کہیں نیم کے پیڑ دکھائی دے جاتے تھے۔

میرے بغل کی سیٹ پر کوئی عورت ایک خالی ٹوکری لے کر بیٹھ گئی تھی اور میں نے پوٹلی کو اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا۔ مجھے ڈر تھا، کہیں میں سوتا نہ رہ جاؤں، اس لیے بار بار کھڑکی سے باہر دیکھ لیتا تھا۔ بس کے کنڈکٹر نے میری چنتا کو بھانپ لیا۔ ہنستے ہوئے بولا، "پارول کوٹ ابھی دور ہے بابو جی۔ آپ فکر نہ کریں، میں آپ کو بتا دوں گا۔" میرے پاس بیٹھی وہ پہاڑی لڑکی بھی مجھے دیکھ کر مسکرانے لگی۔

میں نچنت سا ہو گیا۔ کھڑکی کے پاس سٹ کر بیٹھ گیا۔ بس جتنا نیچے اترتی جاتی، گرمی بڑھتی جاتی تھی۔ میری آنکھیں بار بار مند جاتی تھیں۔ پچھلی رات جب تیا کے پاس سے لوٹا تھا تو دیر تک نیند نہیں آئی تھی۔ ایک عجیب سی شدید تھکان میری نسوں میں اکٹھا ہو گئی تھی۔ نیند کا جھونکا آتا تو اس کے ساتھ عجیب سے سپنے الگ الگ چندیوں میں اڑتے دکھائی دے جاتے، جن کے بیچ کسی طرح کا سمبندھ بٹھانا ناممکن ہوتا۔ خالی سونی سڑک، جس پر چلتے ہوئے مجھے اپنے پیچھے کسی دوسرے پیروں کی آہٹ سنائی دیتی...

کیا زجن بابو ہیں؟ میں نے پیچھے مڑکر دیکھا تو وہاں سڑک کی پٹڑی پر سفید سنگ مرمر کی بنچ دکھائی دی... وہاں شاید کچھ دن پہلے صاحب جی بیٹھے تھے، جنھیں کھوجنے ہم گھر سے باہر آئے تھے۔

''آپ یہاں بیٹھیے... وہ یہیں لوٹ کر آئیں گے،'' مرلی دھر نے کان میں پھسپھساتے ہوئے کہا۔

اس کی آواز اندھیرے میں کھو گئی، پر اس کی سانس، جس میں دیسی شراب کی کھٹی سی بو تھی، میرے کپڑوں کے بھیتر رینگنے لگی۔ میں نے ایک بار اسے ہاتھ سے ہٹایا تو وہ ٹھہر گئی، پر کچھ دیر بعد پھر رینگنے لگی، میری چھاتی پر، گلے پر، بغلوں میں، گالوں پر... ہلکی آنچ کی لپٹیں میرے ننگے ماس پر دھیرے دھیرے اپنے سرخ پنکھ پھیلاتی ہوئی...

یکایک میری آنکھیں کھل گئیں۔ میں نے دیکھا، اُن کی ہڈیوں کی تھیلی سے، جو میری چھاتی سے سٹی تھی، چھوٹی چھوٹی لال چیونٹیاں باہر نکل رہی تھیں — اتنی چھوٹی کہ اگر میرے جسم پر نہ رینگ رہی ہوتیں تو شاید میں جان بھی نہ پاتا کہ وہ وہاں ہیں۔

میں نے چاروں طرف دیکھا... میرے بغل کی سیٹ خالی تھی۔ سوتے ہوئے مجھے پتا بھی نہ چلا تھا کہ وہ پہاڑن کس اسٹیشن پر بس سے اتر گئی تھی۔ بس کے دوسرے یاتری نیند میں اونگھ رہے تھے۔ ڈرائیور کی سیٹ کے پاس بیٹھے کنڈکٹر نے بیڑی سلگائی تھی اور وہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا

مجھے کوئی نہیں دیکھ رہا تھا۔ میں نے تھیلی کو سیٹ پر رکھ دیا، قمیص کے بٹن کھول دیے۔ کھجلاہٹ کی سوئیاں سموچی دیہہ میں چبھ رہی تھیں... ایک عجیب سی تلملاہٹ میں سارا شریر جل رہا تھا۔ ایک بار سب کی آنکھ بچا کر میں نے تھیلی کو سونگھا۔ خوش قسمتی سے کوئی ایسی ہیک اس میں سے نہیں آ رہی تھی جو لوگوں کا دھیان کھینچ سکے۔ ویسے بھی پوری بس سگریٹ، بیڑی، پسینے اور دھول کی ایسی ملی جلی باسوں سے اٹی پڑی تھی جن میں الگ سے کسی ایک گندھ کو پہچان پانا ناممکن تھا۔

میں نے تھیلی کو سیٹ سے اٹھا لیا اور سب کی آنکھ بچا کر اس کی گانٹھ باندھنے لگا — اور تب میرے ہاتھ اچانک ٹھٹک گئے...

مجھے پتا بھی نہ چلا تھا کہ قمیص کی آستینوں کے پیچھے میری بانہوں پر کیسے ددورے نکل آئے تھے جن کے نیچے وہ دھیرے دھیرے راستہ بناتی ہوئی رینگ رہی تھیں۔ کہاں سے آ رہی تھیں وہ؟ کہاں جا رہی تھیں؟ کسے کھوج رہی تھیں میری دیہہ میں، جو اُن کی تھیلی کے پڑوس میں بیٹھا تھا؟

Scanned with CamScanner

کل تو وہ کہیں نہ تھیں، جب انھیں راکھ سے نکالا تھا، دودھ سے دھویا تھا۔ کیا وہ اتنی بے چین تھیں کہ ڈوبنے سے پہلے ایک بار پھر جینے کی سانس کو اپنے میں سوکھنا چاہتی تھیں؟

مجھے لگا کہ کچھ ہی دیر میں بس کے اونگھتے یاتری چونک کر جاگیں گے اور میری ہی طرح اپنے انگوں کو ٹٹولیں گے... میرے پاس آ کر کہیں گے: یہ آپ کی تھیلی ہے؟ کیا بھر رکھا ہے اس میں؟ دیکھتے نہیں، اس میں سے کیا باہر نکل رہا ہے؟... نہیں، نہیں، اس سے پہلے کچھ ہو، میں کھڑا ہو گیا، بنا سوچے سمجھے، بھری بس میں میں کیا کرنے جا رہا ہوں؛ بدحواس سا ہو کر میں بس کے دروازے کا ہینڈل ہلانے لگا۔

''کیا بات ہے بابو جی؟'' کنڈکٹر نے کس کر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''چلتی بس سے گرنے کا ارادہ ہے؟''

اس نے میرے کندھے کو پکڑ کر کٹھ پتلی کی طرح سیٹ پر بیٹھا دیا۔ پھر نہ جانے اس نے میرے چہرے پر کیا دیکھا کہ اس کی آواز اچانک دھیمی پڑ گئی۔

''آپ ٹھیک تو ہیں، بابو جی؟''

میں نے سر ہلا دیا۔ میں اس کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''بس تھوڑی دیر کی بات ہے۔ اگلا اسٹیشن آپ کا ہی ہے۔''

میں اس اجڈ، انجان نوجوان کے تئیں احسان مند سا ہو گیا۔ اس نے دیکھ کر بھی سب ان دیکھا کر دیا تھا۔ بس کے جھٹکوں نے میرے اندر کی ابلتی آگ کو بجھا دیا، اسی راکھ کے ڈھیر میں بدل دیا جس کی پوٹلی میرے ہاتھ میں تھی۔

کچھ دیر بعد بس کی گتی دھیمی ہو گئی۔ کھڑکی کے باہر جھونپڑے دکھائی دے رہے تھے۔ باہر آنگن میں چولھوں سے دھواں اوپر اٹھ رہا تھا۔ صبح کی میلی دھند چھٹ گئی تھی اور اس کے پیچھے سے شروع جاڑوں کی سلونی، صاف دھوپ دور پہاڑیوں پر چمک رہی تھی۔ دھیرے دھیرے بس ایک چھوٹی بستی سے گزر کر پانی بہتے نالے کے کنارے رک گئی۔ کنڈکٹر نے کھٹ سے دروازہ کھول دیا۔

''اتریے بابو جی، آپ کا پارول کوٹ آ گیا۔''

باہر ایک چھوٹی سی بھیڑ تھی۔ بھیتر گھسنے کو بے چین۔ مشکل سے نیچے اترا ہی تھا کہ اوپر سے کنڈکٹر کی آواز سنائی دی... ''آپ کا بیگ، بابو جی... پکڑیے!'' اور اس نے بس سے ہی اسے نیچے پھینک دیا۔

Scanned with CamScanner

جس حالت میں میں لوگوں کے بیچ راستہ بناتا ہوا باہر آیا، یہ آج بھی اچنبھا جان پڑتا ہے۔

دھوپ کی چکاچوند میری آنکھوں میں کانچ کے ٹکڑوں سی چبھ رہی تھی۔ میرے آگے پیچھے دھول کے غبار کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ دھیرے دھیرے ہوا کا اندھڑ کچھ ڈھیلا پڑا تو کچھ دور مٹی کے جھونپڑے دکھائی دیے۔ پاس میں ہی دھوپ میں چمکتے پوکھر تھے جن کے مٹیالے پانی میں بھینسیں بالکل ساکت اور دھیان مگن کھڑی تھیں۔ ان کی دیہہ پانی میں ڈوبی تھی، صرف سر پانی کے اوپر کسی کالے فوسل کی طرح دکھائی دیتے تھے۔

کبھی کوئی اینٹ سیمنٹ کا کھنڈر نما مکان دکھائی دیتا تھا، جسے کسی نے آدھا بنا کر بیچ میں چھوڑ دیا تھا۔ اکا دکا دکانیں، ڈھابوں کی بنچیں... بیچ بیچ میں کھیت دکھائی دے جاتے تھے، بیرک نما کوٹھریاں اور مڑھیا، جس سے پتا نہیں چلتا تھا شہر کہاں ختم ہوتا ہے، گاؤں کہاں شروع... یہ دونوں ہی کبھی ایک دوسرے کے بھیتر سما جاتے ہیں، کبھی ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے ہیں...

میں مانو کسی انجانے عجیب سے پردیس میں آ بھٹکا تھا، پہاڑیوں کے پیروں پر بچھا ایک گرا ہوا، کمزور سا بوسیدہ علاقہ جہاں صدیوں پہلے بھولے بھٹکے بنجاروں کا لشکر آیا ہوگا، اور جب اپنی لمبی تھکا دینے والی یاترا کے بعد ندی کے درشن ہوئے ہوں گے، تب سے یہیں آ کر بس گیا ہوگا۔

میں بھی یہاں ندی کی کھوج میں آیا تھا۔ یہیں، اسی بن آنچل کے کسی ان دیکھے پاٹ پر وہ بہہ رہی تھی، لیکن کہاں؟ کہاں تھی سرپا کی پوتر دھارا؟

جس کسی سے راستہ پوچھتا تھا، وہ اشارہ کر دیتا تھا، بس پندرہ منٹ۔ آدھا گھنٹہ۔ سمے کا احساس کب کا مٹ چکا تھا... شریر کا بودھ تبھی ہوتا تھا جب حلق میں تھوک اٹکنے لگتا تھا... کبھی کبھی اچھا ہوتی تھی کہ کسی ڈھابے میں بیٹھ کر چائے اور ٹھنڈا پانی پی کر کچھ تازہ ہو لوں، پر جب تھیلی کا خیال آتا تو اچانک ساری بھوک پیاس مر جاتی... لوگوں کو پتا نہ بھی چلے، خود میرے بھیتر ایک گھن سی اٹھنے لگتی۔

ان کی استھیاں اب مجھ سے الگ نہ ہو کر میری ہی دیہہ کا حصہ جان پڑتی تھیں۔ میں اب انھیں الگ نہیں لے جا رہا تھا، دھول اور پسینے میں لت پت میرے ماس کے ساتھ میرا شریر اسے بھی اپنے ساتھ ڈھوتا لے جا رہا تھا۔ بس کی سیٹ پر جو چیونٹیاں تھیلی سے نکلی ہوئی میرے ننگے شریر پر چلی

Scanned with CamScanner

آئی تھیں۔ وہ اب مند بخار کی آگ میں گم ہو گئی تھیں اور ان کی جگہ اب دیہہ کے ہر مسام پر خونی دھبّے سرخ چھلکیوں سے نکل آئے تھے۔

دیہہ کے تاپ اور باہر کی دھوپ میں کوئی فرق نہیں رہ گیا تھا: لگ رہا تھا جیسے چالیس سال پرانا شریر جو میں اپنے ساتھ لایا تھا، اب کسی دوسری دیہہ میں بہنے کی طرح چل رہا تھا، جس کا صاحب جی سے اتنا ہی سمبندھ تھا جتنا میرا ان استھیوں سے جن کی پوٹلی میرے ساتھ چل رہی تھی، اور ہم تینوں کے بھیتر ایک ہی اچھا سلگ رہی تھی، اپنے کو پانی میں ڈبونے کی، جہاں ہم ایک دوسرے سے اتم روپ سے الگ ہو سکیں...

لیکن تبھی ٹھوکر لگی اور میں نے دیکھا کہ میرے گرتے پڑتے پیروں کے نیچے ایک دوسری قسم کی زمین چل رہی ہے، سفید سپاٹ پتھروں اور نکیلے چمکیلے کنکروں سے بھری ہوئی، میرے جوتوں کے نیچے کچر کچر کرتی ہوئی۔

چندھیائی آنکھوں نے چاروں اور دیکھا تو پتا چلا، میں شہر کے شور شرابے اور بھنبھناتے بازار سے بہت دور نکل آیا ہوں۔ دور دھند میں چھپی پہاڑیاں اب صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ چاروں طرف ایک گھور سناٹا تھا۔ اجنبی استھان کس طرح ذرا سا دھیان بھٹکتے ہی کروٹ بدل لیتے ہیں اور جو انجانا اور دور کا تھا، وہی اپنا سا لگنے لگتا ہے، جیسے ہم کبھی یہاں آئے تھے۔ ہمیں سہارا دیتا ہوا، کہ وہاں بالکل ہی بے سہارا اور اکیلے نہیں ہیں، کوئی ہمارے ساتھ ہے، ہمارے پیچھے پیچھے آ رہا ہے۔

نہیں، یہ کورا بھرم نہیں تھا۔ کوئی سچ مچ میرے پیچھے آ رہا تھا، میرے قدموں کے ساتھ اپنے قدم ملاتا ہوا۔ میں کھڑا ہو جاتا تو وہ بھی ٹھٹھک جاتا، چلنے لگتا تو میرے پیروں کے ساتھ اس کی سنگت بھی شروع ہو جاتی۔ کہیں یہ میرے تپ زدہ دماغ کا ہی تو سنہرا سراب نہیں تھی، پیچھے مڑوں گا تو جلتی زمین پر اپنی ہی چھایا دکھائی دے گی، اور کچھ بھی نہیں؟ میں نے بیگ کو زمین پر رکھا اور تھیلی کو کس کر پکڑ لیا... جی کڑا کر کے پیچھے مڑ کر دیکھا۔

تین گز کی دوری پر وہ کھڑا تھا۔ کوئی پریت چھایا نہیں، بلکہ ہاڑ ماس کا زندہ انسان۔ تھوڑا سا حیران، جیسے اسے پتا نہیں تھا کہ میں اس طرح پیچھے مڑ کر اسے دیکھوں گا — بیباک!

"آپ؟" مجھ سے آگے کچھ کہا نہیں گیا۔

"جی ہاں..." ان کے چہرے پر ایک پتلی سی مسکراہٹ چلی آئی۔ "میں بھی آپ کے ساتھ ہوں۔"

انھوں نے اپنے چھاتے کو نیچے کر دیا۔ ان کی چھوٹی چھوٹی تیکھی آنکھیں میرے بیگ، میری تھیلی، گرد اور پسینے میں لتھڑی میری قمیص پتلون پر ٹکی تھیں۔ وہ میری طرح باہر کے یاتری نہیں معلوم پڑتے تھے، پھر کون تھے؟

صاف ستھری لانگدار دھوتی اور سفید کرتا پہنے تھے۔ کندھے پر نیلی دھاری کا ایک سفید انگوچھا لٹک رہا تھا، جس کے دو سروں پر پوٹلیاں بندھی تھیں، جیسے کسی پروہت برہمن کے سیدھے کی تھیلیاں ہوتی ہیں۔ چھریرے شریر پر عمر کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ ویسے بھی جس حالت میں میں تھا، اس میں کسی کے بارے میں کچھ بھی کہنا مشکل جان پڑتا تھا۔ اس بیابان میں وہ میرے ساتھ تھے، میرے لیے یہ بھی بڑا سہارا تھا۔

"سرپا کتنی دور اور ہے؟" میں نے پوچھا۔

"دور زیادہ نہیں ہے، لیکن جتنی پاس آتی جاتی ہے اتنا ہی چلنا دشوار ہوتا جاتا ہے... دیکھا، کتنے روڑے پتھر ہیں!" وہ اپنی چپل اتار کر جھاڑنے لگے۔ "آپ نے اچھا کیا کہ جوتے پہن کر آئے، ورنہ آپ کے پیر چھلنی ہو جاتے!"

وہ چلتے چلتے بولتے جاتے، ایکدم دھارا کے بہاؤ میں بہتے بہتے شبد باہر آتے جاتے تھے۔

"بڑا حصہ ہے سرپا ندی میں... بالکل چنڈی دیوی! پہلے تو بالکل شہر کے پاس بہتی تھی... وہیں جہاں آپ بس سے اترے تھے۔" انھوں نے اڑتی نگاہ سے مجھے دیکھا۔ "پتا نہیں کس بات پر اپنی ماں سے جھگڑ بیٹھیں — گنگا ماں کی گود سے نکل کر ایک دوسری ہی دشا پکڑ کر بہنے لگیں۔ پارول کوٹ کے ایک چرواہے نے جب پہلی بار اسے دیکھا تو سوچا، دور پہاڑی سے کوئی سانپ دھوپ میں پھنکارتا ہوا چلا آ رہا ہے... تب سے ہی اس کا نام سرپا پڑ گیا ہے۔ سنا ہے، برسوں تک کوئی اس کے پاس جانے کی ہمت نہیں جٹا پاتا تھا..."

وہ کتھا کے بیچ میں رک گئے، جیسے انھیں کچھ یاد آ گیا ہو۔ "آپ بھی تو پہلی بار آئے ہیں؟"

"پہلی بار؟" میں چلتے چلتے رک گیا۔

Scanned with CamScanner

''ہاں... کیوں نہیں؟'' وہ ہنسنے لگے۔ ''میں تو آپ کو پہلی نظر میں ہی پہچان گیا... کیا کسی کریا کرم سے؟'' وہ مجھے شوقین نگاہوں سے دیکھنے لگے، لیکن اتنا ہی جتنا میں سہہ سکوں۔

''میرے چھاتے کے نیچے آجائیے۔'' انھوں نے مجھے اپنے پاس گھسیٹ لیا۔ ''ارے، آپ کا تو ہاتھ جل رہا ہے... طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

''دیکھیے، مجھے جلدی ہے۔''

''یہ تو میں جانتا ہوں۔ چلیے، ابھی پہنچ جاتے ہیں۔''

انھوں نے چھاتا میرے اوپر کر دیا اور ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ تیز دھوپ میں صرف پتھر، جھاؤ کی جھاڑیاں، مٹی کے ڈھوہ دکھائی دیے جاتے تھے۔ وہ بار بار چپلوں سے کنکر نکالنے کے لیے رک جاتے تھے اور مجھے سانس لینے کا موقع مل جاتا تھا۔ لگتا تھا وہ بس اسٹینڈ سے ہی میرے پیچھے ہو لیے تھے۔ کون ہو سکتے تھے وہ؟ چہرے سے کچھ بھی پتا چلانا مشکل تھا — گائیڈ، پروہت، ہوٹل کے دلال؟ بے روزگار آدمی، جو چھوٹے شہروں میں بے مطلب کسی کے ساتھ بھی چل دیتے ہیں؟ یا صرف میری حالت پر ترس کھا کر میرے ساتھ ہو لیے تھے؟

میں اس بار اکیلے ہی جانا چاہتا تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس انجان جگہ بھی کوئی مجھ سے چپک جائے گا۔ بے معنی اور بے بس غصہ آنے لگا مجھے اور بھی حقیر اور قابلِ رحم بناتا ہوا۔ میں جھنک کر ان کے چھاتے سے باہر چلا آیا اور تیزی سے ڈگ بڑھاتا ہوا آگے آگے چلنے لگا۔

میں ان سے چھٹکارا چاہتا تھا۔

کچھ دور میں ایسے ہی چلتا رہا، جیسے آدمی کسی اندھڑ میں چلتا ہے۔ دیکھ کر بھی کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ دھوپ میں چمکتے پتھر، دھول میں اٹا آکاش، کنپٹیوں پر بہتا پسینہ، خود اپنا اپنا پا ایک دوسرے میں اس طرح گھل جاتے ہیں کہ بھیتر باہر کا فرق بھی مٹ جاتا ہے۔ پتا نہیں، میں اس بے سدھ حالت میں کتنی دیر چلتا رہا...

کچھ دیر تک یہ بھی پتا نہیں چلا کہ میرے پیر ایک ڈھلان سی اترائی پر چلے آئے ہیں... ہوا میں اب پہلے سی جھلسن نہیں تھی۔ دور افق پر پہاڑوں کی سرمئی سی لکیر دکھائی دے رہی تھی اور نیچے کہیں ایک مندی سی گڑگڑاہٹ سنائی دینے لگی تھی۔ میرے جوتوں پر گیلی سی مٹی چپکنے لگی تھی...

''سرپامائی کی جے!''

اچانک پیچھے سے آواز سنائی دی۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ کھلے چھاتے کو ہوا میں ڈلاتے بھاگتے ہوئے میرے پاس آ رہے تھے، جیسے کوئی بہت بڑا پنچھی اپنے کالے پنکھ پھیلائے پھدکتا ہوا چلا آ رہا ہو۔

''دیکھا آپ نے؟''

''کیا؟''

''ارے سامنے دیکھیے میری طرف نہیں!''

دھیرے دھیرے میری آنکھوں میں جیسے نظر واپس لوٹ آئی جس دھول بھرے اندھیرے میں میں اندھادھند چلا آ رہا تھا، وہ یکایک آنکھوں سے چھٹ گیا۔

سرپاندی! وہ ایک سفید چمکتے پارے کی طرح تیز سی میڑھی بل کھاتی پتھروں، چٹانوں کے بیچ بیچ دکھائی دے رہی تھی۔

''دیکھا آپ نے؟'' انھوں نے میرے کان میں پھسپھساتے ہوئے کہا، جیسے انھیں ڈر ہو سرپاندی ان کی بات سن نہ لے۔ ''بالکل جادوگرنی ہے... اچانک آنکھوں کے سامنے دکھائی دے جاتی ہے۔ پہاڑوں کے بھیتر سے ویسے ہی باہر نکلتی ہے جیسے کوئی سانپ اندھیری گپھا سے باہر نکلتا ہے... دیکھیے، لگتی بھی پوری سانپن ہی ہے۔ میں آپ کو نہ دکھاتا تو وہ آپ کے پیروں میں ہی لپٹ جاتی!''

وہ خوشی میں ہنس رہے تھے، جیسے ندی کے ساتھ ان کا کوئی پرانا اور نجی ناتا ہو۔ ''آپ تو پہلی بار آئے ہیں، لیکن میں تو جب بھی آتا ہوں، ہمیشہ اچرج ہوتا ہے... اور ندیوں کی طرح اس کی آواز دور سے سنائی نہیں دیتی... تب پتا چلتا ہے، جب تک آنکھوں کے سامنے نہیں پڑ جاتی!''

''روز آتے ہیں آپ؟'' میں نے آدھے غصے، آدھے تجسس میں ان کی اور دیکھا۔ ایک عجیب سی مسکراہٹ ان کے لمبے چہرے پر چمک رہی تھی۔

''میں تھوڑے ہی آتا ہوں... جب کبھی بلاوا آتا ہے، تبھی چلا آتا ہوں۔''

''کون بلاتا ہے؟''

''سرپامائی، اور کون؟''

Scanned with CamScanner

''آج بھی آپ کو بلایا تھا؟'' میں نے طنز کرنا چاہا، پر ان کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔

''آج نہیں... تین دن پہلے۔ کوئی کریا کرم کرنے آئے گا... ایسا پتا چلا تھا۔ آج جب آپ بس سے اترے، میں سمجھ گیا۔ کون لگتے تھے وہ آپ کے؟ کوئی پاس کے رشتے دار؟''

میرے بھیتر پھر کچھ گھومنے لگا۔ کسی طرح اُسے روک کر کہا، ''جس نے آپ کو بلایا تھا، اس نے آپ کو یہ نہیں بتایا؟''

''بتایا کیوں نہیں تھا... لیکن حساب ہمیشہ یاد تھوڑے ہی رہتا ہے... اس جنم میں جو آپ کے لگتے ہوں گے، کیا وہی تھے جو پچھلے جنم میں تھے؟''

میں نے انھیں دیکھا — نہیں، وہ اب ہنس نہیں رہے تھے۔ وہ ایک ٹک بغیر پلکیں جھپکائے سرپا کی جل دھارا کو دیکھ رہے تھے، میری اور سے بالکل بے نیاز۔ کون تھے وہ؟... بخار کی تپن میں سوال ایک بدبدے کی طرح اٹھ کر میری بوکھلاہٹ میں سما گیا۔

میں وہیں ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ بیگ کو نیچے رکھ دیا۔ تھیلی جو میرے ہاتھ میں تھی، اسے ہاتھ میں پکڑے رہا۔ بہتے پانی کی کل کل سے ایک دوسری آواز اٹھ رہی تھی، جسے میں پہلی بار سن رہا تھا، قدیم دنیا کی آوازوں سے بالکل الگ، جو سرپا ندی کے اندر سے اٹھ رہی تھی، جسے وہ ایک دوسری انجان دنیا سے اپنے ساتھ لائی تھی، جہاں سب کچھ سمبھو تھا، سب کچھ ہو سکتا تھا۔ انھوں نے پاس آ کر اپنے انگوچھے سے میرے ماتھے کو پونچھا، جہاں پسینے کی بوندیں ٹپ ٹپ چو رہی تھیں۔

''آپ کی تو ساری دیہہ تپ رہی ہے... ٹھہریے، میں پانی لاتا ہوں۔''

اس بار میں نے کوئی مزاحمت نہیں کی، جیسے انھوں نے میری سوچنے سمجھنے کی سموچی طاقت کو اپنے میں سوکھ لیا ہو... ٹھ پچی سا انھیں دیکھ رہا تھا، جو وہ کر رہے تھے۔

وہ اپنے انگوچھے کے سرے میں بندھی پوٹلی کھول رہے تھے، اس میں سے تانبے کی چھوٹی کلسیا اور لوٹا باہر نکالا تھا، اپنی چپلیں اتار کر کنارے پر رکھ دی تھیں۔ گھٹنوں تک دھوتی چڑھا کر ندی کے بھیتر تین چار قدم جا کر وہ کھڑے ہو گئے، پانی بھرنے لگے۔ جب میرے پاس آئے تو ان کی وہی پرانی مسکراہٹ لوٹ آئی تھی۔

''اسے پی ڈالیے... دیکھیے، کتنی جلدی اثر کرتا ہے۔ سرپا ماں ساری جڑی بوٹیوں کا ستو اپنے

میں گھول کر لاتی ہیں!'' گلاس میں پانی ہی کتنا تھا، میں گٹ گٹ کرتا ہوا سارا پی گیا۔ مجھے نہیں معلوم تھا، میرے بھیتر یہ پیاس کب سے سلگ رہی تھی۔ میں نے اور پانی پینے کے لیے لٹیا تھامی ہی تھی کہ انھوں نے میرا ہاتھ روک دیا۔

''ابھی نہیں... ذرا ٹھہرو! یہ جل ان کے لیے ہے جنھیں ساتھ لائے ہو... ان کی پیاس تم سے کہیں زیادہ ہے!''

میرے چاروں اور صرف ہوا تھی... پتھر، بہتا پانی، آکاش — کچھ بھی تو نہیں! لیکن تبھی میری نگاہ ایک چھٹی چٹان پر پڑی جو پانی کی دھار سے بالکل سپاٹ ہو گئی تھی۔ اس پر مٹتے ہوئے چاولوں کی چار گول ٹکیاں رکھی تھیں... کہاں سے آئیں وہ وہاں؟ ان کے انگوچھے کی پوٹلی سے، جہاں سے ابھی گلسیا اور لوٹا باہر نکلے تھے؟

میں انھیں اجنبی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا، جیسے ابھی جو پانی دیا تھا، اس نے میرے سب تلملاتے تونتے، ٹوہنوں کو شانت کر دیا تھا... جیسے ان کا وہاں ہونا اتنا ہی قدرتی ہو، جیسے ان کے منھ سے نکلتے منتروں کی ابوجھی، دھوبل سی گونجتی آواز جو سرپا کی بہتی دھارا میں گونجتی ہوئی میری تھکی نسوں کے بھیتر بہہ رہی تھی۔ ایک پل کے لیے ناپ چڑھے دل میں تجسس اٹھا تھا، اپنی تھیلی کے بارے میں، جواب میرے ہاتھ میں نہیں تھی، پر جب اسے سامنے کھلا پایا تو من کو تسکین ہوگئی کہ آخر وہ ہم سے چھٹکارا پا کر اپنی مکتی پانے کی جگہ پر آ پہنچی ہے، کھلے آکاش کے نیچے، بہتی سرپا کے تٹ پر، جہاں وہ لوٹے سے پانی کے چھینٹے بھی استھیوں کے ڈھیر پر، کبھی سفید پنڈوں پر ڈالتے جاتے تھے...

اچانک وہ اٹھ کھڑے ہوئے... لوٹے کا بچا پانی دھیرے دھیرے چاول کے گول پنڈوں پر گرانے لگے اور جب وہ بالکل خالی ہو گیا تو آکاش کو دیکھ کر ایک عجیب منوہار بھری آواز میں چلانے لگے... ''آؤ، آؤ، آؤ، آ... ؤ!''

پہلے دھیمی، پھر کچھ اونچی، اور اونچی ہوتی ہوئی آواز... کچھ ہی دیر میں ندی کی گڑگڑاہٹ ان کی آواز کے نیچے دب گئی اور آس پاس کی چٹانیں، پتھر، مٹی کے ڈھیر، پہاڑی کی چوٹی ان کی بے صبر، بے چین چیخوں کے گھناٹوپ سے بھر گئے۔

مجھے لگا، جو آدمی بس اسٹینڈ سے میرا پیچھا کرتا ہوا آ رہا تھا، وہ کوئی اور تھا۔ اور یہ آدمی جو لوٹا

ہاتھ میں لیے آسمان کو نہارتا ہوا چلا رہا ہے، یہ کوئی اور ہے...

ان کی حیرت سے پھٹی آنکھیں اوپر اٹھی تھیں، دھوتی گھٹنوں سے اٹھ کر ہوا میں پھڑ پھڑا رہی تھی، منھ ایک اندھیرے کھوہ سا کھلا تھا، جس میں سے تھوک کے چھینٹوں کی پھوار باہر آ رہی تھی۔ ان کی آواز اپنی ہی گونج کا پیچھا کرتے ہوئے ہوا کو چیر رہی تھی — ''آؤ، آؤ، آؤ...''

وہ ایک درویش کی طرح آکاش کی اور سر اٹھائے ہاتھ ہلا رہے تھے... وہ کس کو بلا رہے تھے؟ اس بیابان میں کون ان کے بلاوے کی باٹ جوہ رہا تھا؟

اچانک، ان کی آواز دھیرے دھیرے مند پڑتی گئی — سب کچھ تھم سا گیا۔ ایک کوا پنکھوں کو ڈلاتا ہوا آکاش سے نیچے اتر رہا تھا۔ وہ جوں جوں نیچے آتا جاتا تھا، پتھروں سے ٹکراتی ندی کی آواز صاف اور چمکیلی ہوتی جاتی تھی، جیسے اس بیابان میں وہ کسی بہت دور پتر لوک کے مہمان کو راستہ دکھا رہی ہو۔

کالے پنکھوں کو پھڑ پھڑاتا ہوا وہ دھیرے دھیرے چاول کے ان سفید پنڈوں کی طرف آ رہا تھا جو ندی کے کنارے چوکور پتھر پر رکھے تھے۔ دیکھتے دیکھتے اس کے پیچھے ایک دوسرا کوا، پھر تیسرا کوا، پھر چوتھا ایک کالے جھنڈ میں بہتے ہوئے چلے آئے اور پتھر کے چاروں اور گول پنگت بنا کر بیٹھ گئے۔ سفید، گیلے پنڈوں پر ان کی لمبی چمکتی چونچیں ڈبیا سی کھلتی، بند ہو جاتی تھیں... شہری کووں کی طرح نہ چوکنے، نہ چوکس — ہماری اور سے بے پروا... اپنے میں مگن...

جب کبھی کوئی کوا سر اٹھا کر ہماری اور دیکھتا تھا تو لگتا تھا کہ وہ ہمارے پاس ہوتا ہوا بھی کہیں دور دیکھ رہا ہے، جیسے اس کے دیکھنے کا اور ہمارے وہاں ہونے کا کوئی سمبندھ نہیں ہے...

''میں نے کہا تھا نا، وہ آئیں گے!''

ان کی آواز سنائی دی... مجھے پتا بھی نہ چلا تھا، کب وہ میرے پاس آ کر بیٹھ گئے تھے۔

''چلیے، دکھ ٹل گیا... اب چنتا کی کوئی بات نہیں!''

''دکھ کیسا؟'' میرے بھیتر ایک عجیب سا اندیشہ پیدا ہوا۔

''مجھے معلوم تھا، آپ پوچھیں گے... جو آتا ہے، وہ یہی پوچھتا ہے۔ یہ آپ کو کوے لگتے

ہیں؟... ذرا دھیان سے دیکھیے!"

ان کی آواز اچانک دھیمی پڑ گئی۔ "آپ سوچتے ہیں، یہ اپنی بھوک مٹانے آئے ہیں؟... وہ ان پیاسوں کو چکھنے آتے ہیں جو لوگ پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔ یہ نہ آتے تو جنھیں آپ ساتھ لائے ہیں... ان کی پریت آتما بھوکی پیاسی بھٹکتی رہتی... آپ کیا سوچتے ہیں — جسم کے جلنے کے بعد من بھی مر جاتا ہے؟ آپ کو معلوم نہیں، کتنا کچھ پیچھے چھوٹ جاتا ہے۔ آپ قسمت والے ہیں کہ میں نے بلایا اور یہ آ گئے... کبھی کبھی تو لوگ گھنٹوں انتظار کرتے رہتے ہیں اور یہ کہیں دکھائی نہیں دیتے!"

"کیا آپ کی آواز سن کر ہی...؟"

"آواز نہیں... بلانے کا بھاؤ آنا چاہیے... اپنے کو پریت آتما سے اس طرح ملا دینا چاہیے کہ ان کی پیاس، ترشنا، چاہت، ان کی استھیوں سے اٹھ کر آپ کی پکار میں اس طرح گھل جائے کہ پتا بھی نہ چلے کہ یہ مردے کی آواز ہے یا زندہ کی... ذرا اُدھر دیکھیے!"

انھوں نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

ہوا میں سرسراہٹ سی ہوئی تھی، جیسے کسی نے اسے جھٹکا دے کر ہلا دیا ہو... ہم دونوں کی آنکھیں ایک ساتھ اوپر اٹھی تھیں۔ ان کے مہمان ایک ساتھ پنکھ پھڑپھڑاتے ہوئے اوپر اٹھ رہے تھے اور ایک ایک کر کے ہمارے سروں کے اوپر سے گزر رہے تھے، اتنے پاس سے کہ کبھی کبھی ان کے پنکھوں کا اڑتا ہوا لمس سر اور ماتھے پر ایک جھرجھری سی گرماہٹ چھوڑ جاتا تھا... پھر اچانک انھوں نے ایک اڑان بھری اور وہ ندی کے پار دکھائی دیے، جہاں ایک کو دوسرے سے الگ کر پانا ناممکن تھا۔ ایک بار وہ نیچے پھیلے ہوئے آکاش کے آلوک منڈل میں کالی چمکیلی کوند میں دکھائی دیے اور پھر پہاڑیوں کے پیچھے، جہاں سے نیچے اترے تھے، ہمیشہ کے لیے لوپ ہو گئے۔ پھر کچھ بھی دکھائی نہیں دیا۔

خالی آکاش، ندی کی کلکل، ہوا... کچھ بھی نہیں۔

"جائیے... یہاں بیٹھ کر کیا ہوگا... وہ گئے، انھیں بھی بہا دیجیے۔" انھوں نے استھیوں کی تھیلی میرے ہاتھ میں پکڑا دی۔

"کیا ہو گیا آپ کو؟... اس طرح کیوں بیٹھے ہیں؟... آپ اسی کے لیے تو آئے تھے..."

Scanned with CamScanner

میں بیٹھا رہا، ساکت، شونیہ، خالی، پتھروں کے بیچ ایک پتھر۔

وہ مجھے ہلا رہے تھے۔

"آپ رو رہے ہیں؟"

خود مجھے پتا نہیں تھا، وہ کہاں سے، کیسے نکل آئے تھے — آنسو — کیا وہ بھی اس گھڑی کی راہ دیکھ رہے تھے؟

"آپ نے بتایا نہیں، کون لگتے تھے آپ کے؟"

کیسے انھیں بتاتا، جو میں خود نہیں جانتا تھا... کیا ایسے رشتے ہوتے ہیں جن کا کوئی نام نہیں ہوتا؟

میں نے تھیلی ہاتھ میں لی اور گرتا پڑتا پانی میں چلا آیا... دھیرے دھیرے قدم بڑھاتا ہوا وہاں چلا آیا جہاں ندی کی دھارا پتھروں سے ٹکراتی، دودھیا پھین کو پھیلاتی پوری رفتار سے بہہ رہی تھی۔ تھیلی کو نیچے جھکایا ہی تھا کہ سرپانے پھنکارتے ہوئے بجلی کی طرح جھٹکے سے انھیں میرے ہاتھ سے چھین لیا، استھیوں کا ڈھیر لمحے بھر کے لیے پانی کی سطح پر اٹھا اور پھر بہتا ہوا آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔

پانی میں کھڑا میں دور جاتا ہوا انھیں دیکھتا رہا جو کہیں نہ تھے اور تب ایک لمحے کے لیے مجھے لگا جیسے میں بہت ہلکا ہو گیا ہوں، مانو میرا کوئی ایک حصہ بھی ان کے ساتھ بہہ گیا ہے۔ میں جہاں واپس لوٹوں گا، وہ نہیں ہوں گا جو انھیں اپنے ساتھ لایا تھا... نہ وہ جوان کے پاس آیا تھا۔

پتا نہیں، مرنے کے بعد آدمی دوسرا جنم لیتا ہے یا نہیں، پر جو پیچھے رہ جاتے ہیں، ان کے دوسرے جنم کی آشا بن جاتی ہے...

لوٹتے ہوئے صرف ان کی آواز سنائی دیتی رہی۔ وہ میرے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ ان کی آواز بخار کے اٹھتے جوار میں اونچی نیچی ہوتی تھی — ان کے چھاتے کی طرح جو میرے اوپر نیچے ڈول رہا تھا۔

صرف اتنا یاد ہے، وہ مجھ سے رک جانے پر اصرار کر رہے تھے۔ کہہ رہے تھے، ایسے بخار میں سفر کرنا ٹھیک نہیں ہوگا۔ جب تک اچھا نہیں ہو جاتا، ان کے گھر میں رہ سکتا ہوں۔ شاید میں رک بھی جاتا — ان کے گھر نہیں تو کسی ہوٹل یا دھرم شالا میں۔

لیکن جب بس اسٹیشن پہنچا تو پتا چلا، بس چھوٹنے میں کچھ ہی دیر ہے۔ میں نے جلدی سے

ان کے ہاتھ میں کچھ روپے پکڑائے اور ان کی مخالفت کے باوجود بس میں گھس گیا۔ سو بچ گیے سے بس آدمی سے زیادہ خالی تھی۔ اپنی سیٹ پر بیٹھ کر کھڑکی سے باہر جھانک کر انھیں شکریہ کہہ ہی رہا تھا کہ وہ چھوٹ گئی۔ آخر تک ان کا ہوا میں ہلتا ہاتھ اور ڈولتی چھتری ہی دکھائی دیتی رہی۔

سال گزرتے گئے۔ میں اس شہر میں دوبارہ نہیں جا سکا۔ صاحب جی کو سرپا میں بہا کر میرے بھیتر وہ سب کچھ بہہ گیا جس سے دنیا بنتی ہے۔

کیا تیا کو معلوم تھا، میں اب نہیں لوٹوں گا؟... وہ غلط تھیں۔ میں بار بار رات کی نیند میں، دن کی روشنی میں، سڑک پر چلتے ہوئے، ٹیبل لیمپ کے نیچے اکیلے میں پڑھتے ہوئے، وہاں چلا جاتا ہوں جس کا نام نقشے میں نہیں ہے۔ صاحب جی کی اٹلس میں بھی نہیں۔

ایک کھویا ہوا شہر، جس میں میں نے اپنے کو کھو جا تھا

کیا وہ اب بھی وہاں ہیں، سیب کے باغیچے میں تاروں کے جھرمٹ کو دیکھتے ہوئے، جہاں اب بھی آکاش گنگا بہتی ہے؟ اور وہ سمندر، جو کلینک کی کھڑکی سے ایک شام ڈاکٹر سنگھ نے دکھایا تھا، جہاں سے وہ شہر لاکھوں سال پہلے اوپر آیا تھا؟

کیا اسی لیے وہ ہنسی تھیں، جو نیچے جا رہی تھیں، مانو انھوں نے کچھ دیکھا تھا جو اوپر کھڑے جیوت لوگ بھی نہیں دیکھ پائے؟

صرف سن پاتے تھے، ان نایاب لمحوں میں، جب بسنت کی کسی شام اماجی اپنے کمرے میں پیانو بجاتی تھیں۔ وہ جو خود بے گھر تھیں، پیانو پر اپنی انگلیوں سے شرنارتھی آتماؤں کو اپنے پاس بلاتی تھیں۔ ٹھنڈ میں ٹھٹھرتے ہوئے بھکاری کو مانو کوئی بھیتر بلاتا ہے...

میں سنتا تھا اور سوچتا تھا، کیا میں سچ مچ وہاں گیا تھا جہاں سب کچھ بیت چکا تھا؟

Scanned with CamScanner

سہ ماہی ادبی کتابی سلسلے "آج" کی اشاعت ستمبر 1989 میں کراچی سے شروع ہوئی اور اب تک اس کے 71 شمارے شائع ہو چکے ہیں۔ "آج" کے اب تک شائع ہونے والے خصوصی شماروں میں گابریئل گارسیا مارکیز، "سرائیوو سرائیوو" (بوسنیا)، نرمل ورما، اور "کراچی کی کہانی" کے علاوہ عربی، فارسی اور ہندی کہانیوں کے انتخاب پر مشتمل شمارے بھی شامل ہیں۔

"آج" کی مستقل خریداری حاصل کر کے آپ اس کا ہر شمارہ گھر بیٹھے وصول کر سکتے ہیں اور "آج کی کتابیں" اور "سٹی پریس" کی شائع کردہ کتابیں 50 فیصد رعایت پر خرید سکتے ہیں۔
(یہ رعایت فی الحال صرف پاکستانی سالانہ خریداروں کے لیے دستیاب ہے۔)

چار شماروں کے لیے شرح خریداری (بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)
پاکستان میں: 800 روپے
بیرون ملک: 80 امریکی ڈالر

آج کے کچھ پچھلے شمارے محدود تعداد میں دستیاب ہیں

اس کے علاوہ ماہنامہ "شب خون" الہ آباد
کے بھی کچھ پچھلے شمارے محدود تعداد میں دستیاب ہیں

Scanned with CamScanner

نئی کتابیں

نئے نام کی محبت

نظمیں

تنویر انجم

Rs.350

یاقوت کے ورق

نظمیں

علی اکبر ناطق

Rs.200

ہندی کہانیاں: ۲

انتخاب اور ترتیب

اجمل کمال

Rs.350

بالوں کا گچھا

(ناول)

خالد طور

Rs.500

Scanned with CamScanner

توشیرو یامازاکی

انگریزی سے ترجمہ: سعیدالدین

نغمۂ ذات

—پیر—

میں نے زبان پینے کی کوشش کی
میں نے اسے چائے کی پیالی میں ڈال کر خوب چلایا
اور پی گیا
اس کا ذائقہ شرمشو کی طرح تھا
ایک گھنٹے بعد میں نے خون کی ایک بھرپور قے کی
چمکیلا سرخ خون
میں خون کے اس چمکیلے سرخ سمندر میں جا گرا
—زبان کا مسترد کیا جانا—

—منگل—

میں نے زبان کو کھانے کی کوشش کی
اسے سبزیوں کے سلاد میں ملایا
اور اس پر یہ چمکیلا سرخ سمندر چھڑک کر

اسے کھایا
اس کا ذائقہ ازلی گناہ کا سا تھا
دوسرے دن مجھے اسہال ہو گئے
میں نے حروف تہجی کو ٹائلٹ کے پیالے کی تہہ میں ناچتے ہوئے دیکھا
—زبان کی بدہضمی—

—بدھ—
میں نے زبان کو پہننا چاہا
میں جینز پہنے تھا اور قمیص کی جگہ میں نے
اپنی کھال پر زبان چڑھالی
یہ جلد کی طرح چپک گئی
یوں مجھے اپنی شناخت محسوس ہوئی
لیکن اب میں کپڑے اتار نہیں سکتا تھا
اور میں جان گیا تھا کہ اب زبان سے چھٹکارا ممکن نہیں
بالآخر میں نے اپنی کھال کو زبان سمیت چھیل کر اتار دیا
—زبان اور کھال کا ملاپ—

—جمعرات—
میں نے زبان کے ساتھ سونے کی کوشش کی
میں پاجامے میں سویا تھا اور زبان بالکل خاموش تھی
ساری رات میں خوفناک خواب دیکھتا رہا
صبح میں نے محسوس کیا کہ زبان میری آبروریزی کرتی رہی تھی
اور میری کمر پر حروف تہجی کھدے ہوئے ہیں

Scanned with CamScanner

—زبان کی جارحیت—

—جمعہ—

میں نے زبان کے ساتھ غسل کی کوشش کی
زبان کے ساتھ نہایا
زبان نے پانی میں تحلیل ہو کر
تیزی سے نالی کا رخ کیا
میں نے شاور بند کر کے قہقہہ بلند کیا
شاور پھر سے کھولا
زبان پانی کے ساتھ بہہ رہی تھی
میں نے زبان کو اپنے آپ پر انڈیلا
زبان میرے بدن سے پھر بھی نہ بہی
—سیال زبان—

—ہفتہ—

میں نے زبان کو جلا ڈالنے کا فیصلہ کیا
میں نے اپنے کمرے اور اپنے بدن پر گیسولین چھڑکی
اور خود کو آگ لگا دی
میں شعلوں میں گھرا ہوا تھا
جب میں نے دیکھا زبان سخت مصیبت میں ہے
میں بہت مسرور ہوا
اتنا سرور مجھے پہلے کبھی نہیں ملا تھا
میں ہر چیز کا انت جان گیا

Scanned with CamScanner

زبان کا المیہ

ایک دن
میں نے پھر سے جنم لیا
اب میں ایک لافانی خاموش دنیا میں رہ رہا تھا
میں نے گونگے بہرے
اور اندھے پن میں جنم لیا تھا
میں خوش تھا
میں نے حقیقت کو پا لیا تھا
اس کے بعد
کسی نے میری ذات کو ہراساں کیا
نہ میرے جسم کو

توشیرو یامازاکی (Toshiro Yamazaki) 1960 میں جاپان کے شہر چیبا (Chiba) میں پیدا ہوئے اور تیو کالج آف کیلیفورنیا میں انگریزی شاعری کے طالبعلم ہیں۔ ان کی یہ نظم سان فرانسسکو سے شائع ہونے والے رسالے City Lights Review کے شمارہ 2 سے لی گئی ہے۔

Scanned with CamScanner

سعیدالدین

ریت

ریت پر سویا ہوا ہے آدمی
اس میں سرے سے کوئی جنبش ہی نہیں
مجھے ہول ہوتا ہے
میں اس کے پاس جاتا ہوں
وہاں ریت کا ایک ڈھیر ہوتا ہے
میں اس ڈھیر کو ہاتھ سے چھوتا ہوں
میرے پنجے کا نشان ریت پر بن جاتا ہے
پھر یہ نشان
پانی سے نکلی ہوئی مچھلی کی طرح تڑپنے لگتا ہے
اور کچھ دیر بعد ساکت ہو جاتا ہے
میرے ہاتھ سے چپکی ریت
جب سے میرے ساتھ ساتھ چلتی رہی ہے
میں نے اسے کئی بار ہاتھ سے جھڑنا چاہا
بار بار ہاتھ کو پانی سے دھویا بھی
لیکن ریت ہاتھ سے چھوٹتی ہی نہیں

Scanned with CamScanner

راہ چلتے ہوئے میں اپنا ہاتھ
جیب میں چھپا کر چلتا ہوں
لیکن مصافحہ کرنے کے لیے تو
ہاتھ جیب سے نکالنا ہی پڑتا ہے
مجھ سے مصافحہ کرنے کے بعد
کوئی آدمی پہلے جیسا نہیں رہتا
کچھ دور جا کر
وہ اپنے ہاتھ سے لگی ریت کو
جھاڑنے کی کوشش کرتا ہے
اور ریت کے ڈھیر میں تبدیل ہو جاتا ہے
ہر گلی اور محلے میں
ہر گھر کی دہلیز پر
آپ کو ریت کے یہ ڈھیر دکھائی دیں گے
ان پر میری انگلیوں کے نشان بھی ملیں گے
خود میری پیٹھ پر بھی
ایسا ہی ایک نشان ہے

ایک دن یہ سارے ڈھیر یکجا کر دیے جائیں گے
ایک بڑا سا ڈھیر بنا دیا جائے گا
یہ سارا کام
ایک شخص تن تنہا کرے گا
پھر وہ ڈھیر پہ سے اس نشان کو
اٹھا کر اپنی جیب میں رکھ لے گا

Scanned with CamScanner

اور وہ اسی ریت پر
پڑ کر سو جائے گا

نظم

کوئی سخت پھل کاٹتے ہوئے
اس نے اپنے خواب میں
اپنی انگلی کاٹ لی
جسم سے علیحدہ ہو جانے والی انگلی نے
ریت پر لکیریں بنانا شروع کر دیں
کچھ ادھورے نقوش ابھارے
پھر وہ یک لخت بھڑک اٹھی
سبز سرخ اور دودھیا روشنی نکالنے کے بعد
یہ انگلی راکھ میں تبدیل ہو گئی
راکھ سے پھوٹنے لگا
ایک ننھا سا پودا
اس کی نازک پتیوں پر یوں گمان ہوتا تھا
گویا شاخوں سے نازک نازک سی انگلیاں نکل رہی ہوں
یہ سب کچھ محض ایک خواب تھا
خواب سے جاگنے کے بعد
وہ سنجیدگی سے اس خواب کے بارے میں سوچتا رہا
پھر ہنس دیا

Scanned with CamScanner

اس نے اپنی ہتھیلی چھپائی
ٹھیک اس جگہ
جہاں اس کی انگلی خواب میں علیحدہ ہو گئی تھی
وہاں انگلی ہی نہ تھی
اس کا سارا بدن دھندلانے لگا
ساتھ ہی
اس پودے کے نقوش واضح ہونے لگے
جس کی نازک شاخوں میں
نازک نازک انگلیاں نکل رہی تھیں

نظم

بہت سے برہنہ اعضا
مجھے ہر طرف سے اپنی موجودگی احساس دلا رہے ہیں
اپنی اپنی خوشبوؤں کے ساتھ
یہ مجھ سے پوری طرح لپٹے نہیں
بس اپنے نرم گرم وجود سے
مجھے بار بار چھو کر گزر جاتے ہیں
مردانہ اور زنانہ
ہر طرح کی خوشبوئیں اور لمس
میرے اپنے اعضا کو اٹھنے پر مجبور کر دیتے ہیں
پر یہ سب اعضا ہیں

Scanned with CamScanner

میں اندھیرے میں انھیں ٹٹولتا ہوں
تو یہ کسی بھی جسم کی طرف مجھے نہیں لے جاتے

خود میرے اعضا
جو بار بار چھوئے جانے پر مشتعل ہو جاتے ہیں
الگ الگ ہی ہیں
ایک قصر ہے
جس میں بہت سے اعضا
ایک لایعنی کارروائی میں مصروف ہیں
ایک اندھیری گپھا میں
ایک دوسرے سے کھیلتے ہوے
ایک دوسرے میں کھنچاؤ اور حرارت پیدا کرتے ہوے
مل کر مکمل جسم بننا چاہتے ہیں
مرد اور عورت کے جسم
لیکن جیسے ان اعضا کے بیچ
کچھ دندانے دار چھریاں
اور درانتیاں بھی وجود رکھتی ہیں
جو انھیں ایک مکمل جسم بننے سے روک رہی ہیں
اور انھیں بار بار
قطع کیے دے رہی ہیں

Scanned with CamScanner

وینا ملک

کوئی اندازہ نہیں کر پایا
وینا ملک
مچھلی کی طرح
کئی پھندوں، مکروں اور ترغیبوں کے جال سے
صاف نکل گئی
اس کا بدن
اپنے پیچھے ایک سیمابی لکیر چھوڑتا چلا گیا
اناج کی بوریوں کی طرح
مولویوں کے جسم
دیر تک اسے اپنے عماموں میں ڈھونڈتے رہے
اور پھر افغانی، ایرانی اور عربی قالینوں میں
دھنس گئے

وینا کو تلاش کرنے کے لیے
تازی کتے درآمد کیے گئے
لیکن انھیں سنگھانے کے لیے
وینا کے کپڑے دستیاب نہیں ہوئے
کپڑوں کا کم سے کم استعمال
وینا ملک کے حق میں بہتر ثابت ہوا
اچانک ایک دن

Scanned with CamScanner

وینا ان کتوں کے سامنے بیٹھی دیکھی گئی
جنھیں اس کی بو پر لگایا جاتا تھا
وینا کو دیکھ کر کتے
دم ہلانے اور اس کے پاؤں چاٹنے لگے
وینا ملک کچھ دیر ان کتوں کے ساتھ کھیلتی رہی
پھر وہ غائب ہو گئی

ان کتوں کو گولی مار دی گئی تھی
اب وہ کام کے نہیں رہ گئے تھے .
وینا کو ان کتوں کے سوگ میں
کئی راتیں
اندھیرے میں دوڑتا دیکھا گیا
اس کے بدن پر ایک دھجی بھی نہ تھی
اور اس کی رفتار
روشنی کی رفتار سے زیادہ تھی

شہر میں جابجا ایسے ہتھیار نصب کر دیے گئے ہیں
جو روشنی سے تیز رفتار
کسی بھی شے پر وار کرنے کے لیے
خصوصی طور پر ڈیزائن کیے گئے ہیں
لیکن لاکھوں دل
وینا ملک کے ساتھ دھڑک رہے ہیں
جو اگرچہ وینا کو تحفظ کی ضمانت نہیں دے سکتے

Scanned with CamScanner

پروینا ملک کو ذرا سی گزند پہنچنے پر
یہ دل ایک ساتھ بند ہو سکتے ہیں
لاکھوں دلوں کا ایک ساتھ بند ہونا
ایک ایسا ویکیوم پیدا کر سکتا ہے
جسے پُر کرنے کے لیے
لاکھوں لڑکیاں
اپنا لباس ترک کرنے کو تیار ہیں

چھاتیاں

ایک دن مجھے بہت سے کیڑے چاٹ رہے تھے
میں نے دیکھا
اپنے بدن کو لاتعداد ٹکڑوں میں تقسیم ہوتے
ایک دن ایک لکڑبگھا
مجھے گھسیٹ کر لے جا رہا تھا
ایک دن ایک اژدہا
مجھے سالم ہی نگل رہا تھا
یہ سب کچھ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا
پھر ایک دن میری آنکھیں
اپنے حلقوں سے نکل کر دوڑنے لگیں
ایک دن میں نے اپنا سر
میز پر رکھے ایک گلدان میں سجا ہوا دیکھا

Scanned with CamScanner

اسی میز پر سر جھکائے
ایک لڑکی مجھے اسکیچ کر رہی تھی
لڑکی کی ڈرائنگ اگرچہ اچھی نہیں تھی
لیکن اسے اس قدر منہمک دیکھ کر
میں بہت متاثر ہوا
مجھے خواہش ہوئی
کہ میں اس لڑکی کا بوسہ ہی لے لوں
مگر میرا دھڑ غائب تھا
میری ڈرائنگ اس لڑکی سے کہیں زیادہ بہتر تھی
اور میں اس کی چھاتیاں بنانا بھی چاہتا تھا
جو اس کے کھلے ہوئے گریبان سے جھانک رہی تھیں
لیکن میرا بقیہ جسم وہاں نہیں تھا۔
اسے شاید جنگلی جانور بھنبھوڑ رہے ہوں
ڈرائنگ میں معمولی دستگاہ رکھنے کے باوجود
لڑکی نے میرے چہرے کی اداسی کو
بھرپور طریقے سے کاغذ پر منتقل کر دیا تھا
لیکن وہ میرے نچلے دھڑ کو
بار بار کوشش کے باوجود
بنانے میں ناکام رہی تھی
مجھے لگا وہ میرے جسم کو
جنگلی جانوروں سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کر رہی ہے
کیا اسے معلوم ہے
اگر وہ اس کوشش میں کامیاب رہی

اور میرا جسم پوری طرح بازیاب کر اسکی
تو میرے ہاتھ
سب سے پہلے
کس چیز کو چھو لینا چاہیں گے؟

گھر کا راستہ

سچ پوچھیں تو
میں نے اپنی ماں کو
اس بات پر آج تک معاف نہیں کیا
کہ وہ مجھے بتائے بنا
چند گھنٹے کے لیے مجھے اکیلا چھوڑ گئی تھی
جب میں ابھی بہت چھوٹا تھا
جب وہ لوٹ کے آئی
تو وہ وہ نہ تھی
کوئی اور تھی
پر ساری عمر
اس نے مجھے اسی دھوکے میں رکھنے کی کوشش کی
کہ وہ پہلے والی ہی ماں ہے
اسی بات پر اکثر
میرے اور اس کے درمیان جنگ چھڑ جاتی
ایک دن ماں نے مجھے بتایا

Scanned with CamScanner

اس کی ماں نے بھی اس کے ساتھ یہی سلوک کیا تھا
اور اس کی ماں کے ساتھ
اس کی ماں کی ماں نے بھی
تو کیا تم نے اپنی ماں کو معاف کر دیا تھا؟
اور کیا لوٹ کے آنے والی ماں
پہلے والی ماں ہی تھی؟
میرے سوالات پر میری ماں کی نظریں جھک گئی تھیں

ہمیں جنم دینے والی مائیں
اور ہماری پرورش کرنے والے باپ
ایک دن ہم سے جھوٹ بول کر نکلتے ہیں
اور جب وہ لوٹ کر آتے ہیں
تو وہ وہ نہیں ہوتے
ہمارے سوالات پر
ان کی نگاہیں نیچی ہوتی ہیں

آج میں اپنے بچے سے جھوٹ بول کر گھر سے نکلا ہوں
اور بس
کیا بتاؤں
میں اپنے گھر کا راستہ بھول گیا ہوں

Scanned with CamScanner

آدمی کا نشہ

دو شرابی درخت
اپنا بڑا سر ہلا ہلا کر جھوم رہے ہیں
سورج کے جام سے
آج انھوں نے
کچھ زیادہ ہی چڑھا لی ہے
اب وہ
اپنی شاخوں میں بیٹھے
پرندوں کی چہکار سے زیادہ
سڑک پر چلتے ٹریفک کے شور کو
انہماک سے سن رہے ہیں
دونوں شرابی درخت
جڑوں سمیت
سڑک پر آگرے ہیں
ٹریفک جام ہو جاتا ہے
بسیں، کاریں
اسکوٹر اور سائیکلیں رک جاتی ہیں
ہارن بجنا شروع ہو جاتے ہیں
مگر نشے میں دھت درخت
جڑوں سمیت
سڑک کے بیچوں بیچ پڑے ہیں

Scanned with CamScanner

بسیں اور کاریں ان کے قریب آ کر
درختوں کو چھوتی ہیں
اور انھیں
سڑک کے دائیں یا بائیں ہٹانے میں جُت جاتی ہیں
لیکن اسی دوران
شراب کی بو انھیں بھی
بدمست کر دیتی ہے
وہ بھی سڑک کے بیچوں بیچ ناچنے لگتی ہیں
پھر تو بل کھاتی سڑک بھی
اٹھ کھڑی ہوتی ہے
اور ٹھمکے لگانے لگتی ہے
گھر تھرتھرا اٹھتے ہیں
ان میں سوئے ہوئے مکین
ہڑبڑا کر جاگ جاتے ہیں
انھیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آتا
شرابی درختوں
نشے میں دھت بسوں، کاروں
اور بدمست ناچتی سڑک کو
شہر میں بسنے والے لوگوں کی
کوئی پروا نہیں

یہ دیکھ کر
آدمی کا نشہ

Scanned with CamScanner

ہرن ہو جاتا ہے

خالی فریم

دو AK47 رائفلز
ایک ہینڈ گرینیڈ
ایک ریپیٹر
اور دو سو پچھتر کارتوس
مجرم کے پاس سے برآمد ہوتے ہیں
یہ سب پکڑ چھین لیے جانے کے بعد
جو باقی بچا تھا
وہ ایک بے کار فریم تھا
جسے
کسی کباڑ خانے میں ڈال دیا گیا

نظم

میں اسے بلاتا ہوں
اور وہ آ جاتا ہے
میری کتابوں کے ورق اُلٹ پلٹ کرتا ہے
پھر وہ میری میز پہ پاؤں رکھ کر

Scanned with CamScanner

کرسی پر نیم دراز ہو جاتا ہے
ہم دونوں
کوئی بات نہیں کرتے
نہ سگریٹ جلانے کے لیے
ایک دوسرے کو لائٹر پیش کرتے ہیں
اس کا بس چلے تو وہ مجھے ہلاک کر دے
میرے بھی اس کے بارے میں
یہی کچھ جذبات ہیں
اس کے باوجود
جب بھی میں اسے بلاتا ہوں
وہ آجاتا ہے
میرے بلاوے میں نہ اصرار ہوتا ہے
نہ دھمکی
نہ کوئی شرط
یہ وہ بھی جانتا ہے
میرے بلاوے میں
کسی خواہش کی رمق نہیں
ہم دونوں
کسی بھی دن
اپنے قریب ترین ستون کی اوٹ لے کر
ایک دوسرے کو نشانہ بنانے کی کوشش کر سکتے ہیں
لیکن
زندہ بچنے والے کے مقابلے میں

Scanned with CamScanner

مر جانے والا
زیادہ خوش نصیب ثابت ہو گا
بچنے والے کو
ہلاک ہونے والے کا جسم
اٹھا کر چلنا ہو گا
اس کے خون آلود کپڑے اتار کر
اسے صاف ستھرے کپڑے پہنانے ہوں گے
مرنے والے کی لاش کو
کسی بھی قسم کے خوردبینی کیڑوں سے
محفوظ رکھنے کے لیے
جتن کرنا ہوں گے
پھر اس کی لاش کو
سہارا دے کر
کسی آرام دہ کرسی پر بٹھانا ہو گا
اس کے منھ سے سگریٹ لگانا ہو گا
اسے لائٹر بھی پیش کرنا ہو گا
بلکہ اس کی موت کو
اپنی موت سمجھتے ہوئے
دو قبریں
برابر برابر کھودنی ہوں گی

Scanned with CamScanner

نظم

"مشکیزے کا پانی اسی ریت پر ڈال دو
اور ننگے پاؤں میرے پیچھے چلے آؤ"
میں نے سارا پانی ریت پر گرا دیا
اور ننگے پاؤں اس کے پیچھے ہو لیا
کئی صحرا ہم نے عبور کر ڈالے
زہریلے کانٹوں اور زہریلے کیڑوں پر پاؤں رکھتے ہوئے
ہم آگے بڑھتے رہے
اچانک مجھے محسوس ہوا
کہ میں تو صحرا میں اکیلا ہی چلا جا رہا ہوں
تو کیا اس نے میرے ساتھ دھوکا کیا؟
میں تو صحرا کے بیچ سمت کا تعین کرنے سے بھی قاصر تھا
وہ چند قدم آگے ہی تو تھا مجھ سے
پھر وہ اچانک جانے کس بل میں چھپ گیا
میں نے اسے بہت پکارا
لیکن میری آواز تو صحرا میں ایسے بکھر کر رہ گئی
جیسے میرے مشکیزے کا پانی
ریت میں جذب ہو گیا تھا

جب تم صحرا میں اپنا مشکیزہ چھوڑ آئے
جب تم ایک سانپ کے ساتھ ہو لیے

Scanned with CamScanner

اور تمھیں پتا ہی نہ چلا کہ وہ کس بل میں جا چھپا ہے
تو تمھارے پیر گڑنے سے
صحرا میں چشمہ تو ابلنے سے رہا

میرے مشکیزے میں پانی نہیں تھا
میرے پاؤں ننگے تھے
مجھے کسی منزل کا پتا نہیں تھا
اور کسی سمت کا تعین تک کرنے سے
میں قاصر تھا
میرے پاس بس ایک ہی راستہ رہ گیا تھا
سو میں نے اپنے پاؤں سے کانٹا نکالا
اور ریت میں بو دیا
چند گھنٹوں میں وہ ایک سایہ دار درخت میں تبدیل ہو گیا
اور اس میں عجیب و غریب پھل پیدا ہو گئے
میں زہریلے
اور غیر زہریلے پھلوں میں تمیز نہیں کر سکتا تھا
اور میرے لیے
کوئی من و سلویٰ بھی آسمان سے اترتا نہیں تھا
سو میں نے ان پھلوں کو رغبت سے کھایا
اتنے میں شام ہو گئی
اور صحرا کی تاریکی میں
صحرا کے زہریلے کیڑے مکوڑے
اپنے بلوں سے نکل کر میرے بدن سے چمٹ گئے

Scanned with CamScanner

میں نے درخت سے ایک شاخ توڑی
اور ساری رات
اپنے آس پاس رینگنے والے کیڑوں کو
مارنے میں گزار دی
صبح دوسرے کیڑوں کے ساتھ ساتھ
مجھے اس کی لاش اپنے پیروں کے آس پاس ہی ملی
جس کے حکم پر میں نے اپنے مشکیزے کا پانی
ریت پر گرا دیا تھا
اور ننگے پیر اس کے پیچھے ہو لیا تھا
شاید میں نے اندھیرے میں
درخت کی شاخ سے اسے بھی کچل دیا تھا
میں نے درخت کو دیکھا
مگر وہاں تو سرے سے کوئی درخت تھا ہی نہیں
میں نے آگے بڑھنے کی ٹھانی
پھر مجھے اندازہ ہوا
کوئی میرے ساتھ ساتھ چل رہا ہے
میں نے اسے مخاطب کیا
اور اسے مشکیزے کا پانی ضائع کرنے کا حکم دیا
اور اس کے آگے آگے چلنے لگا

سُرمئی ندی

یہ واقعہ سرمئی ندی کے پاس پیش آیا

Scanned with CamScanner

ایسے کہ گاؤں کے گاؤں مسمار ہو گئے
ان کے مکینوں کا کوئی سراغ ہی نہیں ملا
کوئی نہیں جانتا
اس سارے واقعے کا چشم دید گواہ
کوئی ہے ہی نہیں
سوائے سرمئی ندی کے
سرمئی ندی کے بارے میں
بہت سی باتیں مشہور ہیں
دس بیس سال بعد
سرمئی ندی
اپنی آنکھوں میں سرمہ لگاتی ہے
وہ آنسوؤں کی طرح سست روی کے ساتھ بہتی ہے
وقت کے ساتھ ساتھ اس کا پانی
نمکین اور پھر تلخ ہو جاتا ہے
اور اس کا رنگ بھی سیاہ پڑ جاتا ہے
پھر اچانک ہی
اس کے آس پاس کی بستیاں
ناپید ہو جاتی ہیں
اور وہاں رہنے والے بھی
لاپتا ہو جاتے ہیں
پھر جانے کیسے سرمئی ندی کا پانی
دھیرے دھیرے صاف ہونے لگتا ہے
اور اس کی کڑواہٹ بھی زائل ہو جاتی ہے

Scanned with CamScanner

اور اس کے جل کی مٹھاس چکھنے
لوگ دور دور سے آتے ہیں
اور یہیں مستقل پڑاؤ ڈال لیتے ہیں

بے دخلی

جانا ہوگا تمھیں یہاں سے
یہ کمرہ خالی کرنا ہوگا
یہ بستر اب تمھارا نہیں

میں نے اپنا تھیلا اٹھایا
اور باہر نکل گیا
میں نے اپنی چیخیں تک نہیں سنی تھیں
کچھ دور تک تو مجھے اپنے آس پاس
دائیں بائیں
آوازیں محسوس ہوئیں
لیکن رفتہ رفتہ پھر وہی سکوت چھا گیا
شاید ان آوازوں کا مخاطب میں نہیں تھا
وہ کمرہ میرا نہیں رہ گیا تھا
نہ وہاں بستر میرا تھا
نہ کچھ اور
جن آوازوں کو میں اپنے آس پاس سمجھ رہا تھا

Scanned with CamScanner

وہ تو ایسی تھیں
جیسے دیوار سے پلستر گر رہا ہو
یا جیسے دیمک زدہ درخت کی جڑیں
زمین کو چھوڑ رہی ہوتی ہیں
میں نے محسوس کیا
میرے پاؤں کے ساتھ
چپکے چل رہے تھے
چند سائے
چند روشنیاں
پھر تو کنکر، ٹھیکرے، پتھر بھی
میرے ساتھ چلنے لگے
میں رک گیا
تو جیسے سب کچھ تھم گیا میرے قدموں کے ساتھ
لیکن یہ سب تو جھوٹ تھا
سراسر وہم
یہ مجھے پھر ایک بار
بے دخلی کی طرف لے جاتا تھا
یہ کہتا تھا کہ
"سائے سے تمھارا کوئی سمبندھ نہیں
نہ کوئی روشنی تمھاری ہے
تم اپنے ساتھ
یہ کنکر، پتھر اور ٹھیکرے بھی نہیں لے جا سکتے
تمھیں سب کچھ چھوڑ کر جانا ہوگا

Scanned with CamScanner

اپنے پاؤں بھی"

نظم

میں کب سے اس تابوت میں پڑا ہوں
جسے بگھی میں لے کر تم
گھوڑوں کو سرپٹ دوڑائے جا رہے ہو
دیکھو، گھوڑے بری طرح ہانپ گئے ہیں
وہ پسینے میں شرابور ہیں
اور ان کے منھ سے کف اڑ رہا ہے
دیکھو، تمھارے کوڑے کی شائیں شائیں سے
ہوا بھی زخمی ہے
مجھ سے زیادہ تمھارا جسم
دریدہ حالت میں ہے
تم چاہو تو
تھوڑی دیر میرے تابوت میں آرام کر سکتے ہو
ہم گھوڑوں کو اندھیرے میں آزاد چھوڑ دیں گے
تمھیں اپنے ہاتھ سے کوڑا رکھ دینا ہوگا
تم اپنے ساتھ
بے زبان جانوروں کی زندگی داؤ پر نہیں لگا سکتے
تم خود کو
موت سے زیادہ تیز رفتار ثابت نہیں کر سکتے

Scanned with CamScanner

اگر میری بات مان لو
تو میں تمھیں وہ خنجر لوٹا سکتا ہوں
جو تم میرے سینے میں گھونپ رہے ہو

نظم

ایک ہجوم
ایک بہت بڑے آئینے کو اٹھائے گزر رہا ہے
آئینہ کسی بھی قابلِ ذکر سمندر سے کم وسیع نہیں
آئینہ بردوش لوگ
اس کے کناروں پر
چیونٹیوں کی طرح چمٹے ہیں
ہزارہا لوگ
بار بار کندھا بدلتے ہیں
آگے پیچھے ہوتے ہیں
آئینہ آسمان کا عکس دکھا رہا ہے
بادل، پرندے
اور ہوا کے سارے رنگ
آئینہ بردوش بری طرح ہانپ گئے ہیں
ان کے لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ
آئینہ آڑے ترچھے لشکارے مارتا ہے
آئینہ بردوش جانتے ہیں

Scanned with CamScanner

ان کا عکس
کسی طور بھی
آئینے میں آنے سے رہا
وہ خود بھی آئینے میں دیکھنے کے متمنی معلوم نہیں ہوتے
البتہ وہ
آئینے پر جھکے آسمان پر اپنا عکس دیکھنا چاہتے ہیں
لیکن وہ اس قدر نڈھال ہو چکے ہیں
کہ انھیں
آسمان میں بھی کسی عکس کو دیکھنے میں
دلچسپی نہیں رہی
یوں لگتا ہے
کہ آسمان کو بھی لاتعداد مخلوق
اپنے کندھوں پر اٹھائے چل رہی ہے
یا محض حرکت کر رہی ہے
آئینہ بدوشوں کے پیروں تلے
اب نہ زمین ہے
نہ وہ کوئی فاصلہ طے کر رہے ہیں
اب تو ان کے تن سے اٹھتی بھاپ
آئینے کی سطح پر جمتی جا رہی ہے
آسمان کا عکس
دھندلانے لگا ہے
کچھ پتا نہیں چلتا
آسمان بدوش کون ہیں

Scanned with CamScanner

اور آئینہ بدوش کون
اب تو آسمان اور آئینے کے عکس بھی
ایک دوسرے پر پڑتے دکھائی نہیں دیتے
آسمان بدوش
اور آئینہ بدوش
آئینے اور آسمان کو خلا ہی میں کہیں چھوڑ کر
اپنی کمریں سیدھی کر رہے ہیں
آئینہ اور آسمان
اپنی اپنی دھند میں
معدوم ہوتے جا رہے ہیں

نظم

گھر سے آفس جاتے ہوئے
میں روز سڑک کے دائیں بائیں
درختوں کو گنتا ہوا چلتا ہوں
ہمیشہ گنے ہوئے درختوں کی تعداد مختلف ہوتی ہے
کبھی دو سو بیس
کبھی تین سو گیارہ
کبھی کبھی تو درختوں کی تعداد اتنی بڑھ جاتی ہے
کہ مجھے گزشتہ دن کے اعداد و شمار پر
شک ہونے لگتا ہے

Scanned with CamScanner

پھر ایک دن پتا چلا
راستے کے درخت آدھے بھی نہیں رہے
کیا آدھے درخت کاٹ دیے گئے ہیں؟
لیکن اگلے روز درختوں کی تعداد اتنی تھی
کہ میرا خود پر سے اعتماد اٹھ گیا
مجھے یوں لگا
جیسے کچھ درخت مجھے دیکھ کر
اِدھر اُدھر ہو جاتے ہیں
کچھ دوسرے درختوں کے پیچھے چھپ جاتے ہیں
کچھ درخت راتوں رات اس لیے اگ آتے ہیں
کہ مجھے حیران کر دیں
اور کچھ اس لیے غائب ہو جاتے ہیں
کہ میرا خود پر سے اعتماد ہی جاتا رہے

لیکن یہ بات بھی ایک دن غلط ثابت ہو گئی
میرے گھر سے دفتر تک کے راستے میں
کوئی درخت تھا ہی نہیں
یہ مجھے کئی لوگوں نے بتایا
دوسرے کئی لوگوں نے اس بات کی تصدیق کی
کچھ نے یہ ماننے تک سے انکار کر دیا
کہ اس راستے پر کبھی کوئی درخت بھی تھا

اس روز جب میں اداس اور غمگین

Scanned with CamScanner

آفس سے گھر لوٹ رہا تھا
میرے راستے کے دونوں جانب
درختوں کی قطاریں پیدا ہو گئی تھیں
درخت سڑک پر نیچے تک جھک آئے تھے
ہر گھر کی چار دیواری کے اوپر سے
ایک نہ ایک درخت جھانک رہا تھا
گھروں کی بالکنیوں
اور چھتوں پر اُگ آئے تھے درخت
کچھ درخت تو الٹے ہی کھڑے تھے
کچھ آدھے دیواروں میں
اور آدھے دیواروں کے شگافوں سے
باہر نکل کر
سڑک کو یوں تک رہے تھے
جیسے راہگیروں کو گن رہے ہوں

نظم

میں نے بس محل کے دروازے کو چھوا ہی تھا
کہ وہ آپ ہی آپ کھل گیا
میں اندر داخل ہوا
تو نزدیک و دور
کوئی تھا ہی نہیں

Scanned with CamScanner

شہ نشینوں، دالانوں اور راہداریوں سے گزرتا
جب میں دربار میں پہنچا
تو وہاں سناٹا چھایا ہوا تھا
دربار بھی سونا پڑا تھا
بادشاہ سلامت کا تاج
ایک چھوٹی سی تپائی پر اوندھا پڑا تھا
میں سیٹی بجاتا ہوا
شاہی تخت پر بیٹھ گیا
سر پر تاج رکھ لیا
حکم دیا
"باغیوں کے سردار کو ہمارے حضور پیش کیا جائے"
خالی دربار میں میری آواز
ایوان کے سقف و بام سے ٹکرا کر
شمع دانوں کو خفیف سی جنبش دیتی ہوئی
میرے کانوں میں پلٹ آئی
میں نے تختِ شاہی کے دائیں جانب ٹنگی
تلواروں میں سے ایک اتار لی
اور کچھ دیر اسے شائیں شائیں
اپنے دائیں بائیں احتیاط سے گھمایا
پھر اس کو سامنے رکھی تپائی سے بجا کر
گویا زنجیر سے بوجھل پیروں کا تاثر ابھارنے لگا
میں نے چشمِ تصور میں
باغیوں کے سرغنہ کو حقارت سے دیکھا

Scanned with CamScanner

اور اسے صفائی کا موقع دیے بغیر
اس کا سر قلم کرنے کے احکامات صادر کیے
دربار میں ایسی کوئی چیز نہیں تھی
جسے ستونوں
یا دیواروں سے رگڑ کر
فریاد یا آہ و بکا کا تاثر پیدا کیا جا سکتا
میں نے زینے پر پڑا ہوا کوزا اٹھا لیا
اور ایک ستون پر برسانا شروع کر دیا
لیکن ستون ٹس سے مس نہ ہوا
میں چکرا کر گر پڑا
میں پسینے میں تر بتر تھا
اور بری طرح ہانپ رہا تھا
میں نے چھت پر نصب ایک آئینے میں دیکھا
وہاں ایک شخص
زمین پر یوں نڈھال پڑا تھا
جیسے اسے ابھی ابھی سزائے موت سنائی گئی ہو
یہ میرا ہی عکس تھا
میں بدحواس ہو کر
شاہی محل سے بھاگا
تو صحن میں فوارے کے پاس بیٹھے کبوتر
پھڑ پھڑا کر اڑنے لگے
مجھے یوں محسوس ہوا
جیسے شاہی محل کی خواصیں، کنیزیں

Scanned with CamScanner

اور خواجہ سرا
تالیاں پیٹ رہے ہوں

تصادم

وہ بھی اس شہر میں رہتے ہیں
ہم بھی
پر ہمارے اور ان کے راستے جدا ہیں
ہمارے بیچ کسی قسم کا رابطہ نہیں
پھر بھی ہم ایک دوسرے کے اوقات سے واقف
اور راستوں سے آگاہ ہیں
ایک دوسرے کے اوقات میں
ایک دوسرے کے راستوں سے گزرنے سے
اجتناب کرتے ہیں
لیکن کبھی کبھی گلیاں اور سڑکیں
جگہ سے بے جگہ ہو جاتے ہیں
کوئی سڑک آپ ہی آپ
اچانک دائیں یا بائیں مڑ کر
غیر متوقع کسی سڑک سے جا ملتی ہے
کبھی گھنٹہ گھر کا گھڑیال
رات اور دن میں تمیز کرنے سے
صاف انکار کر دیتا ہے

Scanned with CamScanner

رات کے ایک بجے
دھوپ کی چکاچوند اندھا کر دیتی ہے
کبھی دوپہر میں ہی رات کی تاریکی پھیل جاتی ہے
کچھ سجھائی نہیں دیتا
کہ سامنے سے وہ آ رہے ہیں

یا ہم
ایسے غیر متوقع ٹکراؤ میں
کچھ ٹھیک سے پتا چل نہیں پاتا
کہ گم ہونے والے ان کے تھے

یا ہمارے
ہم اُدھر سے لڑ رہے تھے

یا وہ اِدھر سے
ہم کن راستوں سے آئے تھے
وہ کن راستوں کو گئے

راستوں اور بدلتے رات دن کے اوقات نے
کب ہمارے بیچ تصادم کرا دیا

یہ تصادم
اُن کے اور ہمارے بیچ تھا
یا راستوں اور وقت کے بیچ
گم رہ جانے والے راستے تھے
یا ختم ہو جانے والا
وقت

Scanned with CamScanner

الگ الگ اکائیاں

صبح سے میں اس گھڑی کی ٹک ٹک سن رہا ہوں
جو دیوار سے اچانک غائب ہو گئی ہے
لیکن ہر گھنٹے کے اختتام پر
الارم دینے لگتی ہے
اور پھر ٹک ٹک ٹک
کبھی کبھی یہ ٹک ٹک
مجھے اپنے سینے میں سنائی دیتی ہے
کبھی کلائی کی نبض میں
پھر تو جس چیز کو اٹھا کر کان سے لگاتا ہوں
وہ ٹک ٹک کرنے اور الارم دینے لگتی ہے
اچانک میں اپنے عقب کی دیوار کو دیکھتا ہوں
وہاں مجھے یہ گھڑی
دیوار پر اوندھی چپکی دکھائی دیتی ہے
سامنے کی دیوار سے یہ عقب کی دیوار پر کیسے آ گئی
اور اس کی سوئیاں اور ڈائل دیوار سے چپک کیسے گئے
جیسے اس کا وقت دیوار کے اس پار کے لیے ہو
میں برابر کے کمرے میں جاتا ہوں
اب مجھے وقت دکھ رہا ہے
لیکن گھڑی غائب ہے
اب نہ اس کی ٹک ٹک ہے نہ الارم

Scanned with CamScanner

میں نے چاہا کہ چیزوں کو چھو کر دیکھوں
ٹھیک اس وقت مجھے اندازہ ہوا
میں چیزوں کو دیکھ سکتا ہوں
چھو نہیں سکتا
اس کمرے میں تو میں خود اٹکی ہوئی گھڑی ہوں
یہ کمرہ اور وہ کمرہ
دو الگ الگ اکائیاں ہیں
انھیں ایک نہیں کیا جا سکتا
بس اس کمرے میں تھوڑی دیر کے لیے جھانکا جا سکتا ہے
میں واپس اپنے کمرے میں آ جاتا ہوں
وہاں
جہاں میں ہر چیز کو چھو سکتا ہوں
اور ہر چیز میں
وقت کی یہ ٹک ٹک سن سکتا ہوں
چاہے سامنے گھڑی ہو
یا نہ ہو

Scanned with CamScanner

تنویر انجم

بدل رہا ہے موسم

زمین پر پیر نہیں ہیں میرے
آسمان ہاتھ نہیں بڑھا رہا مجھے تھامنے کو
تیر رہی ہوں کہیں فضا میں
یا بھٹک رہی ہوں کہیں خلا میں
بدل رہا ہے شاید
میری نظموں کا موسم

یہ کیا نظم سوچی ہے

مقدمہ شروع ہو گیا
خواب میں
اس نظم پر
جو میں نے سونے سے پہلے سوچی تھی
کالے جوتے پہنے

Scanned with CamScanner

تین ریش بزرگ
دروازے سے داخل ہوئے
اور بیٹھ گئے ایک بنچ پر
اور پوچھا مجھ سے
"یہ کیا سوچا ہے بھئی"

"میں استری کر رہی ہوں
بعد میں بات کروں گی"

مسکرائی نوجوانوں کی ایک ٹولی
ایک دوسرے کو دیکھ کر
آنکھ مارتے ہوئے
گھورا میں نے انہیں غصے سے تپ کر
"اپنے کام سے کام رکھو بیوقوفو!"

جھنے لگے کونے میں کھڑے چار بچے
"تماشا ہو رہا ہے کیا
کیوں کھڑے ہو یہاں
نکلو باہر میرے گھر سے"

نہیں سنیں کسی نے میری باتیں توجہ سے
اور گھورتے رہے میرے چہرے کو
ستار

Scanned with CamScanner

""اچھا، میری جان بخشیں
بھول جاتی ہوں میں جو نظم سوچی تھی
ہو گیا قصہ ختم
اب جاگنے کی اجازت دے دیں مجھے
مہربانی کر کے"

چھوٹی سی کھڑکی ہے

چھوٹی سی دیوار کی
چھوٹی سی کھڑکی ہے
کیا دیکھنا پسند کرو گے
نیچے کیچڑ ہے، اوپر ستارے
کیچڑ کو تو ہاتھ بڑھا کر چھو بھی سکتے ہو
ستاروں سے قسمت کا حال پوچھ دیکھو
وہ جھونپڑی جس کے لیے
تم خطرناک حد تک
اپنے جسم کو موڑ رہے ہو
دوسری دیوار کے پیچھے ہے
نظر نہیں آئے گی

Scanned with CamScanner

ہمارے سراور دل ان کے نشانے پر

ہم کچھ ایسے کم عقل نہیں ہیں
ہوش مندی سے زندہ رہتے ہیں
کیونکہ ہم زندہ رہنا چاہتے ہیں
اس گونگی، بہری، جنونی دنیا میں
اس آخری لمحے تک
جب تک ہمارا جسم کمزور ہو کر ہمارا ساتھ نہ چھوڑ دے

ہم خطروں کے لیے اپنی قوت شامہ مضبوط رکھتے ہیں
اور لگتا ہے ہماری تعلیم کا مقصد بھی یہی ہے
کہ ہم بقا کے لیے مناسب ترین بن سکیں
اور ہر لحاظ سے مضبوط

اسی لیے ہم نہیں جاتے
ان دور دراز علاقوں میں
جہاں ہماری زبان سے مختلف کوئی زبان بولی جاتی ہے
ان پسماندہ علاقوں میں
جہاں ہماری اصلی خصوصیات کو لعنت تصور کیا جاتا ہے
ان خطرناک علاقوں میں
جہاں تدریس کو ایک خطرناک سازش سمجھا جاتا ہے

Scanned with CamScanner

ہم تلاش کرتے ہیں
اپنی معاشی مجبوریوں کا حل
خطروں سے باہر دنیا میں
اور نہیں بیٹھتے کسی کھلے رکشے میں
جہاں ہمارے قاتل ہمیں پہچان لیں
اور آسانی سے بنا سکیں
ہمارے سر اور دل کو
گولیوں کا نشانہ

مگر جب بنا لیا انھوں نے
تمھارے سر اور دل کو
گولیوں کا نشانہ
ہماری ہوش مندی کو بھی بنا دیا انھوں نے
ہمارے سر اور دل کے لیے
ایک بہت بوجھل درد

دیواریں پیچھے جا سکتی ہیں

لگتا ہے یہ کوئی خواب ہے
ایک گنبد نما بند کمرہ ہے
جس کی دیواریں دھیرے دھیرے سکڑ رہی ہیں

Scanned with CamScanner

میرے قریب آ رہی ہیں
دیواریں بے قرار لگتی ہیں
میرا دم گھونٹنے یا مجھے پیس ڈالنے کے لیے
ایک آواز آتی ہے

یہ دنیا ہے
میری آنکھ کھل جاتی ہے
مگر بند کمرے کی دیواریں ابھی تک سکڑ رہی ہیں
آواز آتی ہے
دیواریں پھیل کر پیچھے جا سکتی ہیں
کچھ دیر کے لیے
اگر اس وحشت کے عالم میں
تم لگا سکو ایک قہقہہ
یا لکھ سکو ایک نظم

میں اپنی نظمیں واپس لینے کو تیار ہوں

میری نظموں نے
کچھ لوگوں سے لاپروائی برتی ہے

میری نظموں نے
کچھ لوگوں کو اذیت پہنچائی ہے

Scanned with CamScanner

میری نظموں نے
کچھ لوگوں کو مار ڈالا ہے

میں اپنی ساری نظمیں واپس لینے کو تیار ہوں
مجھے سب لوگوں سے معافی چاہیے

تا کہ میں برداشت کر سکوں
دنیا کی لاپروائی
اذیت سے تڑپتا ہوا دل
اور اپنی موت

کہاں گیا وہ

جنون سے لبریز
چھلکتا پیمانہ
نشے میں ڈوبی
دوستوں کی محفل
ان دیواروں کے اندر
جن پر تصویریں تھیں
اور تصویروں میں دنیا
اور دنیا میں لوگ
نشے میں کبھی ہنستے، قہقہے لگاتے

Scanned with CamScanner

کبھی آنسو بہتے
صوفے پر نیم دراز
تم تھے
تمہارے گھٹنوں پر سر رکھے
نیم دراز میں
ایک گھونٹ تمہارا تھا
ایک گھونٹ میرا
تیزی سے غائب ہوتی
سنہری شراب کا

کہاں گئیں وہ
اداسی بھری نظمیں
جن میں سرکتی بادلوں سے
برستی بارشیں تھیں
باغوں کے کنارے
گھنے درختوں میں
چہکتے پرندے
پھولوں پر منڈلاتی
رنگین تتلیاں
گہرے نیلے سمندر کی
لہروں میں بل کھاتی
سنہری مچھلیاں
اور بچھڑی محبتوں کے لیے

Scanned with CamScanner

میرا گداز
گیت کا تا دل

کہاں گئی وہ
ایک فرلانگ پری
تین منزلہ
کتابوں کی دنیا
اور اس کے ایک کونے میں
میری خود ساختہ قید
ایک طویل عرصے تک
دنیا سے بے نیاز
روز و شب سے آزاد
خود سے آزاد
جس کے اندر بدلتے
ہزاروں موسم تھے
ہزاروں دوستیاں
میرے دل کو گرماتی
نئی کہانیاں

کہاں گئے وہ
سیلی ہوئی دیواروں کو
نئے رنگوں سے سجاتے
کیاریوں میں پودوں کے

Scanned with CamScanner

جو آئے
چھوٹے، بڑے بچے
لڑکیاں اور لڑکے
میرے ساتھ دیواروں کو
تحریروں سے آراستہ کرتے
ان گنت لوگ
اور ان کے ساتھ
داستانیں دہراتی
میری شکست نا آشنا زبان

کہاں گئے وہ
میری زندگی کے باب
جنھیں پھاڑ دیا گیا
میری زندگی میں آنے سے پہلے

جزیرۂ آہن

اور بھر گیا اجاڑ جہاز
مکمل طور پر
انسانوں سے
اور بسا دیا گیا
ایک ایک کمرے میں

Scanned with CamScanner

ایک ایک بڑے خاندان کو
اور قائم ہو گیا
مکمل نظم و ضبط
محبت اور جرأت کے امکانات سے عاری
اور بن گیا اجاڑ جہاز
مردِ آہن کا جزیرۂ آہن
اور پیدا ہوتے رہے بچے
اور مرتے رہے لوگ

اور ایک دن
اس نے جہاز کے بدلے
زمین کے باسیوں سے زمین کا سودا کیا
اور لے چلا اپنی قوم کو
ویران صحرا میں نئے سرے سے بسانے
اور بھول گیا وہ
ایک نوعمر کو
جس نے بھر لیا ہاتھوں میں پانی کے ساتھ
سمندر سے نکلے ہوئے
ایک چھوٹے سے گڑھے میں پھنسی
ایک مچھلی کو
آزاد کرنے کے لیے
وسیع سمندر میں
جزیرۂ آہن سے باہر

Scanned with CamScanner

وہ میری کٹیا میں

بھیج دیا ہے انھوں نے
پیاری سی چڑیا کو
میرے جنگل میں
پہاڑ کے دامن میں
درختوں کے سایوں تلے
خودرو پھولوں کے درمیان
جھرنوں کے گیتوں سے لبریز
پرندوں کی چہکاروں میں گھری
شہر کے شور سے دور
میری کٹیا میں
جیسے وہ کوئی لاوارث
گندی نالی کا کیڑا ہو

تنہائی کے فن میں کامیاب

اپنی ازلی آرزو کے مطابق
میں بالکل آزاد ہو چکی ہوں
ہر خواہش سے
لالچ سے

Scanned with CamScanner

خوف سے
غم سے
نفرت سے
میں چاہوں تو روکنگ چیئر پر
صبح سے شام کر سکتی ہوں
یا رات بھر سفید کپڑے پر
رنگ برنگے پھول کاڑھ سکتی ہوں
یا جنگل میں اتنی دور جا سکتی ہوں
کہ واپس نہ آ سکوں
یا دائرے میں گھومتے ہوئے
اپنے آپ کو تھکا کر گرا سکتی ہوں
کبھی نہ اٹھنے کے لیے

اور ایسے میں
انھوں نے اسے بھیج دیا ہے
جان بوجھ کر
میری تنہائی میں خلل ڈالنے کے لیے
تاکہ مل جائے مجھے پھر کوئی
نفرت کرنے کے لیے

چھوٹی سی تو ہے وہ
مگر نہیں ڈالنے دیتی مجھے
اپنی تنہائی میں خلل

Scanned with CamScanner

مکمل طور پر آزاد
میری نفرت سے بھی
میری اصلی وارث
مگر مجھ سے کہیں زیادہ کامیاب
تنہائی کے فن میں

یہ میری دوڑ نہیں ہے

وہ بہت سے لوگ تھے
دوڑ رہے تھے
مقابلہ جاری تھا
ہم تماشائیوں میں تھے
شور مچاتے
تالیاں بجاتے
سیٹیاں بجاتے
آوازے کستے

نہ جانے انھیں کیا مغالطہ ہوا
مجھے پکڑ کر تھما دی دوڑ کی وردی
اور دھکیل دیا دوڑنے والوں میں

"نہیں یہ غلط ہے

یہ میری دوڑ نہیں ہے
یہ دوڑ میری نہیں ہے
یہ نہیں ہے میری دوڑ
مجھے جانے دیں
مجھے صرف دیکھنا ہے
دکھانا نہیں ہے"
دوڑتے دوڑتے میں نے کہنے کی کوشش کی

وہ ہنسنے لگے
"کیا خیال ہے آپ کا
یہ سب لوگ جو دوڑ رہے ہیں
کیا اپنی مرضی سے اس دوڑ میں ہیں؟"

انسان اور دوسرے انسان

میں سمجھتی ہوں
وہ سمجھتے ہیں
کہ میں انھیں انسان نہیں سمجھتی

وہ سمجھتے ہیں
میں سمجھتی ہوں
کہ وہ مجھے انسان نہیں سمجھتے

Scanned with CamScanner

لوگ دیکھتے ہیں
کہ ہم دیکھتے ہیں
ایک دوسرے کو
کن انکھیوں سے
بالکل ویسے ہی
جیسے کہ انسان دیکھتے ہیں
دوسرے انسانوں کو

خرید دیتی ہوں میں تمھیں رشتے

نہیں دیکھ سکتی ہوں
تم میں سے کسی کو بھی
محبت کے کسی تجربے، کسی پیارے رشتے سے محروم
تو بس چاہتی ہوں کہ تم سب ہو
بیٹے بھی، بھائی بھی، محبوب بھی، شوہر بھی، باپ بھی
اور اگر تم میں سے کوئی
کسی بھی رشتے کے امکان سے دور ہو
تو میں ڈھونڈ لوں گی
تمھارے لیے وہ امکان
کسی نہ کسی طرح
چاہے اس کے لیے مجھے کسی کو خریدنا ہی پڑے

Scanned with CamScanner

تو اگر تم اپنے رشتوں کے احساس سے محروم ہو
تو میں خرید دیتی ہوں تمھیں
کوئی باپ، یا بھائی، یا محبوب، یا بیوی، یا بیٹا
اپنی تمام جمع پونجی کے عوض
یا رکھ دیتی ہوں
کسی اور کو
اپنی جگہ

میں رکھ دیتی ہوں تمھارا نام فوٹوگرافر

لوگ سمجھتے ہیں
تمھارا ایک ہی نام ہے
مگر میں جانتی ہوں ایسا نہیں ہے
میں تو رکھ لیتی ہوں ہر روز
تمھارا ایک نیا نام

لو آج میں رکھ دیتی ہوں تمھارا نام
فوٹوگرافر

تو اپنے نام کے مطابق
تم اتارو تصویروں میں
اپنی آنکھیں، ناک، رخسار اور ہونٹ

Scanned with CamScanner

اور ای میل کرتے رہو مجھے
تاکہ میں اتارتی رہوں
تم پر سے نظرِ بد

اور دکھاؤ اپنی مسکراہٹ، ہنسی اور قہقہے
تاکہ میں دکھا سکوں سب کو
تمھاری خوشی

اور دکھاؤ اپنے آنسو
تاکہ میں انھیں تصویر ہی سے پونچھ دوں
اور کوئی دوسرا نہ دیکھے

اپنے نام کے مطابق
بناؤ ان سب کی تصویریں
جن سے تمھیں محبت ہے
تاکہ میں گنتی رہوں انھیں
اور رکھوں نظر
ان کی بڑھتی یا گھٹتی ہوئی تعداد پہ
اور غور کرتی رہوں
ان کے خدوخال سے ظاہر
ان کے کردار پہ

اور چونکہ تم نہیں اتار سکتے

Scanned with CamScanner

بہت دور سے
میری تصویر
مانگ لو مجھ سے میری ایک تصویر ای میل سے
اور اپنی مہارت سے
اسے اوپر سے جوڑ دو
کسی ایسی تصویر میں
جو تھوڑی سی خالی ہو

اگر وہ باندھ دے جوتے کا تسمہ

دل دھک سے رہ جاتا ہے
جب کھل جاتا ہے
پارک میں بھاگتے ہوئے
دوسرے بچوں کے ساتھ
میرے ایک چھوٹے بچے کا
جوتے کا تسمہ

میں بھول جاتی ہوں
کچھ دیر کو
سب بڑے خطرات
پھن پھیلائے کھڑے ہوئے
میرے بچوں کے سامنے

Scanned with CamScanner

بھول جاتی ہوں
ٹریفک کے حادثے
اغوا کی وارداتیں
سڑکوں پر چلتی گولیاں
اسکولوں میں دھماکے

بس نظر میں رہ جاتا ہے
میرے بچے کے جوتے کا
کھلا ہوا تسمہ

ایسے میں اگر وہ تھام لے
میرے بھاگتے ہوئے بچے کو
گرنے سے پہلے
اور جھکے
اور باندھ دے کس کے
اس کے جوتے کا تسمہ
تو اس فرشتے کو
میں منہ مانگا انعام دوں
اور عمر بھر کی محبت

Scanned with CamScanner

جب ایک رنگ رہ گیا

کھڑکی کھلی رہ گئی تھی میری
مل گیا موقع
تتلیوں کو
بھیج دیا پیغام دور دور تک
آنکھ لگتے ہی میری
بھر گئیں کمرے میں
رنگین ہو گئی میری دنیا
فرش سے لے کر چھت تک
کوئی رنگ ایسا نہ تھا
جو کمرے میں نہ ہو
پھر چادر کے اندر اور میرے لباس کے اندر تک
پہنچ گئیں تتلیاں
آنکھ کھل گئی میری
اڑ گئے سب رنگ
بس ایک رنگ رہ گیا
وہ سب ٹڈیاں تھیں
بھری ہوئی میرے کمرے میں
چاٹ رہی تھیں میرا سویا ہوا جسم
پہنچ چکی تھیں
میری ہڈیوں تک

Scanned with CamScanner

میرے ایک ہی جیسے لاتعداد پیالے

رکھے ہوئے ہیں لاتعداد
ایک کے اوپر ایک
بے رنگ بے نقش
بالکل شفاف

ہر بار جب گر جاتا ہے
تمھارے ہاتھوں سے
یا پٹخ دیتے ہو تم
میرا شیشے کا پیالہ
پکڑا دیتی ہوں میں تمھیں ایک اور
سوچتی ہوں میں
شاید اچھا لگے اس بار تمھیں
میرا شفاف پیالہ

دکھ بھی ہوتا ہے
کیوں بنائے ہیں
تمھیں دینے کے لیے
بنانے والے نے
میرے نصیب کے

Scanned with CamScanner

ایک ہی جیسے لاتعداد پیالے

شرط

کپکپاتا رہا
شراب سے بھرا
شیشے کا شفاف گلاس
تمھارے ہاتھ میں
کافی دیر تک

رقص میں رہا
میرا بے لباس جسم
کافی دیر تک

تیز رہیں دھڑکنیں
تمھاری اور میری
کافی دیر تک

پھر گر گئی شراب
ٹوٹ گیا گلاس
تمھارے ہاتھ سے گر کر
میرے رقصاں جسم کے گرنے سے پہلے

Scanned with CamScanner

سناؤ مجھے بھی ایک لطیفہ

چپ کیوں ہو جاتے ہو مجھے دیکھ کر
سناؤ مجھے بھی
ایک لطیفہ
میری صنف کے بارے میں

میری صنف کے بارے میں
تمھاری لطیفوں کی زنبیل
عمرو عیار کی زنبیل جیسی ہے
نکالو کوئی نیا یا صدیوں پرانا لطیفہ
محظوظ کرو مجھے
جیسے تم کرتے ہو ایک دوسرے کو
میڈیکل کالج میں مردہ جسموں کی چیر پھاڑ کرتے ہوئے
اسٹاک ایکسچینج میں کاروبار کرتے ہوئے
یا خاتون سیاستدانوں کے بالوں کے انداز کا تجزیہ کرتے ہوئے

چپ کیوں ہو جاتے ہو مجھے دیکھ کر
سناؤ مجھے بھی
ایک لطیفہ
تاکہ میں ہنسوں

Scanned with CamScanner

اور ترقی کر سکوں تمھاری دنیا میں
پھر بتا سکوں
تمھارے بارے میں
لعنتوں کی زنبیل
عمرو عیار کی زنبیل کی طرح
اور سنایا کروں انھیں
صرف اپنی صنف کے گروہوں میں
اور چپ ہو جایا کروں
جب غلطی سے تم داخل ہو جاؤ
میڈیکل کالج میں
اسٹاک ایکسچینج میں
ہماری پارلیمان میں

یہ بھی کچھ

اس بار وہ تمام عورتیں تھیں
ان کی تعداد ہزاروں میں تھی
انھیں بتایا گیا
انھیں لے جایا جا رہا ہے
ایک بہتر مقام کی طرف
ان کے تمام کپڑے اتروا لیے گئے
اور ٹھونس دیا گیا انھیں ریل کے ڈبوں میں

Scanned with CamScanner

ایک کے اوپر ایک
اور بند کر دیے گئے ریل کے دروازے
کچھ اس طرح کہ پانی کا ایک قطرہ بھی باہر نہ نکل سکے
اور کھول دیے گئے ریل کی چھت میں لگے فوارے
اور چیخوں اور سسکیوں کے شور میں
پانی پہنچ گیا ان کی ناکوں تک

اور نکل گئی میری چیخ اور سسکی
یا ایک خواب تھا
نہیں، میرے ہاتھ سے گری تاریخ کی کتاب کا ایک پیراگراف
نہیں، کسی فلم کا منظر
نہیں، میرے تخیل کی ایک پرواز
نہیں، یہ بھی کچھ

بریک بنتا ہے

پانچ گھنٹے تک پتھر توڑتے ہیں
ان محنتی مزدوروں کا بریک بنتا ہے

چھ دنوں تک ٹائپ کرتے ہیں
ان ماہر کلرکوں کا بریک بنتا ہے

Scanned with CamScanner

پورے ایک مہینے سرکس چلتا ہے
ان مشاق بازیگروں کا بریک بنتا ہے

دس مہینے تک علم حاصل کرتے ہیں
ان ذہین طلبا کا بریک بنتا ہے

پورے دس سال ایک بیوی کو دیے ہیں
اس ذمے دار شوہر کا بریک بنتا ہے

ساری زندگی سب کے کام کیے ہیں
اس جاں بلب عورت کا بریک بنتا ہے

Scanned with CamScanner

نیر مسعود کی کتابیں

عطرِ کافور
(کہانیاں)
قیمت:80روپے

ایرانی کہانیاں
(ترجمے)
قیمت:90روپے

انیس
(سوانح)
قیمت 375روپے

مرثیہ خوانی کا فن
(تنقید و تحقیق)
قیمت:150روپے

منتخب مضامین
(تنقید و تحقیق)
قیمت:280روپے

کافکا کے افسانے
(افسانے)
قیمت:70روپے

معرکۂ انیس و دبیر
(تنقید و تحقیق)
زیرِ طبع

گنجفہ
(کہانیاں)
قیمت:200روپے

Scanned with CamScanner

جاوید صدیقی

کیا آدمی تھا رے

اکتوبر 1976 تک ستیہ جیت رے سے میرا تعلق بس اتنا تھا کہ میں نے ان کے بارے میں دو چار مضامین پڑھے تھے اور آٹھ دس فلمیں دیکھی تھیں۔ فلمیں جتنی بھی دیکھیں، بہت اچھی لگیں کیونکہ ایسی فلمیں پہلے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ مجھے ان کی جلسہ گھر بہت پسند آئی تھی، کچھ تو بیگم اختر کی وجہ سے اور کچھ اس لیے کہ میں بھی انھی حویلیوں کا پروردہ تھا جہاں کسی زمانے میں وقت تھم کر بیٹھ گیا تھا اور پھر اینٹ اینٹ بکھیر کے باہر نکل گیا تھا۔

ان کی فلموں کے مکالموں کی زبان سمجھ میں نہیں آتی تھی مگر تصویروں کی بولی اچھی طرح سمجھ لیتا تھا۔ مجھے ان کی فلموں کا ہر فریم زندگی سے اتنا قریب لگتا تھا کہ سانس لیتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔

اس زمانے میں جب ایمرجنسی لگ چکی تھی اور بہت سے جرنلسٹ عزت بچانے کے لیے گھروں میں بیٹھ گئے تھے، میں بھی اخبار چھوڑ چکا تھا اور وقت کاٹنے کے لیے ابرار علوی کے پاس چلا جاتا تھا۔

اسی زمانے کی بات ہے، یعنی اکتوبر 1976 کی، جب شمع زیدی کا فون آیا اور انھوں نے کہا:

''اے جاوید، وہ ستیہ جیت رے تم سے ملنا چاہتے ہیں...''

میں حیران ہو گیا۔ ''مجھ سے؟ وہ مجھے کیا جانیں...''

''مجھے یہ سب نہیں معلوم، پریزیڈنٹ میں ٹھہریں گے۔ پرسوں شام کو چار بجے مل لینا!''

انھوں نے سوکھا سا جواب دیا اور فون بند کر دیا۔

Scanned with CamScanner

بات سوچنے جیسی تھی راج بھوج گنگو تیلی سے کیوں ملنا چاہے گا۔ شمع بی بی ضرور کوئی شرارت کر رہی ہیں۔

میری عزیز ترین دوست شمع زیدی بڑی باکمال خاتون ہیں۔ وہ بے حد سنجیدگی سے جھوٹ بولنے اور نہایت غیر سنجیدگی سے سچ بولنے کی انوکھی صلاحیت رکھتی ہیں۔ ان کے چہرے، آواز یا الفاظ سے یہ پتا لگالینا کہ ان کے ارادے کیا ہیں، نہایت مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ اس لیے جب فون آیا تو یقین کرنے سے پہلے دیر تک سر کھجانا پڑا۔

فون کیا تھا شمع نے ٹھہرے ہوئے پانی میں پتھر پھینک دیا تھا اور میں لہر لہر پریشان ہو رہا تھا۔

فریدہ نے پریشانی کی وجہ سنی تو ہنس پڑیں۔ ''ارے تو اس میں حیران ہونے کی کیا بات ہے! تم اتنے اچھے مزاحیہ کالم لکھتے ہو۔ کوئی پسند آ گیا ہوگا۔ فلم بنانا چاہتے ہوں گے!''

شوہروں کو بیویوں کی خوش گمانی عام طور پر اچھی لگتی ہے، مگر مسئلہ ایسا تھا کہ میں جھنجھلا گیا، تو انھوں نے کہا:

''اُفوہ، اس میں اتنا پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔ ہوٹل میں فون کر کے دیکھ لو۔ اگر رے صاحب ہیں تو شمع سچ بول رہی ہیں اور اگر نہیں ہیں تو ان کا جوک سمجھ کے بھول جاؤ۔''

مشورہ کچھ اس قدر صحیح تھا کہ میں نے چپ چاپ مان لیا اور فون کیا تو معلوم ہوا کہ رے صاحب تشریف لا چکے ہیں فی الحال روم میں نہیں ہیں۔

میں اور زیادہ نروس ہو گیا۔ دل کے دھڑکنے کی آواز چاروں طرف سے آنے لگی۔

''یار، یہ چکر کیا ہے؟'' میں شمع سے پوچھنا چاہتا تھا مگر ان کا کیا بھروسا... ڈانٹ دیں تو؟

لیکن ایک بات ثابت ہو چکی تھی، وہ شرارت نہیں کر رہی تھیں۔ ستیہ جیت رے بمبئی میں تھے، ہوٹل پریزیڈنٹ میں تھے، کمرے میں نہیں تھے تو کیا ہوا۔

شمع نے چار بجے کا ٹائم دیا تھا۔ میں تین ہی بجے کولابا پہنچ گیا جہاں پریزیڈنٹ ہے۔ دیر تک لابی میں گھومتا رہا جہاں چار پانچ دکانیں تھیں۔ جب ٹورسٹ کے ہر پھول کو دیکھ چکا اور کشمیری قالینوں کے سارے ڈیزائن یاد ہو گئے تو لابی فون سے نمبر ڈائل کیا۔

دوسری طرف سے ایک کھرج دار مگر خوشگوار آواز سنائی دی، "Yes?"

میں نے اپنا نام ہی بتایا تھا کہ آواز آئی: "!Come up" اور فون بند ہو گیا۔

ستیہ جیت رے عالمی سنیما میں بہت اونچا مقام رکھتے تھے مگر وہ خود بھی اتنے اونچے ہوں گے، میں نے کبھی سوچا نہیں تھا۔ جب چھ فٹ چار انچ کے رے صاحب نے دروازہ کھولا تو میرا منہ بھی کھل گیا اور دیر تک کھلا رہا۔

وہ ایک شاندار شخصیت کے مالک تھے۔ لمبے تھے مگر دبلے نہیں تھے۔ سانولا رنگ، کشادہ پیشانی، سلیقے سے جمے ہوئے بال، بڑی بڑی روشن آنکھیں، اونچی ستواں ناک، مسکراتے ہوئے ہونٹ، ٹھوڑی ذرا چوڑی تھی۔ کہا جاتا ہے ایسی ٹھوڑی والے بہت محنتی اور مستقل مزاج ہوتے ہیں۔

میں نے آداب کیا۔ انھوں نے سر ہلا کر جواب دیا اور کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ میں کرسی کے کونے پر ٹک گیا۔ وہ بیڈ پر دیوار سے پیٹھ لگا کے بیٹھے اور اپنی چمکتی آنکھوں سے، جن میں ہلکی سی مسکراہٹ بھی تھی، مجھے دیکھنے لگے۔ چشمے کی ڈنڈی ان کے منہ میں تھی جسے وہ دھیرے دھیرے چبا رہے تھے۔ وہ تقریباً ایک منٹ تک بنا کچھ بولے میرا جائزہ لیتے رہے۔ پھر انگلش میں پوچھا:

''میں نے سنا ہے تم بہت اچھی کہانیاں لکھتے ہو....''

میں نے عرض کیا، ''کہانیاں کم، کالم زیادہ لکھے ہیں۔ پتا نہیں کیسا لکھتا ہوں۔ آپ کہیں تو اپنی کوئی تحریر ترجمہ کرا لوں، آپ دیکھ لیں۔''

ان کی مسکراہٹ کچھ زیادہ پھیل گئی۔ بولے، ''کوئی ضرورت نہیں۔ میں تمھیں دیکھ سکتا ہوں اور اتنا کافی ہے۔''

یہ کہہ کر اٹھے، تکیے پر رکھا ایک پلاسٹک کا فائل اٹھایا اور میری طرف بڑھاتے ہوئے کہنے لگے، ''یہ میری فلم کا اسکرپٹ ہے اور تم اس کے ڈائیلاگ لکھ رہے ہو!''

پتا نہیں مجھے کیا ہوا۔ دماغ کئی ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گھوم گیا۔ کچھ بولا ہی نہیں گیا۔ بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا اور ہاتھ میں پکڑی فائل پر نظر ڈالی تو سفید پلاسٹک میں سے موٹے موٹے سیاہ حروف دکھائی دیے:

For your eyes only.

مگر آنکھیں تھیں کہ بند ہوئی جا رہی تھیں۔ بڑی مشکل سے کہا:

Scanned with CamScanner

"Thank you sir, I am honored sir!"

وہ اٹھے اور دروازہ کھول دیا۔

''میں تہران فلم فیسٹول میں جا رہا ہوں۔ واپسی پر تمھیں فون کروں گا۔''

''جی۔'' میں نے کہا اور اسکرپٹ چھاتی سے لگا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ جب ہوٹل کی لابی میں پہنچا تو ہوش ذرا ٹھکانے آئے۔

''یہ ہوا کیا؟ میں اور ڈائیلاگ، اور وہ بھی ستیہ جیت رے کی فلم کے!... ارے باپ رے!''

جیب میں ہاتھ ڈال کر پیسے گنے تو ہمیشہ کی طرح کم ہی تھے۔ مگر میں نے کل کی نہیں سوچی اور کولابہ سے ٹیکسی پکڑی اور سیدھا جوہو تارا پہنچا جہاں شمع رہتی تھیں۔ پچیس میل لمبا راستہ کب کٹ گیا معلوم ہی نہیں ہوا، کیونکہ دماغ کہیں اور تھا۔ ذہن میں سوالوں کی آندھی چل رہی تھی جس میں جوابوں کے پیر اکھڑے جا رہے تھے۔

محمود کے کہنے پر ابرار علوی کے لکھے سین میں کانٹ چھانٹ کر دینا اور ضرورت پڑنے پر ایک آدھ سطر کا پیوند لگا دینا ایک الگ بات ہے اور باقاعدہ مکالمہ نگاری کرنا الگ۔ اچھا بھی لگ رہا تھا اور ڈر بھی جا تا تھا کہ پتا نہیں شمع نے کہاں پھنسا دیا ہے۔

میں پہنچا تو وہ مسکرا رہی تھیں۔ انھوں نے اپنی مخصوص ادا سے پلکیں جھپکا کے پوچھا:

''ہو گئی ملاقات؟''

میں نے اسکرپٹ ان کے ہاتھ میں تھما دیا۔

''ہو گئی... یہ دیکھو... اور اب بتاؤ کہ ڈائیلاگ کیسے لکھتے ہیں؟''

شمع نے بڑے ادب سے فائل کو دیکھا۔ پیار سے اس کے اوپر ہاتھ پھیرا اور بولیں:

"Don't be silly... ڈائیلاگ لکھنا کون سا مشکل کام ہے۔''

میں بھڑک گیا۔

''ارے یار، تم بھی کمال کرتی ہو! پریم چند کی کہانی، ستیہ جیت رے کا اسکرین پلے... اگر ذرا سی بھول چوک ہو گئی تو لوگ پکڑ پکڑ کے ماریں گے۔''

''کوئی نہیں مارے گا۔ کچھ نہیں ہوگا۔''

قصہ مختصر، طے یہ پایا کہ ہم دونوں مل کر لکھیں گے۔ زبان میری، تجربہ ان کا۔

شمع کو تجربے کے ساتھ سلیقہ بھی تھا۔ وہ کچھ چھوٹی موٹی فلموں اور گرم ہوا میں اپنا ہاتھ صاف کر چکی تھیں۔ مگر یہاں خالص اردو لکھنی تھی۔

سب سے پہلے ہم نے اسکرپٹ پڑھا۔

مانک دا نے (وہ لوگ جو ستیہ جیت رے کے قریبی تھے، انھیں 'مانک دا' کہا کرتے تھے: مانک ان کا گھریلو نام تھا) ہاں تو مانک دا نے ایک چھوٹی سی کہانی کو کافی پھیلا دیا تھا اور اس وقت کی سیاست کو بڑی خوبصورتی سے کہانی کے اندر لے آئے تھے۔ سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ انھوں نے اودھ کے آخری تاجدار واجد علی شاہ کا مذاق اڑانے کے بجائے اس کی کمزوریوں کا ذکر کیا تھا مگر اسے ایک ایسا بادشاہ دکھایا تھا جو اپنی کمزوری کی وجہ سے نہیں بلکہ انگریزوں کی مکاری کی وجہ سے سلطنت کھو بیٹھتا ہے۔

ہمارے سامنے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ اگر ہم وہی زبان لکھتے ہیں جو اس وقت رائج تھی تو آج کے فلم بین سمجھ ہی نہیں پائیں گے کیونکہ محاورہ بدل چکا ہے، الفاظ اور ان کا استعمال بھی وہ نہیں ہے جو تھا۔ چنانچہ ہم نے طے کیا کہ ہم ایک ایسی زبان لکھیں گے جو آسان اور عام فہم ہوگی مگر سنتے ہوئے ایسا لگے گا جیسے وہ ڈیڑھ سو سال پہلے کی اردو ہے۔ ہم نے یہ بھی طے کیا کہ کرداروں کی زبان مختلف ہوگی اور اس میں ان کی سماجی، ثقافتی اور معاشی جھلک دکھائی دے گی۔

اگر آپ شطرنج کے کھلاڑی کے مکالموں کی زبان پر غور کریں تو آپ کو احساس ہوگا کہ میر اور مرزا کی زبان الگ ہے، واجد علی شاہ کی لفظیات دوسری ہے: اس میں ایسی نغمگی ہے جو بندش میں آجائے تو ٹھمری معلوم ہونے لگے۔ درباریوں کی زبان پر فارسی کا غلبہ ہے، عوام اودھی بولتے ہیں اور خواتین کہاوتوں اور محاوروں سے سجی ہوئی رواں دواں بولی بولتی ہیں۔ ہم نے کوشش کر کے پوری فلم میں ایسا کوئی لفظ استعمال نہیں کیا جو کانوں کو بارِ گراں معلوم ہو۔

اردو کا کمال یہ ہے کہ اس میں ایک ماحسوس موسیقی ہے۔ اگر قلم کسی جانکار کے ہاتھ میں ہے تو لفظ لفظ نہیں رہتے سُر بن جاتے ہیں۔

میرے اور شمع کے جوش کا عالم یہ تھا کہ اپنا ہوش نہیں تھا۔ روزانہ بارہ چودہ گھنٹے کام کرتے مگر ذرا سی بھی تھکان کا احساس نہیں ہوتا۔

طرح بات دھیرے دھیرے آگے بڑھتا گیا اور بہت سے رازوں سے پردہ بھی اٹھتا گیا۔ معلوم ہوا کہ حقیقت تک رسائی تک میرے انجام تک پہنچانے والی شمع ہی تھیں، اور اس سفارش کے پیچھے ایک کہانی تھی۔

جب پروڈیوسر سریش جندل نے مانک دا کو راضی کر لیا کہ وہ ہندی یا اردو میں فلم بنائیں گے اور انھوں نے پریم چند کی کہانی ''شطرنج کی بازی'' کا انتخاب کیا تو سوال پیدا ہوا کہ اس کے مکالمے کون لکھے گا۔ ہر اچھے اسکرین پلے کی طرح شطرنج کے کھلاڑی میں بھی مفہوم اور ضرورت کو سمجھانے کے لیے انگریزی میں ڈائیلاگ لکھ لیے گئے تھے مگر وہ مکالمے نہیں تھے، وہ اشارے تھے جن کی مدد سے اس تاریخی فلم کے مکالمے لکھے جانے تھے۔ سریش جندل کا خیال تھا کہ شطرنج کے ڈائیلاگ راجندر سنگھ بیدی سے بہتر کوئی لکھ ہی نہیں سکتا۔ فلم کے ایک ہیرو تھے سنجیو کمار۔ وہ چاہتے تھے کہ گلزار سے مکالمے لکھوائے جائیں جو اپنی زبان کی سادگی اور مضامین کے لیے مشہور ہیں۔ مگر مانک دا کے پرانے ساتھی اور دوست آرٹ ڈائریکٹر بنسی چندر گپت اور شبانہ کی نظر میں کیفی اعظمی کے علاوہ کوئی دوسرا اس فلم کے ساتھ انصاف نہیں کرسکتا تھا۔

امیدواروں میں ایک نام اور بھی تھا، اختر الایمان کا۔ ان کا نام شاید امجد خان نے تجویز کیا تھا جو واجد علی شاہ کا کردار ادا کر رہے تھے اور اختر صاحب کے داماد تھے۔

مانک دا کے سامنے سارے نام رکھے گئے، کافی سوچ بچار ہوئے، مگر ان کی رائے سب سے الگ تھی۔ انھوں نے کہا بیدی صاحب اور گلزار صاحب بہت اچھا لکھتے ہیں مگر پنجابی ہیں اور فلم کا پس منظر لکھنؤ ہے جو ان سے چھوٹ جائے گا۔ اختر الایمان اس لیے قابل قبول نہیں تھے کہ مانک دا کو بی آر چوپڑہ کی فلموں جیسے مکالمے نہیں چاہیے تھے۔ لے دے کر رہ جاتے تھے کیفی صاحب۔ اردو دنیا کا بڑا نام، شمالی ہند کے رہنے والے، اور ہیر رانجھا اور گرم ہوا جیسی فلموں کی مکالمہ نگاری کا تجربہ بھی رکھتے تھے۔

فیصلہ ہوا کہ شطرنج کے کھلاڑی کے ڈائیلاگ کیفی صاحب لکھیں گے۔ چنانچہ ایک ملاقات کا بندوبست کیا گیا۔ مگر وہ ملاقات جسے فلم اور ادب کا سنگ میل بننا تھا بری طرح فلاپ ہوگئی کیونکہ اس میں زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم والی صورت حال پیدا ہوگئی۔ کیفی صاحب نے ساری زندگی اردو کے علاوہ کسی اور زبان کو منہ نہیں لگایا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ مانک دا بنگالی اور انگریزی کے علاوہ کوئی اور زبان نہ بول سکتے تھے نہ سمجھ سکتے تھے۔

اس ٹیڑھے مسئلے کے بہت سے حل سوچے گئے جن میں سے ایک یہ بھی تھا کہ شبانہ ترجمان کا کام کریں۔ وہ اپنے ابا کے لیے یہ تکلیف سہنے کو تیار بھی تھیں، مگر رے صاحب کا کہنا تھا کہ رائٹر اور ڈائرکٹر کا رشتہ میاں بیوی کے رشتے جیسا ہوتا ہے اور یہ بلا شرکت غیرے ہونا چاہیے۔

انھوں نے کہا، ''مجھے کوئی نام والا ادبی یا فلمی رائٹر نہیں چاہیے۔ نیا آدمی بھی چلے گا۔ بس اسے زبان آنی چاہیے۔''

اور یہی وہ موقع تھا جب شمع نے میرا نام لیا اور بہت سے لوگوں کے ناک سکوڑنے اور شمع کی ناسمجھی پر اعتراض کرنے کے باوجود ستیہ جیت رے نے مجھ سے ملنے کا ارادہ ظاہر کیا۔

یہ تو پس منظر تھا۔ پیش منظر یہ تھا کہ ہم دونوں نے آٹھ ہی دن میں سارے ڈائیلاگ لکھ ڈالے اور ایک دوسرے کی خوب کمر ٹھونکی، مگر دل ڈر رہا تھا کیونکہ اصلی امتحان تو باقی تھا: مانک دا کے سامنے پیشی...

کوئی نو دن بعد وہ تہران سے لوٹے تو فون کیا:

''تم نے اسکرپٹ پڑھ لیا؟''

''پڑھ لیا؟... سر، ہم نے تو لکھ لیا!'' میں نے خوش ہو کر کہا۔

فون پر ان کی ہنسی سنائی دی:

"Really? That's my speed, young man!"

طے پایا کہ دو دن بعد ہم ملیں گے اور اسکرپٹ سنایا جائے گا۔

دو دن بعد میں اور شمع ہوٹل پریزیڈنٹ پہنچے تو حیران رہ گئے۔

کمرے میں جلسہ جما ہوا تھا۔ فرش کے اوپر دیوار سے کمر لگائے کوئی آدھے درجن بزرگ تشریف فرما تھے۔ ان میں سے کچھ لوگوں کو میں جانتا تھا، کچھ صورت آشنا تھے۔ پروفیسر نظام الدین گوریکر سینٹ زیویئر کے اردو فارسی ڈپارٹمنٹ کے ہیڈ تھے۔ ایک صاحب انجمن اسلام ریسرچ انسٹیٹیوٹ کے نگراں تھے۔ ایک اور بزرگ ایک ادبی رسالے کے ایڈیٹر تھے۔ باقی حضرات بھی کچھ اسی قبیل کے تھے۔ اردو کے ان ماہرین کی صورت دیکھتے ہی سمجھ میں آ گیا کہ ان لوگوں کو میری اور شمع کی قابلیت جانچنے کے لیے بلایا گیا ہے۔ مانک دا بیڈ پر بیٹھے تھے اور ان کے پاس ہی سریش جندل اور جسی چندر گپت براجمان تھے۔

Scanned with CamScanner

مجھے بزرگوں سے جھوٹ پتا تھا مگر اس کی عادتیں نہیں چھوٹی تھیں۔ یہ بری عادت اب تک ہے کہ کسی سے ڈرتا نہیں ہوں۔ اچھا سپاہی وہی ہوتا ہے جو میدان اور دیروں کو خاطر میں نہیں لاتا اور خطروں میں بے خطر کود پڑتا ہے۔

میں نے بھی ہمت کو تا پکڑا۔ فائل کھول کر اس طرح سامنے رکھی جیسے میرا پڑھنے کا ارادہ ہو۔ شمع میرے برابر بیٹھی تھیں۔ میں نے ایک بار مائک وال کی طرف دیکھا۔ جن کی آنکھوں میں ایسی چمک تھی جیسے بچے کو نیا کھلونا ملنے والا ہو اور چشمے کی ٹانگ منھ میں تھی۔

میں نے پہلے سین سے لے کر آخری ڈائیلاگ تک پورا اسکرپٹ اس طرح سنایا کہ گلا گیلا کرنے کے لیے بھی نہیں رکا۔

کوئی ڈیڑھ گھنٹے بعد جب فائل بند ہوئی تو کمرے میں عجب طرح کا سناٹا تھا۔ حاضرین کی سوچتی تولتی آنکھیں میرے اور شمع کے اوپر جمی ہوئی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد سب سے پہلی آواز مائک وال کی سنائی دی۔ ایک ہلکی سی ہنسی کے ساتھ انھوں نے کہا:

"I don't know what he has written, but it sounds good..."

(معلوم نہیں اس نے کیا لکھا ہے، مگر سننے میں اچھا لگ رہا ہے۔)

کچھ بزرگوں نے تبصرہ اور چھوٹے سوال کیے۔ مسٹر چندر گپت نے جو بہت اچھی اردو جانتے اور بولتے تھے، پوچھا: ''آپ نے ایک جگہ لکھا ہے 'تڑکے چلیں گے، جھٹ پٹے میں لوٹ آئیں گے۔' کیا لوگ اسے سمجھ پائیں گے؟''

میں نے عرض کیا: ''مطلب یہ ہے کہ صبح کو چلیں گے، شام کو لوٹ آئیں گے۔ اس ڈائیلاگ میں صبح شام بھی استعمال ہو سکتے تھے۔ یہ بھی کہا جا سکتا تھا کہ سویرے چلیں گے، رات کو لوٹ آئیں گے۔ لیکن تڑکے اور جھٹ پٹے اس لیے استعمال کیا ہے کہ اس زمانے کی زبان کا محاورہ سنائی دے سکے۔ کان کو ذرا سا اجنبی لگتا ہے مگر اچھا لگتا ہے اور مطلب تو سمجھ میں آ ہی جاتا ہے۔''

مختصر یہ کہ میں اور شمع بہت اچھے نمبروں سے پاس ہو گئے۔ رمیش جندل نے بھی طرح طرح سے اطمینان کرنے کے بعد صبر و تحمل سے کام لیا اور دو تازہ واردانِ بساطِ ہوا کے قلم کو قبول کر لیا۔ اور مجھے یہ خوش

خبری سنائی کہ میں نے جو کارنامہ انجام دیا ہے اس کے لیے عزت وشہرت کے علاوہ مبلغ پندرہ ہزار روپے بھی ملیں گے۔ شمع چونکہ فلم کے کاسٹیومز (Costumes) بھی کر رہی تھیں اس لیے ان کا معاوضہ کیا تھا مجھے معلوم نہیں۔

اسکرپٹ ملنے کے بعد مانک دا کی پہلی فرمائش یہ تھی کہ مکالموں کا حرف بہ حرف ترجمہ انگلش میں کیا جائے اور ان کو بھیجا جائے تاکہ انھیں اندازہ ہو سکے کہ ہم لوگ ان کے سکرین پلے سے کتنے دور یا قریب ہیں۔ یہ کام شمع نے فوراً کر دیا۔ ان کی انگلش ماشاءاللہ میری اردو سے بھی اچھی ہے۔

اس کے بعد میری باری آئی۔ مانک دا اردو مکالموں کا ایک ایک لفظ بنگلہ رسم الخط میں لکھتے اور پھر بول کر دیکھتے۔ میں نے وجہ پوچھی تو فرمایا، ''زبان کوئی بھی ہو، لفظوں کی اپنی موسیقی ہوتی ہے۔ یہ موسیقی صحیح ہونی چاہیے۔ اگر ایک سُر غلط لگ جائے تو پورا سین بے معنی ہو جاتا ہے۔'' (اے سبحان اللہ!)

یہاں تک سب خیریت تھی کہ اچانک مانک دا نے کلکتے سے فون کیا اور بولے، ''تمھارے ڈائیلاگ میری سمجھ میں تو آ گئے مگر ایکٹروں کو کون سمجھائے گا کہ انھیں بولنا کیسے ہے؟''

مسئلہ ٹیڑھا تھا۔ میں پریشان ہونے لگا تو انھوں نے حل بھی نکال دیا۔ ''تم کوئی دوسرا کام نہیں کر رہے ہو تو ڈائیلاگ ڈائریکشن بھی سنبھال لو۔''

میں نے سوچنے کی مہلت مانگی مگر دوسرے دن پروڈیوسر نے بتایا کہ ڈائیلاگ ڈائریکشن کے مزید پندرہ ہزار روپے ملیں گے تو نہ کہنے کی کوئی گنجائش ہی نہیں بچی اور میں کلکتہ پہنچ گیا اور مانک دا کے سلام کو حاضر ہوا۔

مانک دا بشپ لفرائے روڈ پر ایک فلیٹ میں رہتے تھے۔ لکڑی کے اونچے دروازے سے گھر کے اندر آؤ تو ایک ہال جیسا تھا، جس میں کچھ صوفے، کچھ کرسیاں، کتابوں کی الماری، شیلف پر کچھ ٹرافیاں اور ایک پیانو آنکھوں کا استقبال کرتا تھا۔ کمرے کے آخری سرے پر بڑی بڑی کھڑکیوں کے پاس، جو سڑک کی طرف کھلتی تھیں، مانک دا ایک آرام کرسی پر نیم دراز ہوتے تھے۔ عام طور پر گھٹنا ٹیڑھا کر کے اس پر رائٹنگ پیڈ رکھ لیا کرتے تھے اور قلم فراٹے بھرتا ہوتا تھا۔

گھر کی ہر چیز میں سلیقہ اور نفاست دکھائی دیتی تھی۔ میرا خیال ہے اس خوش مذاقی کی ذمہ دار مانک دا سے کہیں زیادہ ''بودی'' (بیجویدی) یعنی مسز بجویا رے تھیں۔ بڑی ہی پیاری اور محبت کرنے

والی خاتون تھیں۔ جب بھی ملتی تھیں، ایک بے حد معصوم مسکراہٹ چہرے پر پھیل جاتی اور ہاتھ تو اتنے پیار سے پھیلاتے تھے کہ بے ساختہ گلے لگ جانے کو جی چاہتا تھا۔

ستیہ جیت رے کو ستیہ جیت رے بنانے میں بیوی کی بے لوث محبت اور اپنے فن کی صلاحیت پر یقین نے بے مثال کردار ادا کیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پاتھیر پنچالی آدھے میں ہی بند ہوگئی تھی کیونکہ پیسے ختم ہوگئے تھے۔ اس وقت بیوی نے اپنے زیور گروی رکھ کر کہا تھا: ''زیور تو جب چاہو بن سکتے ہیں، پاتھیر پنچالی بار بار نہیں بن سکتی۔''

کلکتہ میرے لیے نیا نہیں تھا، پہلے بھی کئی بار آچکا تھا، مگر وہ شہر مجھے کبھی پسند نہیں آیا۔ جدھر دیکھو ایک بے ترتیب ہجوم دکھائی دیتا تھا۔ بالکل ایسا لگتا تھا جیسے کسی نے کوئی پرانا پتھر ہٹایا ہو اور نیچے سے لاکھوں چیونٹیاں بلبلا کے باہر نکل آئی ہوں۔ اب اسے وقت کی ستم ظریفی ہی کہیے کہ کچھ دن بعد چیونٹیوں کے اس بے ترتیب ہجوم میں میں اور شمع بھی شامل ہو گئے۔

ہوا یوں کہ کلکتہ پہنچ کر اسٹوڈیو میں قدم رکھا تو ایک عجیب منظر نظر آیا۔ آرٹ ڈپارٹمنٹ کے لوگ اور مانک دا کے کچھ اسسٹنٹ میر اور مرزا کے گھروں کے لیے پراپرٹی جمع کر رہے تھے، اور سخت پریشان تھے کیونکہ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ جو سامان اکٹھا کیا گیا ہے وہ غلط ہے یا صحیح۔ ان لوگوں کے لیے جنھوں نے کبھی لکھنؤ دیکھا بھی نہ ہو، ہزار میل دور بیٹھ کر ڈیڑھ سو برس پرانی تہذیب کو زندہ کرنا چراغ میں سے جن نکالنے کے برابر تھا۔ سامان سب تھا مگر زیادہ تر غلط تھا، مثال کے طور پر پانی کے لیے مٹی کے برتن منگا لیے تھے مگر وہ گھڑے نہیں تھے، بڑے منھ والے مٹکے تھے۔ یوپی کے گھڑے اتنے چھوٹے منھ کے ہوتے ہیں کہ ہاتھ پھنس جاتا ہے۔ میں نے سوچا، ڈائیلاگ ڈائریکشن تو تب ہوگی جب شوٹنگ شروع ہوگی، ابھی تو اندر پوری اسٹوڈیوز میں لکھنؤ بنانے کا کام شروع کر دینا چاہیے۔ چنانچہ میں نے آستین چڑھائی اور حملہ بول دیا۔ گھڑے تول گئے۔ ان کو رکھنے کے لیے لکڑی کی گھڑونچی بنوائی۔ منھ پر باندھنے کے لیے لال کپڑا منگوایا مگر تانبے یا چاندی کے منقش کٹورے کہیں نہیں ملے۔

مانک دا اسٹوڈیو آئے اور مجھے مٹی کے تیل اور کوئلے کی راکھ سے برتنوں کو چمکاتے دیکھا تو ہنس پڑے۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' انھوں نے پوچھا۔

Scanned with CamScanner

"میں بیکار نہیں بیٹھ سکتا سر!" میں نے جواب دیا۔

انھوں نے میرا کندھا تھپتھپایا اور بولے، "ایشل پر اپرٹی کی سٹ شمع کے پاس ہے۔ تم چاہو تو شمع کی مدد کر سکتے ہو۔"

چنانچہ ہم دونوں نے کلکتے کے گلی کوچوں کی خاک چھاننا شروع کر دی۔

جس زمانے میں شمع اور میں فلم کے لیے سامان جمع کرتے گھوم رہے تھے، مانک دا کے نام کا وہی اثر ہوتا تھا جو کسی منتر کا ہوتا ہے۔ ہر دروازہ کھل جاتا تھا اور دیدہ و دل فرشِ راہ ہو جاتے تھے۔ بنگال کے پرانے رئیس اپنی عالیشان حویلیوں میں گزری ہوئی عظمت کی ایسی ایسی نایاب نشانیاں چھپائے بیٹھے تھے کہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ میں سمجھتا تھا کہ اپنی تہذیب کو بچانے اور بچائے رکھنے کا کام جیسا شمالی ہند والوں نے کیا ویسا کہیں نہیں ہوا، مگر کلکتے پہنچ کر اندازہ ہوا کہ بنگال کسی طور سے پیچھے نہیں، بلکہ کچھ آگے ہی ہے۔ وہاں کیسے کیسے شوقین رئیس تھے اس کا اندازہ صرف ایک مثال سے لگایا جا سکتا ہے۔

ہمیں ایک قلمدان کی ضرورت تھی۔ پتا چلا کہ ایک بنگالی رئیس ہیں جو بند وقیں بیچتے ہیں مگر نایاب چیزیں جمع کرنے کے شوقین بھی ہیں۔ ستیہ جیت رے کا نام سنا تو خود اپنی 'باڑی' (حویلی) پر لے کر گئے اور اپنے خزانے کا دروازہ کھول دیا۔ دیگر نوادرات کا ذکر تو جانے دیجیے، قلمدانوں، قلموں اور دواتوں کا ذخیرہ دیکھ کر آنکھیں اس طرح کھلیں کہ جھپکنا بھول گئیں۔ چاندی سے لے کر ہاتھی دانت اور صندل کے قلمدان تھے، پر کے قلم سے لے کر تیز سے اور نب والے ہولڈر بھی تھے، اور دواتیں تو اللہ کی پناہ، اتنی تھیں کہ حساب کرنے میں سیاہی کم پڑ جائے۔ سونے چاندی اور کانچ سے لے کر لکڑی اور مٹی کی دواتیں ہر سائز اور ہر ڈیزائن میں موجود تھیں۔

مجھے ایک دوات آج تک یاد ہے۔ شیشے کو تراش کے کرکہ کی شکل دی گئی تھی۔ خالی دیکھو تو آر پار بالکل شفاف دکھائی دیتی تھی مگر روشنائی ڈالو تو پنجتن پاک کے نام نظر آنے لگتے تھے۔ ان کی مقبولیت کا عالم یہ تھا کہ ہر آدمی دیدہ و دل فرشِ راہ کر دیا کرتا تھا۔ فلم کے آخری سین میں جب مرزا میر پر گولی چلاتا ہے اور گولی شال کو چھوتی ہوئی نکل جاتی ہے اس میں جو شال استعمال کی گئی ہے وہ ایک بے حد قیمتی کشمیری شال ہے جس کی قیمت اس زمانے میں تیس چالیس ہزار روپے تھے۔ مگر مانک دا کی محبت میں اس شال کے مالک سیٹھ کیجری وال گولی کا نشان دکھانے کے لیے اس شال میں سوراخ کیے جانے پر بھی آمادہ

Scanned with CamScanner

ہو گئے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ بعد میں اس سوراخ کو رفو کر دیا گیا اور شال پر کوئی نشان بھی نہ رہا۔لیکن کیجری وال کی عقیدت کا نشان آج بھی باقی ہے۔

میں اور یونٹ کے دوسرے لوگ ساڑھے نو بجے تک اندر پوری اسٹوڈیو پہنچ جاتے۔ ساڑھے نو بجے مانک دا آتے اور آتے ہی پہلا کام یہ ہوتا کہ اس دن جو سین شوٹ ہونے والا ہوتا اس کے نوک پلک سنوارے جاتے۔

اسٹوڈیو کے آخری کونے میں پیپل کا ایک گھنا، سایہ دار پیڑ تھا جس سے اس طرف دھوپ نہیں آتی تھی اور وہ کونا ٹھنڈا رہتا تھا۔ پیپل کی چھاؤں میں نازک شاخوں والے انار کی جھاڑیاں سی بن گئی تھیں اور اس کے نیچے سفید پتھر کی ایک بنچ تھی۔

یہ جگہ مانک دا کو بہت پسند تھی۔ ان کا روز کا معمول تھا کہ وہ پتھر پر اپنا اسکرپٹ لے کر بیٹھ جاتے اور میں اپنی فائل کھول لیتا۔ پہلے وہ اپنا اسکرین پلے پڑھتے، پھر مجھ سے ڈائیلاگ سنتے۔ کبھی کوئی لفظ یا لائن بدلنی ہوتی تو بدلواتے۔ سر نیچا کر کے دیر تک سوچتے رہتے، پھر اپنا اسکرپٹ بغل میں دبا کے کھڑے ہوتے اور زور سے بولتے، "Let's start!" اور سیٹ پر چلے جاتے۔

مانک دا کا اسکرپٹ بھی ان کی شخصیت کی طرح ایک الگ ہی چیز تھی۔ یہ ایک بہت موٹا سا کھاتا تھا، جیسا پرانے زمانے کے بنیوں کے پاس ہوا کرتا تھا۔ فل سائز کے چکنے بادامی کاغذ اور لال رنگ کے کپڑے کی جلد۔ وہ خود بھی اسے 'کھاتا' ہی کہا کرتے تھے۔ اس کھاتے میں فلم کا ہر سین انگلش اور بنگلہ رسم الخط میں اردو ڈائیلاگ کے ساتھ لکھا ہوتا تھا۔ پورے سین کا Shot Division درج ہوتا تھا اور ہر شاٹ کا ایک اسکیچ بنا ہوا ہوتا تھا جسے دیکھتے ہی معلوم ہو جاتا کہ سیٹ کے کس حصے میں شوٹنگ ہوگی، آرٹسٹ کی پوزیشن کیا ہوگی۔ چونکہ مانک دا بہت اچھے پینٹر بھی تھے اس لیے اسکیچ دیکھتے ہوئے ایسا لگتا تھا جیسے فلم کا فریم دیکھ رہا ہوں۔ سین کو اس طرح ایک ایک فریم کے اسکیچ میں بانٹنا آج کل تو بہت عام ہو گیا ہے اور اسے 'اسٹوری بورڈ' کہا جاتا ہے، مگر اس وقت میرے لیے بالکل ہی نئی تکنیک تھی۔

مانک دا نے دنیا کی فلم انڈسٹری میں اپنے لیے ایک الگ مقام بنایا تھا۔ ان کی شخصیت بھی دوسروں سے مختلف تھی مگر ان میں اور بھی ایسی بہت سی باتیں تھیں جو انھیں ایک منفرد حیثیت دیتی ہیں۔ پتا نہیں یہ عادتیں ان کے مزاج کا حصہ تھیں یا انھوں نے کسی وجہ سے اختیار کر لی تھیں، مگر تھیں بہت دلچسپ،

Scanned with CamScanner

اور مانک دا کے کردار کو ایک نیا زاویہ مہیا کرتی ہیں۔

عام طور پر فلم ڈائرکٹرز شوٹنگ کے دوران اپنے سیٹ یا لوکیشن پر بھیڑ بھاڑ سے بہت گھبراتے ہیں مگر مانک دا کا حساب بالکل الٹا تھا۔ مجھے یاد نہیں کہ شطرنج کے کھلاڑی کی شوٹنگ کے دوران اندر پوری اسٹوڈیو کے فلور پر شوٹنگ دیکھنے والوں کی تعداد ڈیڑھ سو آدمیوں سے کبھی بھی کم رہی ہو۔ اور ایسا نہیں ہے کہ دیکھنے والے زبردستی گھس آئے ہوں اور انھیں نکالنا ممکن نہ ہو۔ جی نہیں، سیٹ پر وزیٹرز کے لیے باقاعدہ بندوبست کیا جاتا تھا۔ دیکھنے والے ورکنگ ایریا میں نہ آئیں اس لیے رسیاں باندھ دی جاتی تھیں اور معزز مہمانوں کے لیے کرسیوں کا بندوبست ہوتا تھا۔

حیرت اس پر ہوتی تھی کہ اتنی بھیڑ ہونے کے باوجود سارا کام اسی طرح ہوتا تھا جس طرح ہونا چاہیے۔ عوام کا ہجوم اس طرح چپ چاپ کھڑا رہتا تھا جیسے وہاں کوئی موجود ہی نہ ہو۔ سیٹ یا لوکیشن پر بھی کوئی شور وغل نہیں ہوتا تھا۔ میں نے مانک دا کو کبھی آواز اونچی کرتے نہیں سنا۔ وہ اداکاروں کو ہدایات بھی اس طرح دیتے تھے کہ اکثر مجھے بھی، جو بالکل پاس ہی کھڑا ہوتا تھا، کچھ سنائی نہیں دیتا تھا۔ وہ چاہے کتنی ہی دور کیوں نہ ہوں، اگر ایکٹر کی پوزیشن بھی تبدیل کرنی ہو تو اشارے سے یا چلا کر کبھی کچھ نہیں کہتے تھے بلکہ چل کر پاس آتے تھے اور جو کہنا ہوتا تھا وہ کہہ کر لوٹ آتے تھے۔

ایک دفعہ تو ایسا ہوا کہ مانک دا کرین کے اوپر بیٹھے تھے، نیچے محرم کا جلوس نکل رہا تھا جس میں امجد خان تاشا بجا رہا تھا۔ اچانک آواز آئی: ''کٹ!'' سب لوگ رک گئے کرین نیچے آیا۔ مانک دا اترے، امجد کے پاس گئے، اس سے کچھ کہا اور واپس کرین پر جا بیٹھے۔ آپ کو معلوم ہے وہ اتنے اوپر سے نیچے کیا کہنے آئے تھے؟ انھوں نے کہا:

''جب تھوڑا آگے آجاؤ تو تاشا بجاتے بجاتے سر اوپر کر لینا۔''

ان کی ایک اور عجیب ادا تھی کہ ایک دفعہ سیٹ پر چلے جائیں تو شام کو پیک اپ بولنے سے پہلے باہر نہیں آتے تھے۔ لنچ بریک میں جب لائٹ مین، اسپاٹ بوائے اور پروڈکشن والے بھی باہر چلے جاتے اور ویران فلور بھائیں بھائیں کرنے لگتا تو بھی مانک دا بیٹھے رہتے۔ ان کے زانو پر ان کا کھاتا ہوتا، آنکھیں کاغذ پر ہوتیں اور ایک ہاتھ میں قلم اور دوسرے میں سینڈوچ۔ ان کا کھانا بھی کمال ہی تھا۔ آٹھ گھنٹے کی شفٹ میں صرف ایک چکن سینڈوچ اور ایک گلاس 'مشٹی دوہی' (میٹھا دہی)، بس... اور منہ کا مزہ

جلانے کے لیے ایک سگریٹ۔

مانک دا ہر فن مولا تھے، ان فنون کی فہرست اتنی طویل تھی کہ پڑھنے کے بعد جی سے پوچھتی تھی،

”مولا یہ چیز کیا ہیں؟“

وہ ڈائرکٹر تھے، رائٹر تھے اور فلموں کے علاوہ بھی بہت کچھ لکھتے تھے، خاص طور سے بچوں کے لیے۔ پینٹر تھے، کارٹونسٹ تھے، اخباروں کے لیے معمے ترتیب دیتے تھے موسیقی میں خاصی مشق تھی، پیانو بہت اچھا بجاتے تھے اور اپنی فلموں کا میوزک زیادہ تر خود ہی دیا کرتے تھے۔ بیک گراؤنڈ میوزک تو ہمیشہ خود ہی کمپوز کرتے تھے۔ شوٹنگ کے وقت لائٹ تو ڈائرکٹر آف فوٹوگرافی کرتا تھا مگر کیمرا خود سنبھالتے تھے۔ شاٹ چاہے کتنا ہی مشکل کیوں نہ ہو، کیمرا مین کو ہاتھ نہیں لگانے دیتے تھے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اپنی آنکھ سے دیکھنے اور دوسرے کی نظر سے دیکھنے میں فرق ہوتا ہے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ اکثر چلتے ٹیک (Take) میں شاٹ بدل دیا کرتے تھے۔ چونکہ ایڈیٹنگ خود ہی کرتے تھے اس لیے ٹیکنگ (Taking) بھی اسی حساب سے کرتے تھے۔ صرف ایک ڈپارٹمنٹ ایسا تھا جس میں وہ کبھی دخل نہیں دیتے تھے، اور وہ تھا آرٹ ڈپارٹمنٹ۔

اس کی وجہ تھے آرٹ ڈائرکٹر بنسی چندر گپت، جو مانک دا کے پرانے ساتھی اور دوست بھی تھے اور اپنے فن میں اپنی مثال آپ تھے۔

سیدھے لفظوں میں کہا جائے تو کہا جائے گا کہ مانک دا ایک مکمل ڈائرکٹر تھے، اور مکمل ڈائرکٹر وہ ہوتا ہے جو اسکرپٹ سے اسکرین تک کی ہر منزل کو جانتا ہی نہیں، انھیں سر کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔

عام طور پر کہا جاتا ہے، اور حقیقت بھی یہی ہے، کہ ان کی فلمیں عوام کے بارے میں ہوتی تھیں لیکن عوام سے زیادہ خواص پسند کرتے تھے۔ مگر وہ خود عوام میں بے حد مقبول تھے۔

شطرنج کے کھلاڑی میں مجرا کرنے کے لیے ایک کمسن رقاصہ کی تلاش تھی۔ (بعد میں یہ کردار شسولی سین نے ادا کیا)۔ پتا چلا کہ سوناگاچھی میں ایک لڑکی ہے جو بہت اچھا ڈانس کرتی ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ مانک دا اسے بلوا لیتے۔ وہ بھی سر کے بل آتی مگر اس خیال سے کہ نئی جگہ پر گھبرا نہ جائے، مانک دا نے فیصلہ کیا کہ وہ خود جائیں گے۔ اس بازار حسن کی پتلی پتلی گلیوں میں گاڑی نہیں جا سکتی تھی اس لیے بڑی سڑک پر ہی اتر گئے اور چل پڑے گوہر مقصود کی تلاش میں۔

Scanned with CamScanner

آگے آگے لپکتے ہوئے پروڈکشن مینجر بھانو داس کے پیچھے لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے مانک دا، اور قدم سے قدم ملانے کی کوشش کرتا ہوا میں۔ راستے میں جس نے بھی دیکھا، یا تو رک گیا یا پلٹ کر دیکھنے لگا۔

مانک دا نے کوٹھے پر پہنچ کر لڑکی کا مجرا دیکھا، کچھ ادھر اُدھر کی باتیں کیں، اور جب ہم لوگ واپس جانے کے لیے نیچے اترے تو وہ گلی بلکہ آس پاس کی گلیاں بھی اپنے ستیہ جیت بابو کو ایک نظر دیکھ لینے والوں سے بھر چکی تھیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ مانک دا کو دیکھ کر لوگ ان پر اس طرح نہیں ٹوٹے جیسا عام طور پر فلم والوں کے ساتھ ہوتا ہے، بلکہ ہجوم ادب سے ہٹ کر راستہ دیتا گیا اور وہ نکلتے چلے گئے۔

کتابوں میں پڑھا ہے کہ ارجن کی آنکھ پتیوں میں چھپی ہوئی چڑیا کو دیکھ لیا کرتی تھی۔ مانک دا کی آنکھ بھی کچھ کم نہیں تھی۔ آرٹسٹ ہو یا ٹیکنیشن وہ نہ جانے کیسے اندر چھپا ہوا ٹیلنٹ دیکھ لیا کرتے تھے، وہ بھی ایک نظر میں! ان کی اس انوکھی صلاحیت کی درجنوں مثالیں ابھی تک موجود ہیں۔

اپنا قصہ تو میں سنا چکا ہوں۔ سعید جعفری کا واقعہ بھی سن لیجیے۔

سعید لندن میں رہتے تھے۔ بی بی سی پر کام کرتے تھے، کچھ برٹش اور کچھ امریکی فلمیں بھی کر چکے تھے۔ ایک دن بیروت کے ہوائی اڈے پر اپنی فلائٹ کا انتظار کر رہے تھے کہ مانک دا پر نظر پڑی جو دہلی جا رہے تھے۔ سعید نے اپنا تعارف کرایا اور باتیں کرنے لگے۔ اچانک مانک دا نے کہا: "سعید، تم میری فلم میں کام کرو گے؟" اس وقت تک سعید جعفری ہندوستانی ہوتے ہوئے بھی ہندوستان کی فلم انڈسٹری سے اتنے ہی ناواقف تھے جتنا ہندوستان ان سے انجان تھا۔

فلم اور وہ بھی ستیہ جیت رے کی فلم...نہ کہنے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ سعید نے جوش میں مانک دا کے ہاتھ چوم لیے اور خوشی سے جھومتے ہوئے اپنے ایرکرفٹ کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔

امجد خان سے تو وہ ملے بھی نہیں، شعلے میں دیکھا تو دوسرے دن امجد کا اسکیچ بنایا۔ گالوں پر زلفیں لہرائیں، گلے اور کانوں میں ہیرے پہنائے اور سر پر زرکار دوپلّی ٹوپی لگا دی تو یہ کہنے کے لیے ایک ہی نگاہ کافی تھی کہ "ارے! یہ تو جان عالم واجد علی شاہ اختر کا پورٹریٹ ہے۔"

شرمیلا ٹیگور، اَپرنا سین اور شومترو چٹرجی کو اندھیرے سے نکال کر ستاروں میں بٹھانے کا کام بھی مانک دا ہی نے کیا تھا۔

Scanned with CamScanner

عظیم آرٹ ڈائرکٹر بنسی چندر گپت سری نگر سے کلکتہ آئے تھے کہ پینٹنگ سیکھیں گے مگر ٹکرا گئے ستیہ جیت رے سے، جنھوں نے بنسی دا کو پاتھر پنچالی کا سیٹ ڈیزائن کرنے کا کام سونپ دیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ تاریخ ہے۔

بے مثال کیمرا مین سبرتو مترا جنھوں نے دنیا کو باؤنس لائٹ (Bounce Light) سن تکنیک سکھائی، مانک دا ہی کی کھوج تھے۔ کتنی انوکھی بات ہے کہ جس آدمی نے کبھی کیمرا نہ سنبھالا ہو اسے کیمرا مین بنا دیا جائے، مگر یہی تو وہ صلاحیت ہے جسے مانک دا کی تیسری آنکھ کہا جا سکتا ہے۔

چھوٹی چھوٹی معمولی باتیں جس پر کسی کا دھیان بھی نہ جاتا تھا، ان کی تیسری آنکھ سے بچ کر نہیں جاتی تھیں۔ اسٹوڈیو میں میر روشن علی کے گھر کا سیٹ لگ رہا تھا۔ شوٹنگ سے پہلے دیکھنے آئے تو بنسی دا سے کہنے لگے، دیواریں میلی ہونی چاہییں۔ بنسی دا نے کہا، ہو جائیں گی۔ مانک دا جاتے جاتے اچانک رکے اور وہ بالٹی اٹھا لی جس میں پینٹ برش نرم ہونے کے لیے بھگو دیے گئے تھے۔ انھوں نے برش میں بالٹی کا گندا پانی لیا اور دیواروں کو رنگنا شروع کر دیا۔ پھر اس بے رونق اور بے نور دیوار کو دیکھ کر بولے: ''یہ اترا ہوا رنگ ہی اصلی رنگ ہے۔ ایسا لگنا چاہیے جیسے برسوں سے کوئی رنگ روغن نہیں ہوا ہے۔''

اسی سیٹ کی بات ہے۔ کیمرا مین سومیندو رائے جنرل لائٹنگ کر چکے تھے۔ مانک دا نے لائٹنگ دیکھی، بہت دیر تک چاروں طرف دیکھتے رہے اور گھوڑے (لکڑی کا مچان) پر رکھے ہوئے بروٹ (پرانے زمانے کی دس کلو واٹ کی لائٹ) کی طرف اشارہ کر کے سومیندو سے کہا: ''اسے دو فٹ نیچے لے لو۔''

سومیندو نے سر ہلایا اور بروٹ نیچے اتارنے میں لگ گئے۔ مگر میری سمجھ میں نہیں آیا کہ بات کیا ہوئی؟ وہ لائٹ اس لیے لگائی گئی تھی کہ آنگن میں دھوپ آتی ہوئی دکھائی دے۔ اس میں دو فٹ اوپر یا نیچے سے کیا فرق پڑتا ہے؟ رہا نہیں گیا تو میں نے پوچھ ہی لیا۔ انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا اور آگے بڑھ گئے۔ یہ حقیقت ہے کہ میں نے کبھی کسی کو مانک دا سے کچھ پوچھتے نہیں دیکھا تھا مگر میرے اندر کا جرنلسٹ، جسے سوال پر سوال کرنے کی عادت تھی، کہاں رکنے والا تھا۔ میں نے پھر پوچھا تو وہ کچھ جھنجھلا گئے۔ میری آنکھوں میں دیکھ کر تیزی سے بولے: ''اسکرپٹ تم نے لکھی ہے، تمھیں نہیں معلوم؟''

''جی لکھا تو ہے مگر یہ لائٹ...؟''

''یہ سین کہاں ہو رہا ہے؟''

''جی لکھنؤ میں...''

''موسم کیا ہے؟''

''جی سردیاں... دسمبر جنوری۔''

''مرزا میر کے گھر کس وقت آتا ہے؟''

''جی سویرے ہی آتے ہیں۔ نو یا دس بجے...''

''Exactly۔ لکھنؤ میں، سردیوں میں، صبح دس بجے سورج نکلتا ہے۔ تو لائٹ اینگل کیا ہونا چاہیے؟''

انھوں نے میرے کندھے پر یک ہلکی سی چپت لگائی اور سیٹ سے باہر چلے گئے۔ میں دل ہی دل میں سر پکڑ کے سوچنے لگا: ''ارے باپ رے! یہ آدمی ہے یا...''

ن کا کہنا تھا جن باتوں کو ہم نظر انداز کردیتے ہیں وہی سب سے پہلے نظر آتی ہیں۔ عالم یہ تھا کہ ہم لوگ ہر ٹیک سے پہلے میر اور مرزا کی شالوں کی سلوٹیں (Folds) بھی گنتے اور درست کرتے تھے تاکہ کنٹی نیوئی (Continuity) میں پریشانی نہ ہو۔

لکھنؤ کے پاس جس گاؤں میں کلائمکس کی شوٹنگ ہونی تھی وہاں دو دن پہلے منھ اندھیرے پہنچ گئے۔ شومندو راے، میں اور پروڈکشن کا ایک مقامی آدمی ساتھ میں تھے۔ ایک گاؤں والے سے چارپائی مانگی اور نیم کے پیڑ کے نیچے بیٹھ کر روشنی کا سفر دیکھتے رہے اور اپنے کھاتے میں نوٹس لکھتے رہے۔ جب سورج ہمارے سروں پر سے گزرتا ہوا جھونپڑوں کے پیچھے جا چھپا تو اٹھے اور دن بھر کے غور برت کے بعد شومندو سے بنگلہ میں ایک جملہ کہا: ''ریفلیکٹرز (Reflecters) کی ضرورت ہوگی۔'' اور بس!

پہلی دفعہ سمجھ میں آیا کہ آؤٹ ڈور میں گھٹتی بڑھتی دھوپ کا مزاج سمجھنا فلم کے لیے کتنا ضروری ہے۔

ان کی فنکاری، ہوشیاری، باریک بینی کو دنیا جانتی ہے۔ مگر کم لوگوں کو معلوم ہے کہ اس بلند و بالا شخصیت کے اندر ایک معصوم بچہ بھی تھا۔

کسی بھولے بچے کی طرح چھوٹی چھوٹی باتوں پر خوش ہونا، نئی نئی چیزوں پر حیران ہونا اور یہ جستجو کہ خوب سے بے خوب تر کہاں ان کے کردار کا ایک حصہ تھا۔

Scanned with CamScanner

ایک رات وہ سین فلم ہو رہا تھا جس میں شبانہ اعظمی غصے میں تیزی سے چلتی ہوئی برآمدے سے گزرتی ہیں اور میز پر شطرنج کے مہرے اچھال دیتی ہیں۔ جس برآمدے سے شبانہ کو گزرنا تھا اس میں ٹرالی لگی ہوئی تھی اور کیمرے کو شبانہ کے ساتھ ساتھ چلنا تھا۔ کئی بار ریہرسل ہو چکی تھی، ٹرالی کی رفتار طے کی جا چکی تھی، بس ٹیک کی دیر تھی کہ مانک دا کی آواز سنائی دی:

''جاوید''

''یس سر؟''

انھوں نے حویلی کے آنگن کی طرف اشارہ کیا اور بولے: ''یہ بڑا ویران ویران سا لگ رہا ہے۔ اس میں کوئی بریک دے سکتے ہو؟ اور لال رنگ کی کوئی چیز بیچ میں آ جائے تو بہت اچھا لگے گا۔''

میں نے کہا: ''آپ کہیں تو رسّی باندھ کر اس پر کوئی لال چادر ڈال دوں؟''

حویلی کے آنگنوں میں اسی طرح کپڑے سکھائے جاتے ہیں۔

''ہش... لال کپڑا تو بہت گندا لگے گا!''

میں نے بہت سوچا مگر کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ آرٹ ڈپارٹمنٹ والوں نے ہاتھ کھڑے کر دیے۔ اچانک میرے ذہن میں بجلی کوندی۔ میں نے کہا: ''آگ''

فوراً ایک بڑا سا چولھا بنوایا گیا۔ اس پر ایک برتن بھی رکھ دیا گیا اور چولھے میں آگ لگا دی گئی۔ جب سوکھی لکڑیوں سے اونچے اونچے سرخ شعلے اٹھے تو عالم دیکھنے کا تھا۔ مانک دا ٹرالی کے اوپر کھڑے ہو گئے اور چلانے لگے: ''جلدی آؤ، دیکھو!... فریم کتنا خوبصورت بن گیا۔ ارے، کیمرے میں سے دیکھو!'' میں نے دیکھا، پس منظر کا منظر ہی بدل گیا تھا۔

وہ سین اسکرین پر چار سیکنڈ سے زیادہ نہیں رہتا، اور شاید ہی کسی نے پس منظر میں جلتی ہوئی آگ پر غور کیا ہو۔ مگر میں مانک دا کی خوشی سے چمکتی ہوئی آنکھیں اور مسکراتے ہوئے ہونٹ کبھی نہیں بھول سکتا۔ وہ ایک معصوم بچے کا چہرہ تھا جسے انعام میں کیک مل گیا ہو۔ اپنی فلم کے ہر فریم کو ایک پینٹنگ بنا دینے کی کوشش ان کے بعد میں نے کسی اور میں نہیں دیکھی۔

جہاں تعریف و توصیف ہوتی ہے، وہاں تنقید بھی لازمی ہے۔ ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں۔ مانک دا کو برا کہنے والوں کی کمی نہیں تھی۔ ان پر سب سے بڑا الزام یہ تھا کہ وہ دنیا کے سامنے اپنے

Scanned with CamScanner

ملک کی ایسی تصویر پیش کر رہے ہیں جس میں غریبی اور بدحالی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ نرگس دت نے تو پارلیمنٹ میں کہا تھا:

"ستیہ جیت رے کو بھوکا ننگا ہندوستان دکھانے کے بجائے اس آزاد ہندوستان کو دکھانا چاہیے جو ترقی کر رہا ہے۔" یہ الگ بات ہے کہ سچائی آج بھی وہی ہے جو آدھی صدی پہلے تھی۔

مخالفین کی رائے تھی کہ وہ دکھاوا بہت کرتے ہیں؛ وہ خود کو جتنا بڑا سمجھتے اور دنیا کو سمجھاتے ہیں اتنے بڑے ہیں نہیں۔

ایک مشہور بنگالی ڈائرکٹر نے زہریلی ہنسی کے ساتھ کہا تھا: "ہنسی کی جوک ختم ہی نہیں۔ ہر دو منٹ بعد فریز (Freeze) ہو جاتا ہے تاکہ نمائے گھوش فوٹو لے سکے!"

یہ نمائے گھوش بھی مزیدار شخصیت تھے۔ کافی موٹے اور کالے تھے اور آنکھوں پر اتنا بڑا چشمہ لگاتے تھے کہ فریم گال پر ٹک جاتا تھا۔ گلے میں ایک ڈبل لینز یاشیکا کیمرا ڈالے ہر وقت مانک دا کے آس پاس منڈلاتے رہتے تھے۔ جب بھی موقع ملتا، اس طرح جھک جاتے جیسے بلی چوزہ پکڑنے کی تیاری میں ہو۔ پنجوں کے بل آگے بڑھتے اور فوٹو کلک کر کے اس طرح سیدھے ہوتے جیسے برجو مہاراج توڑا لیتے ہیں۔ اچھا فوٹو مل جائے تو چہرے پر مسکراہٹ دیکھنے کی ہوتی تھی۔ بالکل ایسا لگتا تھا جیسے سچ مچ بلی کو چوزہ مل گیا ہو۔ نمائے گھوش کے پاس مانک دا کی تصویروں کا نایاب ذخیرہ ہے۔ دنیا میں شاید ہی کسی کے پاس کسی ایک آدمی کی اتنی تصویریں ہوں گی۔

لوگ جسے دکھاوا اور شو آف سمجھتے تھے، اس میں میڈیا کی کارستانی بھی شامل تھی۔ نقادوں، تبصرہ نگاروں اور چاہنے والوں نے اتنا لکھا اور ایسا ایسا لکھا کہ اکثر خود بے چارے ستیہ جیت رے بھی حیران ہو جایا کرتے تھے۔ اپور سنسار دیکھ کر ایک جرنلسٹ نے پوچھا: "اس فلم میں اتنے بہت سے Tracking Shots ہیں جبکہ آپ کی پہلی فلم میں سب کے سب Fixed Shots تھے۔ آپ نے اپنا اسٹائل کیوں بدلا؟"

مانک دا نے جواب دیا: "پاتھر پنچالی کے وقت میرے پاس ٹرالی نہیں تھی۔"

ایسا ہی قصہ ابھیجان کا ہے جو ایک ٹیکسی ڈرائیور کی کہانی ہے۔ فلم کے پریس شو کے بعد ایک صحافی نے رے صاحب کی تعریفوں کے پل باندھ دیے۔ "سر، ایک ٹیکسی ڈرائیور کے ٹوٹے ہوئے

Ego کو دکھانے کے لیے آپ نے RVM (پیچھے دیکھنے کے لیے آئینہ) کو ٹوٹا ہوا دکھایا ہے۔ واہ واہ! یہ کمال آپ ہی دکھا سکتے ہیں!" ستیہ جیت رے نے حیرت سے جرنلسٹ کو دیکھا، پھر آرٹ ڈائرکٹر بنسی چندر گپت سے پوچھا، "بنسی، کیا وہ کانچ ٹوٹا ہوا تھا؟"

مانک دا یہ قصہ سنا کر خوب ہنسا کرتے تھے۔

بڑھا بھی دیتے ہیں کچھ زیبِ داستاں کے لیے۔

اچھی بات یہ تھی کہ اپنے بارے میں لکھی گئی داستانوں پر خود انھوں نے بھی اعتبار نہیں کیا۔ میں نے تو ان کے پیر ہمیشہ زمین پر ہی دیکھے۔

میرے پاس مانک دا کی چھوٹی بڑی یادوں کی ایک پوری کتاب ہے جس میں سیکڑوں سوکھے ہوئے پھولوں کی طرح رکھے ہوئے ہیں۔ جب بھی شمع یا نریندر سنگھ (ساؤنڈ ریکارڈسٹ) مل جاتے ہیں، یادوں کی پرانی کتاب کھل جاتی ہے۔ شطرنج کی شوٹنگ کے دوران ہم لوگوں کا ایک چھوٹا سا کلب بن گیا تھا۔ شام ڈھلتی تو نیو کینل ورتھ ہوٹل میں چلے جاتے۔ نریندر سنگھ خود جتنے عمدہ آدمی ہیں ان کا ٹیسٹ (Taste) بھی اتنا ہی اچھا ہے، اس لیے بیٹھک ان کے روم میں سجتا اور ہم سب صوفوں اور قالینوں پر پھیل جاتے۔ ان میں ہر بات کو بے حد غور سے سنتی ہوئی شمع ہوتیں، بچوں جیسی مسکراہٹ والے بنسی دا ہوتے، شومندو رائے اور چل چڑ جی ہوتے، اور ہاں، زلفوں کو لہراتے، داڑھی پر ہاتھ پھیرتے اور زور زور سے ہاتھ ہلا کر گرما گرم سیاسی تبصرے کرتے ہوئے پروڈیوسر سریش جندل ہوتے۔ کبھی کبھی کوئی اسٹار بھی شریک ہو جاتا۔ جب رات بھیگنے لگتی تو سریش جندل شطرنج کے چھوٹے سے کنبے کو گاڑیوں میں بھرتے اور کسی نئے ریستوراں کی کھوج میں نکل پڑتے۔ سریش نے اپنے یونٹ کو جو عزت دی، میں نے آج تک کہیں نہیں دیکھی۔ عجیب دلدار پروڈیوسر تھا۔

شطرنج کے کھلاڑی 1977 میں ریلیز ہوئی۔ میں اس وقت شہر میں نہیں تھا۔ مانک دا نے برٹش فلم ڈائرکٹر جیمس آئیوری کو میرا نام بطور چیف اسسٹنٹ ڈائریکٹر تجویز کیا تھا۔ شطرنج کی ریلیز کے وقت میں جودھپور میں مرچنٹ آئیوری پروڈکشنز کی فلم ہلا بلو کی شوٹنگ کر رہا تھا۔ کوئی تین مہینے بعد واپسی ہوئی تو دوڑا ہوا ریگل سنیما پہنچا۔ مگر پتا چلا کہ فلم پسند نہیں کی گئی اور چار ہی ہفتے میں اتار لی گئی۔ یہ الگ بات ہے کہ اب تک یہی فلم چار گنا منافع کما چکی ہے۔

Scanned with CamScanner

ریلیز کے کئی سال بعد جب وہ بمبئی آئے تو میں سلام کو گیا۔ بہت محبت سے ملے، دیر تک بمبئی کی فلمی دنیا اور میری کوششوں کی کہانی سنتے رہے۔

میں نے پوچھا: ''کوئی ہندی اردو فلم پلان نہیں کر رہے ہیں؟''

کہنے لگے: ''دارا شکوہ بنانا چاہتا ہوں...''

میں نے کہا: ''دارا شکوہ میں ہم لوگ ہوں گے یا نہیں؟''

بہت زور سے ہنسے اور بولے: ''اگر تم نہیں ہو گے تو فلم کیسے بنے گی؟''

وہ میری اور ان کی آخری ملاقات تھی۔

آج ایک زمانہ گزر چکا ہے مگر مانک دا کا وہ جملہ میری یادوں میں سونے کے تمغے کی طرح جگمگاتا رہتا ہے۔

1983 میں گھورے بائیرے کی شوٹنگ کر رہے تھے کہ دل کا دورہ پڑا اور ان کی سرگرمیاں بے حد کم ہو گئیں۔ مگر ہمت والے آدمی تھے اور فلم بنانا ان کا شوق نہیں زندگی تھا، اس لیے ذرا سے سنبھلے تو پھر وہی کاروبار شوق شروع ہو گیا۔

اسی زمانے میں ایک سالگرہ پر مبارکباد کے لیے فون کیا تو آواز میں وہ پرانا بانکپن نہیں تھا۔ میں نے کہا: ''آپ کو دیکھنے کو بہت جی چاہتا ہے۔''

کہنے لگے: ''کلکتہ آ جاؤ۔''

میں نے کہا: ''میں تیار ہوں، آپ دارا شکوہ شروع کر دیجیے۔''

کچھ دیر چپ رہے پھر بولے: ''بہت مشکل ہے جاوید۔ اتنے بڑے پروجیکٹ کو بہت محنت چاہیے۔ طبیعت ذرا اور بہتر ہو جائے تو سوچوں گا۔''

اس کے بعد ان کی آواز سننے کا موقع کبھی نہیں ملا۔ پتا نہیں کس کی آواز تھی جس نے 23 اپریل 1992 کو فون پر کہا تھا:

''تمھارے مانک دا چلے گئے، جاوید!''

❁❁

سٹی پریس میں دستیاب اردو رسائل وجرائد

سہ ماہی نقاط، فیصل آباد
مدیر: قاسم یعقوب
قیمت: 150روپے

سہ ماہی دنیا زاد، کراچی
مدیر: آصف فرخی
قیمت: 160روپے

سہ ماہی آئندہ، کراچی
مدیر: محمود واجد
قیمت: 80روپے

کہانی گھر، لاہور
ترتیب: زاہد حسن
قیمت: 150روپے

سہ ماہی ارتقا، کراچی
ترتیب: راحت سعید، ڈاکٹر محمد علی صدیقی
قیمت: 100روپے

سہ ماہی روشنائی، کراچی
مدیر: احمد زین الدین
قیمت: 250روپے

سہ ماہی سمبل، راولپنڈی
مدیر: محمد علی فرشی
قیمت: 150روپے

کتابی سلسلہ اجرا، کراچی
مدیر: احسن سلیم
قیمت: 250روپے

کتابی سلسلہ مکالمہ، کراچی
مدیر: مبین مرزا
قیمت: 350روپے

تاریخ، لاہور
مدیر: ڈاکٹر مبارک علی
قیمت: ضخامت کے اعتبار سے

سہ ماہی نیا ورق، ممبئی
مدیر: ساجد رشید
قیمت: 120

سہ ماہی نظم نو، کراچی
مدیر: علی ساحل
قیمت: 200

ماہنامہ قومی زبان، کراچی
مدیر: ڈاکٹر ممتاز احمد خان
قیمت: 15روپے

ماہنامہ الحمرا، لاہور
مدیر: شاہد علی خان
قیمت: 50روپے

ماہنامہ نیا زمانہ، لاہور
مدیر: محمد شعیب عادل
قیمت: 20روپے

Scanned with CamScanner

مطہر ضیا

ڈاکٹر روتھ فاؤ کا زندگی نامہ

انگریزی سے ترجمہ
صائمہ ارم

Scanned with CamScanner

1

8 مارچ 1960 کی دھوپ بھری سہ پہر کو اطالوی ایرلائن ال اتالیا کی ایک پرواز کراچی ایرپورٹ پر اترتی ہے۔ سفید رنگت والے یورپی مسافر، جو سیدھے پیرس سے آرہے ہیں، جہاز سے اترنا شروع کرتے ہیں۔ ان میں کانونٹ کی ایک تیس سالہ جرمن شاگردہ روتھ فاؤ بھی ہیں جو ہندوستان جاتے ہوئے یہاں عارضی طور پر رکی ہیں۔ ان کے پاس مختصر سے سامان کے علاوہ تین عہد ہیں جو انھوں نے پیرس میں "ڈاٹرز آف دی ہارٹ آف میری" نامی کانونٹ کی شاگردہ کے طور پر اپنے پہلے برس کے دوران کیے ہیں۔ ناداری، پاکبازی اور اطاعت کے عہد۔

وہ جس مسیحی تنظیم سے وابستہ ہیں اس کی بنیاد فرانسیسی انقلاب کے دوران میری ایڈیلیڈ (1749-1818) نے رکھی تھی، اور اس کے ضوابط ان پر ننوں کا روایتی لباس پہننے اور تنہائی کی زندگی گزارنے کی شرائط عائد نہیں کرتے۔ ان کا مشن دنیا میں کسی بھی جگہ انسانی مصائب کے خلاف کام کرنا ہے۔

جرمنی کی ایک یونیورسٹی سے طب کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد روتھ فاؤ کو ہندوستان ور پاکستان دونوں جگہوں سے درخواستیں موصول ہوئی ہیں کہ وہ وہاں آکر کام کریں۔ انھوں نے کراچی میں اپنی کمیونٹی کی درخواست یہ سوچ کر منظور کر لی ہے کہ یہاں سے وہ ہندوستان کا ویزا آسانی سے حاصل کر سکیں گی۔

ایرپورٹ سے انھیں سیدھے گرومندر پر واقع لڑکیوں کے ہاسٹل لے جایا جاتا ہے جو بابائے قوم قائداعظم محمد علی جناح کے مزار سے پیدل کی دوری پر واقع ہے۔ راستے میں انھیں گھروں کے باہر لگی بیلوں پر بوگن ویلیا کے پھولوں کے گچھے دیکھ کر ان پر گلاب کے پھولوں کا گمان ہوتا ہے۔ موسمِ سرما کے گرم کوٹ میں ملبوس روتھ فاؤ کو کراچی کی استوائی گرمی کی حدت ناقابلِ برداشت معلوم ہوتی

Scanned with CamScanner

ہے۔ اپنے طویل سفر کی تھکان کے علاوہ انھیں بھوک بھی محسوس ہو رہی ہے اور حبس بھی۔ لیکن ہاسٹل کی سپیریئر مدر میری ڈائل اصرار کرتی ہیں کہ وہ کھانے سے پہلے دعا کی مجلس میں شریک ہوں۔ براعظم ایشیا میں ان کا پہلا دن خاصا پر مشقت ثابت ہو رہا ہے۔ ان کی رات دم گھونٹ دینے والی گرمی اور کمرے کے نصف دیوار والے پارٹیشن کے دوسری طرف بجتے ہوئے ریڈیو کی آواز سے لڑتے ہوئے گزرتی ہے۔ نیم غنودگی کے عالم میں روتھ فاؤ کو پاکستان کی سرزمین کچھ زیادہ مہمان نواز محسوس نہیں ہوتی۔

آنے والے ہفتوں کے دوران وہ خود کو زبان کھولنے سے قاصر اور اکتایا ہوا محسوس کرتی ہیں۔ مشرقی جرمنی میں واقع اپنے اسکول میں انھوں نے جو ابتدائی انگریزی سیکھی تھی وہ کب کی ان کے ذہن سے فراموش ہو چکی ہے۔ پیرس میں اپنے قیام کے دوران جو تھوڑی بہت فرانسیسی انھوں نے ادھر اُدھر سے سیکھ لی تھی اس کے سہارے وہ برنیس سے بات چیت کر پاتی ہیں جو میکسیکو سے آئی ہوئی فارماسسٹ ہیں اور روتھ کو چھوڑ کر اس گروپ کی واحد غیر امریکی رکن ہیں۔ برنیس اپنی مادری زبان ہسپانوی کے علاوہ فرانسیسی میں بھی مہارت رکھتی ہیں۔ روتھ کو بول چال کی انگریزی میں اپنی استعداد بحال کرنے میں تین ہفتے لگ جاتے ہیں۔ تب ایک دن برنیس انھیں کراچی کی سب سے بڑی تجارتی شاہراہ میکلوڈ روڈ کے عقب میں واقع جذامیوں کی بستی میں چلنے کی دعوت دیتی ہیں۔

انیس سو ساٹھ کے اس تقدیر ساز دن روتھ فاؤ پاکستان میں رہ کر ان لوگوں کی خدمت کرنے کا فیصلہ کرتی ہیں جن کی خدمت نہ کسی اور نے کی تھی اور نہ کوئی اور کرنے والا تھا۔

2

مارتھا اور والٹر فاؤ کے گھر 9 ستمبر 1929 کو جنم لینے والی روتھ کیتھرینا مارتھا فاؤ ان کی پانچ بیٹیوں میں سے چوتھی تھیں۔ ان پانچ بہنوں کا اکلوتا بھائی شیر خوارگی کے دنوں ہی میں چل بسا تھا۔ والٹر فاؤ مشرقی جرمنی کے شہر لائپزگ کی ایک اشاعتی فرم میں کام کرتے تھے۔ لائپزگ قدیم زمانے ہی سے اشاعتی صنعت کا ایک اہم مرکز رہا تھا۔ اس کا سالانہ کتاب میلہ، جو ہر مارچ میں منعقد ہوتا تھا، ایک جانے پہچانے تہوار کی حیثیت حاصل کر چکا تھا۔ وہاں کی یونیورسٹی 1409 میں قائم ہوئی

Scanned with CamScanner

تھی۔ 1913 میں نئی قائم شدہ جرمن لائبریری کی چھت کے نیچے جرمن زبان کا پورا ادب ذخیرہ کر دیا گیا تھا۔

عظیم جرمن شاعر، ڈرامہ نگار اور مصنف یوہان ولفگانگ فان گوئٹے (1749-1832) کی مشہور تصنیف فاؤسٹ میں بیان کردہ لفظوں میں "لائپزگ مجھے بیحد عزیز ہے، ایک چھوٹا سا پیرس، وہ اپنے شہریوں کی شائستگی کو کتنی عمدگی سے پروان چڑھاتا ہے۔" مغربی کلاسیکی موسیقی کے باوا آدم یوہان سباستیان باخ (1665-1750) نے موسیقار کے طور پر اسی شہر میں اپنا مقام حاصل کیا اور اپنی معروف کمپوزیشنیں تیار کیں جو کلاسیکی موسیقی کے شاہکاروں کا درجہ رکھتی ہیں۔ ۱۹۲۹ میں اسی لائپزگ شہر میں روتھ فاؤ نے جنم لیا۔

جب مارتھا فاؤ کی چوتھی بیٹی ان کے پیٹ میں آئی، اس وقت تک اڈولف ہٹلر کی نیشنل سوشلسٹ جرمن ورکرز پارٹی (NSDAP) یا نازی پارٹی کے برسرِاقتدار آنے کا بیج بویا جا چکا تھا۔ آسٹریا میں پیدا ہونے والے ہٹلر نے اپنا منصوبہ پوری تفصیل کے ساتھ 1923 میں اپنی کتاب مائن کامف یا میری جنگ نامی کتاب میں بیان کر دیا تھا۔ اس منصوبے کے مطابق "سرطانی جمہوریت" کا خاتمہ کیا جانا تھا، بالشویکوں (کمیونسٹوں)، یہودیوں اور مارکسسٹوں کو جلاوطن کیا جانا تھا اور پوری دنیا پر جرمن قوم کا غلبہ قائم کیا جانا تھا۔ اس کے بعد کے برسوں میں اس نے اپنی پارٹی کو منظم انداز میں تعمیر کیا۔

روتھ کی پیدائش کے سات ہفتے بعد بیسویں صدی کی بدترین معاشی ابتلا واقع ہوئی۔ 29 اکتوبر 1929 کو نیویارک کا اسٹاک ایکسچینج کریش ہو گیا۔ وال اسٹریٹ کے اس 'سیاہ منگل' کے اثرات نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ زرعی اجناس کی قیمتیں زمین پر آ رہیں، فیکٹریوں پر تالے پڑنے لگے۔ لائپزگ میں، جو جرمنی کے صنعتی خطے کے قلب میں واقع تھا، تمام صنعتی سرگرمی ختم ہو گئی۔

لیکن گھر کے پیار بھرے اور تحفظ کا احساس دلانے والے ماحول میں پروان چڑھنے والی روتھ اس 'گریٹ ڈپریشن' کے اثرات سے کم و بیش بے خبری کے عالم میں بڑی ہوئی۔ اس کی زندگی کے ابتدائی سال اپنی بڑی بہنوں کے ساتھ اپنے وسیع خاندانی مکان کے اردگرد لگے باغ کے سیب کے درختوں پر چڑھنے کی سرگرمی میں گزرے۔ اسے اپنے باغ میں اگنے والی چیریوں کا شیریں ذائقہ

Scanned with CamScanner

بہت بھاتا تھا۔ کھٹی چیریوں کو جام بنانے کے لیے توڑا جاتا۔ وہ سب بہنیں باری باری سے اپنے والد کے بنائے ہوئے چھوٹے سے تالاب میں غوطے لگاتیں اور انھیں ایک دوسرے پر پانی کے چھینٹے اڑانے میں بہت مزہ آتا تھا۔ پھر وہ سب باغ کی چکنی مٹی سے قلعے بناتیں جن کے دو نیچے دروازوں میں سے چمکیلی رنگدار وردیوں والے ننھے مٹی کے سپاہیوں کو اندر باہر مارچ کرایا جاتا۔

روتھ اکثر پڑوس میں رہنے والی اُرسلا کے ساتھ اس کے خرگوشوں کے قبیلے کو کھانا کھلانے چلی جاتی جو اپنے لمبے کانوں اور چمکتی آنکھوں کے ساتھ ہری گھاس پر قلانچیں بھرا کرتے۔ لیکن اسے خود اپنا پالتو سبز طوطا سب سے زیادہ پیارا تھا جو اپنے پنجرے سے چھلانگ لگا کر نکلتا اور روتھ کی شہادت کی انگلی پر آ بیٹھتا اور وہ اسے اٹھائے اٹھائے فخر سے پورے گھر میں اس کی نمائش کرتی گھومتی۔ لیکن ایک غمناک دن طوطا ایک کھلی کھڑکی سے نکل کر پرواز کر گیا اور روتھ کو اس خیال سے اشکبار چھوڑ گیا کہ وہ رات کو کہاں سوئے گا اور دن میں اسے کون کھانا دے گا۔ اس وقت انھیں معلوم نہ تھا کہ خود انھیں بھی ایک دن اسی طرح اڑ جانا ہے۔ لیکن سبزی فروش نے، جو ہفتے میں دو بار اپنی گھوڑا گاڑی پر محلے میں سبزی بیچنے آیا کرتا تھا، روتھ کی والدہ کو پہلے ہی سرگوشی میں خبردار کر دیا تھا: "اپنی چوتھے نمبر والی بیٹی سے ہوشیار رہیے گا۔ وہ آپ کے پسند کیے ہوئے مرد سے شادی نہیں کرنے والی۔ یہ خود اپنے دماغ سے سوچتی ہے۔" روتھ کے والدین نے بھی ہنستے ہوئے اس خیال کی تصدیق کی کہ ان کی گھر سے گھونگھریالے بالوں اور چمکیلی آنکھوں والی بیٹی ایک پرعزم دماغ کی مالک ہے۔

گریٹ ڈپریشن یا عظیم معاشی کساد بازاری نے استحکام کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں۔ معاشی، سیاسی اور سماجی تنازعات بڑھنے لگے۔ ہر طرف شدید بے روزگاری اور سیاسی انتہا پسندی پھیل گئی۔ اس صورت حال کو چابکدستی سے استعمال کر کے ہٹلر نے کلیدی سیاسی حیثیت حاصل کر لی۔ اس کی تصویریں اور پوسٹر ہر طرف دکھائی دینے لگے۔ لیکن روتھ کے والد سے یہ شخص کسی طرح برداشت نہ ہوتا تھا، بالکل اسی طرح جیسے ان کی بیٹی کو اسکول میں ریاضی اور سلائی کڑھائی کے مضمون ناقابل برداشت لگتے تھے۔

1933 کے آتے آتے روتھ چار سالہ باتونی بچی بن چکی تھی اور نازی پارٹی رفتہ رفتہ اتنی طاقتور ہو چکی تھی کہ اس کے زور پر ہٹلر کو جرمنی کا چانسلر مقرر کر دیا گیا تھا۔ ہٹلر نے بہت جلد خود کو تمام

Scanned with CamScanner

آ گئی اور پارلیمانی پابندیوں سے آزاد کرا لیا۔ نیشنل سوشلسٹ جرمن ورکرز پارٹی کو ریاستی پارٹی کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ دوسری تمام پارٹیوں پر پابندی لگا دی گئی، ٹریڈ یونینوں کو ممنوع قرار دے دیا گیا اور حزب اختلاف کے اخبار زبردستی بند کر دیے گئے۔ ججوں کو فیوہرر کے کسی فیصلے سے اختلاف کرنے کا کوئی اختیار حاصل نہ رہا۔ ریاست نے نگرانی کا ایک طاقتور نظام قائم کر لیا۔ 'ریاست کے دشمنوں' کی فہرست میں کمیونسٹ، یہودی، مارکسسٹ، سیاسی طور پر فعال کلیسا، سیاسی بے اطمینانی میں مبتلا افراد، غلامی کے خاتمے کے حامی اور ہم جنس پرست شامل تھے۔ پولیس، ایس اے اور ایس ایس نامی ایجنسیوں کے ذریعے پارٹی نے مطلق العنان اقتدار حاصل کر لیا۔ ایس ایس خود کو ایلیٹ فورس خیال کرنے لگی۔ روتھ اپنے گھر کی بالکونی سے بھوری وردیوں میں ملبوس سپاہیوں کو سڑک کے اس پار واقع پارک میں بازوؤں پر سواستیکا کے بلے لگائے، ڈھول کی تھاپ پر مارچ کرتے دیکھتی اور خوف سے کانپنے لگتی۔

ہٹلر جرمن رائش (سلطنت) اور جرمن قوم کا فیوہرر (قائد) بن بیٹھا۔ نسل پرست نظریے کا پرچار کیا جانے لگا۔ ریاستی تعلیمی ادارے بچوں کو "جرمن کے سوا کچھ نہ سوچنے، خود کو جرمن محسوس کرنے اور جرمنوں کی طرح برتاؤ کرنے" کا درس دیا کرتے۔ روتھ نے بھی اپنے اسکول میں یہی تعلیم حاصل کی کہ جرمنوں کی اعلیٰ نسل کو "رہنے کے لیے گنجائش" درکار ہے۔ اس کے کمسن ذہن میں خیال آتا: "ہمارے اردگرد اتنی ساری جگہ تو پہلے ہی موجود ہے۔ پھر ہمیں رہنے کے لیے مزید گنجائش آخر کیوں درکار ہے؟" لیکن سوال کرنے کی اجازت نہ تھی۔ سب کو معلوم تھا کہ ریاست کے مخبر ہر جگہ موجود ہیں۔

نوجوانوں کی تمام انجمنوں پر پابندی لگا دی گئی، اور ان سب کی جگہ صرف "ہٹلر یوتھ موومنٹ" نے لے لی جو نیشنل سوشلسٹ نظریے کی تعلیم اور فوجی بھرتی سے قبل کی تربیت کا آلہ بن گئی۔ تمام لوگوں کی طرح روتھ کے والدین نے بھی اپنی بیٹیوں کو موومنٹ کا رکن بنوایا۔ بچے سڑکوں پر پارٹی کے نغمے گاتے ہوئے مارچ کیا کرتے، اس بات سے یکسر بے خبر کہ ان کا ملک ایک جنگ کی تیاری کر رہا ہے۔

1933 کے بعد دنیا کی معیشت میں بہتری کے آثار پیدا ہوئے تو جرمنی کی حالت بھی سنبھلنے لگی۔ نیشنل سوشلسٹوں نے عوامی تعمیراتی سرگرمیوں کے ذریعے روزگار پیدا کرنے کا ایک پروگرام

Scanned with CamScanner

شروع کیا جس نے ملک کو از سرِ نو مسلح کرنے کے منصوبے کے ساتھ مل کر بے روزگاری کی شرح کو خاصا کم کر دیا۔ لیکن یہ تمام سرگرمیاں بیرونی زرِ مبادلہ، قرضوں اور نئے کرنسی نوٹوں کی چھپائی کے ذریعے چلائی جا رہی تھیں۔ سرکاری قرضے اتنی اونچی سطح پر جا پہنچے جہاں پہلے کبھی نہ پہنچے تھے۔ روتھ کی اسکول کی تعلیم جاری تھی۔ انھیں ادب اور حیاتیات کے مضامین پڑھنا پسند تھا اور وہ اسکول کے باغ میں بیج بونے، پودوں کو سینچنے اور زندگی کو نمو پا کر بڑھتا ہوا دیکھنے میں وقت صرف کرتی اور اس کا لطف اٹھاتی تھیں۔ اپنی عام سے خدوخال کی حامل موسیقی کی ٹیچر کی رسیلی آواز سن کر ان پر وجد طاری ہو جاتا۔ بیشتر استانیاں روتھ سے بہت لاڈ کرتیں جس پر انھیں بے اطمینانی سی محسوس ہونے لگتی۔ ''آخر میری وجہ سے دوسرے بچے ان کی توجہ سے کیوں محروم رہیں؟'' وہ سوچا کرتیں۔

تب ہی یہود دشمنی کی ایک لہر اٹھی اور یہودیوں اور ان کی املاک کے خلاف پرتشدد واقعات رونما ہونے لگے۔ 'ایرین پیراگراف' یہودی ڈاکٹروں، وکیلوں، صحافیوں اور فنکاروں کے خلاف قانونی کارروائیوں کی بنیاد کے طور پر استعمال کیا جانے لگا۔ ریستورانوں، کلبوں اور عوامی پارکوں میں یہودیوں کے داخلے پر پابندی لگا دی گئی۔ آرٹ گیلریوں، لائبریریوں اور تھیٹروں سے یہودیوں کے فن پارے ہٹا دیے گئے۔ یہودی شخصیات کے نام پر بنائی گئی سڑکوں کے نام بدلے جانے لگے۔ نومبر 1938 میں جرمن ایمپائر کی 'کرسٹل ناخت' یا ٹوٹے ہوئے شیشوں کی رات کو پولیس اور ایس اے کے سپاہیوں نے تمام یہودی عبادت گاہوں کو جلا ڈالا، یہودیوں کی دکانوں کو تباہ کر دیا؛ ان کی املاک کو لوٹ لیا گیا اور مالدار یہودیوں کو گرفتار کر کے کنسنٹریشن کیمپوں میں ڈال دیا گیا۔

روتھ کی کلاس میں پڑھنے والی یہودی لڑکی غائب ہو گئی اور پھر کبھی واپس نہ آئی۔ روتھ مسلسل سوال کرتی رہیں کہ گھونگھریالے سنہرے بالوں اور گلابی رخساروں والی ان کی پیاری سہیلی آخر کہاں چلی گئی۔ لیکن انھیں کسی سے اپنے سوال کا جواب نہ ملا۔ جب ان کی بڑی بہن والٹراڈ کی زبان سے ''کنسنٹریشن کیمپ'' کا لفظ نکلا تو ان کی ماں نے پہلی بار اپنی کسی بیٹی کو سخت لہجے میں اپنی زبان بند رکھنے کو کہا۔

بعد میں انھیں پتا چلا کہ کس طرح یہودیوں کی ایک بڑی تعداد کو کنسنٹریشن کیمپوں میں فائرنگ اسکواڈز کی سیدھی فائرنگ سے یا گیس چیمبروں میں زہریلی گیس چھوڑ کر ہلاک کیا گیا۔ بہت

Scanned with CamScanner

سے یہودی ناکافی غذا یا شدید مشقت کے نتیجے میں ہلاک ہوئے۔ ان سب کی کل تعداد ساٹھ لاکھ تک جا پہنچی۔

گابی کی مسکراتی ہوئی نیلی آنکھیں روتھ کے ذہن پر کئی برس کے لیے مسلط ہو کر رہ گئیں۔ انھوں نے کتنے ہی پرمسرت موقعوں پر گابی کو اپنے سالگرہ کے کیک کی بتیاں پھونک مار کر بجھاتے دیکھا تھا۔

روتھ کی دسویں سالگرہ سے ٹھیک ایک ہفتہ پہلے ہٹلر نے ''اعلیٰ جرمن نسل'' کے لیے ''رہنے کی گنجائش'' حاصل کرنے کی غرض سے، اپنے توسیع پسندانہ، سامراجی منصوبے کا آغاز کر دیا۔ یکم ستمبر 1939 کو پولینڈ پر کیے جانے والے حملے نے ہٹلر کے ''بلٹز کریگ'' یا کڑکتی بجلی جیسی جنگ کے تصور کو واضح کر دیا۔ جس وقت روتھ اپنی دسویں سالگرہ کی منتظر تھیں، بنی نوع انسان کی تاریخ کی عظیم ترین جنگ، دوسری عالمی جنگ، شروع ہو چکی تھی۔

1943 میں اتحادی فوجوں نے اپنے فضائی حملوں میں اضافہ کر دیا اور شہری آبادیوں کو بھی نشانہ بنانے لگیں۔ کوئی رات ایسی نہ جاتی جب فضائی حملے کے سائرن کی آواز سے دہشت کے عالم میں ان کی آنکھ نہ کھلتی ہو اور خوف سے کانپتے ہوئے تہہ خانے میں جا کر پناہ نہ لینی پڑتی ہو۔

4 دسمبر 1943 کی رات کو شدید بمباری ہوئی۔ روتھ کو پڑوسیوں کے بچوں کی چیخوں اور ان کے بڑوں کی دعاؤں کی آوازیں سنائی دیں۔ انھوں نے سوچا کہ وہ اس رات سے زندہ باہر نہ نکل پائیں گی۔ صبح کے وقت انھیں اپنے گھر والوں کو زندہ پا کر سخت تعجب ہوا۔ لیکن ان کے مکان کی پہلی منزل کو، جہاں روتھ کی خوابگاہ اور مطالعے کا کمرہ واقع تھا، بمباری سے سخت نقصان پہنچا تھا۔ اس کی چھت اڑ گئی تھی۔ دیواروں میں دراڑیں پڑ گئی تھیں اور فرش سے پانی رس رہا تھا۔ دروازے اکھڑ کر اپنی چوکھٹوں سے الگ ہو گئے تھے اور کھڑکیوں کے شیشے چکنا چور ہو چکے تھے۔ بجلی کی سپلائی منقطع ہو چکی تھی، پانی کے پائپ ٹوٹے پڑے تھے اور نکاس کا نظام تباہ ہو چکا تھا۔ ہر طرف گرد و غبار پھیلا تھا اور شیشوں کی کرچیاں بکھری ہوئی تھیں۔

روتھ کے والد والٹر فاؤ نے اپنے بیوی بچوں کو دیہات میں اپنی والدہ کے گھر لے جانے کا ارادہ کیا جو بمباری سے محفوظ رہا تھا۔ روتھ کی دو بڑی بہنیں والٹراڈ اور رحینا اسلحے کی فیکٹری میں اپنی

Scanned with CamScanner

ڈیوٹی کر رہی تھیں اور تیسری آر مگارڈ اسکول کے کیمپ میں مشغول تھی، اس لیے والدین نے روتھ اور ان کی چھوٹی بہن باربرا کو ساتھ لیا اور کچھ ضروری سامان لے کر روانہ ہو گئے۔ وہ جلتی ہوئی گلیوں میں سے ہو کر گزرے اور انھیں ملبے کے ڈھیروں پر چڑھ کر اور زمین پر پڑی لاشوں کو پھلانگ کر آگے بڑھنا پڑا۔ گرد و غبار اور دھواں ان کی آنکھوں کو اندھا کیے دے رہا تھا، جلی ہوئی لاشوں سے اٹھتے تعفن سے ان کی سانس بند ہوئی جا رہی تھی۔ وہ لوگ روتھ کی دادی اماں کے گھر شام کے وقت تھکن اور صدمے سے نڈھال پہنچے۔

لڑکیوں کو ان کی دادی کے پاس چھوڑ کر والدین لائپزگ واپس روانہ ہو گئے جہاں انھیں اپنے مکان کی دیکھ بھال کرنی تھی۔ لیکن سال بھر کے اندر گھر کے سب لوگ دوبارہ اکٹھے ہو گئے، کیونکہ لائپزگ شہر پر بار بار ہونے والی بمباری کی خبریں سنتے ہوئے اپنے والدین سے دور رہنا روتھ اور باربرا دونوں بہنوں کے لیے بہت دشوار ثابت ہو رہا تھا۔

3

جنگ کا خاتمہ 8 مئی 1945 کو ہوا جب جرمن فوجوں نے اپنی شکست تسلیم کر کے غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دیے۔ روتھ کی عمر اب سولہ برس کی ہو چکی تھی۔ ان کا ملک چار اتحادی ملکوں کی فوج کے قبضے میں آ کر دو ٹکڑوں میں بٹ گیا تھا۔ اس ملک کے شہری ایک مخمصے سے دوچار تھے: ان کی شکست اور توہین کا لمحہ ہی ایک غیر انسانی آمریت سے ان کی نجات کا لمحہ بھی تھا، اور اس نجات کے باوجود وہ غیر ملکی فوجوں کے تسلط میں تھے۔

بہار کا موسم تھا اور روتھ کے باغ میں چیری کے پیڑ پھولوں سے لدے ہوئے تھے۔ ملبے کے ڈھیروں کے درمیان گلاب کے پھول اپنی عالی شان بہار دکھا رہے تھے۔ روتھ اپنے باغ کے سبز دروازے پر بیٹھی برابر کے مکان کی گری ہوئی دیوار کو تک رہی تھیں۔ جرمنی کے بہت سے اور شہروں کی طرح ان کا شہر بھی تباہی کا منظر پیش کر رہا تھا۔ اس جنگ کے نتیجے میں جرمنی کے تیس لاکھ سے زیادہ لوگ ہلاک ہوئے تھے۔ وہاں بیٹھے بیٹھے روتھ کے ذہن میں خیال آ رہا تھا کہ ان کی جان بھلا کیسے بچ گئی۔ ان کی نظروں کے سامنے سڑک پر امریکی فوجی بے پروائی سے چلتے ہوئے مسکرا رہے تھے۔

Scanned with CamScanner

ہاتھ ہلا رہے تھے اور بچوں میں چاکلیٹ تقسیم کر رہے تھے۔ ان کی موجودگی وقتی تسکین کا باعث تھی لیکن بہت جلد ان کی جگہ روسی فوجیوں نے لے لی۔ جب ان کی طرف سے ریپ اور لوٹ مار کی خبریں آتیں تو روتھ اور باربرا کو عدم تحفظ کا شدید احساس ہوتا۔

پھر کھانے پینے کی اور دوسری چیزوں کی سخت قلت شروع ہو گئی۔ 1946 کے سخت جاڑوں میں روزمرہ راشن اور بھی کم کر دیا گیا۔ ان کے حصے میں صرف چقندر اور آلو آتے۔ وہ انھیں ابالتے، تلتے اور ان کا بھرتا بناتے۔ ان کے نومولود بھائی کے لیے دودھ دستیاب نہ تھا۔ ان کی ماں اتنی بیمار تھیں کہ اسے اپنا دودھ نہیں پلا سکتی تھیں۔ روتھ کو باہر نکل کر لکڑیاں یا کوئلے چرا کر لانے پڑتے تاکہ انھیں جلا کر گھر کو گرم رکھا جا سکے۔ نومولود بچہ کچھ ہی عرصے میں چل بسا۔

1946 میں سرد جنگ کے آغاز ہی سے جرمنی دونوں بڑی طاقتوں امریکہ اور سوویت یونین کے درمیان نظریاتی جنگ کا میدان بن گیا۔ یورپ کا جو خطہ سوویت یونین کے زیر اثر تھا اس کی سرحدوں کے گرد ایک آہنی پردہ کھنچ گیا جس کے اندر سیاسی ڈھانچے پر کمیونسٹوں کا تسلط قائم ہو گیا جنھوں نے بینکوں اور صنعتوں کو قومی ملکیت میں لے لیا۔ ولٹر فاؤ کی اشاعتی فرم کو بھی قومیا لیا گیا۔ ان کی ملازمت ختم ہو گئی۔ چونکہ وہ کمیونسٹ پارٹی کے رکن نہ تھے، اس لیے ان کی بیٹیوں کے لیے یونیورسٹی میں داخلہ لینا ناممکن ہو گیا۔ سخت مایوسی کے عالم میں وہ سرحد پار کر کے مغربی جرمنی چلے آئے اور وہاں وائزباڈن کے شہر میں اپنے سابق باس سے آ ملے تاکہ اشاعتی کاروبار کو نئے سرے سے قائم کرنے میں ان کی مدد کر سکیں۔

مغربی اتحادیوں نے مغربی جرمنی میں پارلیمانی جمہوریت قائم کی۔ امریکہ کے معاشی امداد کے پروگرام، "دی مارشل پلان" کی مدد سے اور جون 1948 میں کی گئی کرنسی کی اصلاحات کے نتیجے میں مغربی جرمنی کی معیشت بحال ہوئی۔ تعمیر نو کی سرگرمیوں کا زبردست پھیلاؤ ہوا۔ اس "معاشی معجزے" کے نتیجے میں وہ سماجی مسائل بھی رفتہ رفتہ حل ہوئے جو نیشنل سوشلسٹ آمریت اور جنگ کے دور میں پیدا ہوئے تھے۔ جنگ میں زخمی ہونے والوں کا علاج کیا گیا، ان کو معاوضوں کی فوری ادائیگی کی گئی، ہجرت کر کے آنے والوں کو معاشرے میں سمویا گیا اور رہائش کے سنگین مسئلے کو حل کیا گیا۔

ان بہتر ہوتے ہوئے حالات سے حوصلہ پا کر محبت کرنے والے باپ کے طور پر والٹر فاؤ نے

Scanned with CamScanner

اپنی بیٹی روتھ کو بھی وائزباڈن میں ان سے آ ملنے کو کہا۔ لیکن سرحد پر روسی فوجیوں کا پہرہ تھا جو چوری چھپے سرحد پار کرنے والوں کو دیکھتے ہی گولی مار دیتے تھے۔ اس کے باوجود روتھ وہاں سے نکلنے کے لیے پرعزم تھیں۔

انھوں نے اپنا ہینڈ بیگ اور تھوڑا سا ذاتی سامان ساتھ لیا اور یہ سوچے بغیر نکل کھڑی ہوئیں کہ انھیں کس سمت میں جانا ہے۔ پہلے وہ ٹرین کے ذریعے مشرقی جرمنی کی سرحد تک گئیں، پھر خفیہ طور پر سرحد پار کر کے 'نو مینز لینڈ' میں پہنچ گئیں جو مشرق اور مغرب کے درمیان واقع تھا۔ وہ اس علاقے میں دو دن اور دو رات متواتر پیدل سفر کرتی رہیں۔ اس دوران وہ دن کے وقت جنگلوں اور کھیتوں سے گزرتیں، وادیاں اور دریا پار کرتیں اور رات آتی تو چھوٹے دیہات کے پاس واقع اناج ذخیرہ کرنے کے احاطوں کے پیچھے چھپ جاتیں۔ ایک بار فر کی جھاڑیوں سے لدی ایک ڈھلان سے اترتے ہوئے ان پر دو فوجیوں کی نظر پڑ گئی۔ ان میں سے ایک روسی اور دوسرا جرمن تھا۔ روسی فوجی غالباً اتنا تھکا ہوا تھا کہ کوئی اقدام نہ کر سکتا تھا لیکن جرمن فوجی نے اس نوعمر تارکِ وطن کو حراست میں لے لیا۔ اس نے روسی فوجی سے کہا کہ وہ اس لڑکی کو حراستی کیمپ میں داخل کرا کے واپس آئے گا، اور روتھ کو وہاں سے چند قدم آگے لے آیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے ایک سمت اشارہ کرتے ہوئے کہا، "مغرب اُس طرف ہے۔"

روتھ اتنی خوش ہوئیں کہ اس کا شکریہ ادا کرنا بھی بھول گئیں۔ سرحد پار کر کے دوسری طرف پہنچنے کے بعد انھوں نے مڑ کر پیچھے نظر ڈالی تو دیکھا کہ جرمن فوجی اب بھی وہیں کھڑا ان کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلا رہا ہے۔ انھوں نے جواب میں مسکرا کر ہاتھ ہلایا اور پھر تیز قدموں سے آگے بڑھ گئیں۔ گوسلر نامی قصبے میں اپنے چچا کے گھر پہنچنے تک وہ تھکن سے اتنی بے حال ہو چکی تھیں کہ بستر پر ڈھیر ہو گئیں۔

چند روز آرام کرنے کے بعد وہ کولون شہر میں اپنے والد سے ملیں جہاں وہ ایک کتاب میلے میں شرکت کے لیے آئے ہوئے تھے۔ وہ دونوں ایک اعلیٰ درجے کے ہوٹل میں ٹھہرے اور ایک دوسرے کی معیت میں پرلطف وقت گزارا۔ روتھ کو اپنی نئی نئی ملی ہوئی آزادی ایک بڑی نعمت معلوم ہو رہی تھی اور وہ اس کے ایک ایک لمحے سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ کچھ ہی عرصے میں دونوں باپ بیٹی نے باقی گھر والوں کو بھی غیر قانونی طور پر وائزباڈن بلوا لیا۔

Scanned with CamScanner

23 مئی 1949 کو وفاقی جمہوریہ جرمنی کا بنیادی قانون منظور کیا گیا جس میں اس بات کو تسلیم کیا گیا کہ ملک کے شہریوں کی اکثریت دستوری نظام، پارلیمانی جمہوریت، سماجی فلاحی ریاست اور وفاقی ریاستی ڈھانچے کے حق میں ہے۔ اس بنیادی قانون نے وفاقی جمہوریہ جرمنی میں ایک پائیدار جمہوریت کے قیام کے لیے ٹھوس بنیاد فراہم کی۔ اس کی پہلی شق جس کا تعلق بنیادی حقوق سے تھا، ریاست پر ذمہ داری عائد کرتی تھی کہ وہ ہر فرد کے انسانی وقار اور انسانی حقوق کا احترام کرے۔

23 مئی 1949 ہی وہ تاریخ تھی جب وفاقی جمہوریہ جرمنی باقاعدہ طور پر قائم ہوئی۔ اسی سال 7 اکتوبر کو مشرقی جرمنی یا جرمن ڈیموکریٹک ریپبلک بھی وجود میں آئی۔ اس طرح جرمنی کی تقسیم کا عمل مکمل ہو گیا۔ روتھ کے لیے اس کا مطلب یہ تھا کہ اب وہ اپنی پیار کرنے والی دادی اور پھوپھی سے کبھی نہیں مل سکیں گی جنھوں نے جنگ کے برسوں میں ان کی اور ان کی چھوٹی بہن باربرا کی اتنی اچھی طرح دیکھ بھال کی تھی۔ بیشتر جرمن باشندوں کی طرح روتھ کے لیے بھی تقسیم کی اس کڑوی گولی کو نگلنا بے حد دشوار تھا۔

5 ستمبر 1949 کو کونراڈ ایڈیناور کو — صرف ایک ووٹ کی اکثریت سے — وفاقی جمہوریہ جرمنی کا وفاقی چانسلر منتخب کیا گیا۔ اس کے بعد غیر معمولی معاشی ترقی اور خوشحالی کا ایک دور شروع ہوا جو پندرہ سال سے زیادہ عرصے تک جاری رہا۔ وفاقی جمہوریہ معاشی انہدام کی حالت سے اٹھ کر دنیا کی تیسری مضبوط ترین صنعتی معیشت کے مقام تک جا پہنچی۔

1950 کی دہائی میں ''معاشی معجزے'' ہی کا دور تھا جس کے دوران روتھ محبت میں مبتلا ہو گئیں۔

A

روتھ کو اپنے اشاعتی کاروبار میں شامل کرنے کی ان کے والد کی کوششیں ناکام ہو چکی تھیں۔ کاروبار ایسی چیز نہ تھی جس سے وہ دلچسپی لے سکتیں۔ عورتوں کے مقبول عام فیشن میگزین بیئر (Beyer) پر جس کی تقسیم کاری کا کام ان کے والد اس قدر ذوق و شوق سے کرتے تھے، روتھ مشکل ہی سے کبھی نظر ڈالتیں۔ حسونیہ کے ہاتھوں اپنے کمسن بھائی کی موت اور زخمی سپاہیوں اور بے گھر پناہ

Scanned with CamScanner

گزینوں کی مدد کرنے کے تجربے نے روتھ میں طب کی تعلیم کے لیے دلچسپی پیدا کر دی۔ ایک نوعمر لڑکی کے طور پر وہ جنگ کے بعد لائپزگ میں بوڑھے اور بیمار شہریوں کی دیکھ بھال کر چکی تھیں۔ وہ ہمیشہ سے ایک ذہین طالب علم رہی تھیں چنانچہ انھیں مینز یونیورسٹی کے کلیۂ طب میں داخلہ حاصل کرنے میں کوئی مشکل پیش نہ آئی۔

یہ وہی شہر تھا جس میں پرنٹنگ پریس کو متعارف کرنے والے یوہانس گٹن برگ (1400-1468) نے جنم لیا تھا۔ گٹن برگ نے مینز شہر ہی سے 1455 میں اپنی مشہور 42 سطری بائبل شائع کی تھی۔

یورپ کے ثقافتی قلب میں، دریائے رائن کے کنارے واقع اسی مینز شہر میں طلبا کے ایک رقص کے پروگرام کے موقعے پر روتھ کی ملاقات ہرمن سے ہوئی۔ ہرمن دراز قد اور خوبصورت تھا اور رقص کرنے میں خاص مہارت رکھتا تھا۔ اس رات ہرمن کے ساتھ رقص کرنے میں روتھ کو بہت لطف آیا۔ اگلی صبح بہت سویرے اٹھ کر وہ اپنے ہاسٹل کے پچھواڑے کے باغ میں گئیں تاکہ گیندے کے زرد نارنجی پھولوں کی رفاقت میں وقت گزار سکیں جن سے انھیں بہت لگاؤ محسوس ہوتا تھا۔ جونہی انھوں نے پھولوں پر سے نگاہ اٹھائی، ہرمن کو اپنے سامنے کچھ فاصلے پر کھڑا پایا۔ اس نوجوان کے حسین سیاہ بال صبح کی نرم ہوا میں ہولے ہولے لہرا رہے تھے، اس کی گہری بھوری آنکھیں روتھ کو ستائش کی نظروں سے تک رہی تھیں۔ ہرمن نے پاس آ کر روتھ کو بتایا کہ وہ پچھلی پوری رات سو نہیں سکا۔ وہ رقص گاہ کے فرش پر روتھ کی موجودگی سے مسحور ہو کر رہ گیا تھا۔ صاف نیلے آسمان کے نیچے کھڑی روتھ کو محبت کے اس اظہار نے اپنے قدموں سے اٹھا کر ہوا میں بلند کر دیا۔ اور اگلے چھ مہینوں تک ان کے قدم واپس زمین پر نہ آئے۔

رائن کے کنارے واقع انگور اگانے والے حسین خطے میں روتھ اور ہرمن کا رومانس پروان چڑھتا گیا اور پورے کیمپس میں گفتگو کا موضوع بن گیا۔ جب وہ دونوں ساتھ ساتھ سائیکلیں چلاتے تو لڑکیاں روتھ پر رشک کرتیں اور لڑکے افسوس میں ہاتھ ملا کرتے۔ وہ دونوں ایک یہودی قبرستان میں درختوں کے سائے تلے ایک دوسرے کو بانہوں میں سمیٹے، ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گھنٹوں گزار دیا کرتے۔

Scanned with CamScanner

برٹن کا ساتھ پا کر روتھ کو اپنی زندگی میں پہلی بار احساس ہوا کہ کسی اور کے لیے جینا کیا معنی رکھتا ہے۔ اس وقت تک روتھ کے ذہن پر خود اپنے ہی وجود، اپنی ہی ذات کا خیال غالب رہا تھا۔ برٹن کی محبت نے انھیں بتایا کہ دوسروں کے لیے قربانی دینے میں کتنی مسرت پنہاں ہے۔

ایک روز صبح سویرے برٹن دوڑتا ہوا روتھ کے ہاسٹل کے کمرے میں پہنچا۔ روتھ نے دروازہ کھولا تو اسے اپنے سامنے، ہاتھ میں ایک چوہے دان لیے کھڑا پایا جس میں ایک چوہا بند تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ دونوں اس چوہے کو آزاد کرنے کی خوشی کا ساتھ ساتھ تجربہ کریں۔ روتھ کو یہ بات بڑی پرکشش معلوم ہوئی۔ لیکن یہ کشش جلد ہی ماند پڑ گئی۔ زندگی میں چوہوں کو پکڑنے اور چھوڑنے کے کھیل سے بڑھ کر بھی بہت کچھ تھا۔ برٹن روتھ کی بے چین روح کی گہرائیوں کو نہ پہنچ سکا۔

انھی دنوں روتھ نے فرینکفرٹ میں طلبا کی ایک میٹنگ میں شرکت کی جس میں ایک معمر ولندیزی خاتون کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ وہ ایک کنسنٹریشن کیمپ میں قید رہ چکی تھیں لیکن محبت اور درگزر کا پرچار کر رہی تھیں۔ روتھ ان کی باتیں سن کر سحر زدہ رہ گئیں۔ کوئی شخص اتنی اذیت سے گزارے جانے کے بعد بھی عفو و درگزر کا سبق دے سکتا ہے! وہ ہمت کر کے خاتون کے پاس پہنچیں اور ان سے سوال کیا: ''مسیحی بننے کے لیے کیا کرنا پڑتا ہے؟'' ''عبادت'' انھیں مختصر جواب ملا۔ لیکن روتھ کو تو خدا کے وجود پر بھی پوری طرح یقین نہ تھا، پھر وہ اس کی عبادت کیونکر کر سکتی تھیں۔

روتھ کی پرورش ایک ملحدانہ ماحول میں ہوئی تھی جہاں ہر شخص دوسرے کو دیکھتے ہی ''ہیل ہٹلر!'' کہنے پر مجبور تھا۔ جنگ کی لائی ہوئی تباہی اور ہلاکت نے اعتقاد کی بنیادوں کو بری طرح ہلا دیا تھا۔ زندگی پر اعتبار قائم نہ رہا تھا۔ جنگ ختم ہونے کے بعد سے ایک ہی سوال روتھ کے ذہن پر مسلط رہا تھا: ''میں آخر زندہ کیوں بچ گئی؟''

اس سوال کے جواب کی جستجو میں روتھ نے کلیۂ فلسفہ و کلاسیکی ادب میں برپا کیے جانے والے دانشورانہ مباحثوں میں شرکت شروع کر دی۔ وہاں ان کی ملاقات رولینڈ سے ہوئی۔ روتھ کے برخلاف، جن کے والدین پروٹسٹنٹ عقیدے سے تعلق رکھتے تھے، رولینڈ ایک کیتھولک خاندان کا فرد تھا۔ رولینڈ کے کیتھولک اخلاقی عقائد نے اثر پذیر روتھ کے ذہن پر گہرا اثر ڈالا۔ روتھ کو اس بات نے بے حد متاثر کیا کہ رولینڈ اپنی چھوٹی چھوٹی کمزوریوں کا بڑے وقار سے اعتراف کرتا تھا اور پھر

بڑی محنت سے ان پر قابو پانے کی کوشش کرتا تھا۔ ان دونوں کی صبح کی سیر عموماً عظیم امپیریل کیتھیڈرل کے دروازے پر ختم ہوتی۔ رولینڈ عبادت کے لیے اندر چلا جاتا اور روتھ باہر کھڑی کلیسا کی تعمیراتی خوبیوں کا جائزہ لیتی رہتیں۔ ان دونوں نے طلبا کے ایک کونشن میں نمائندوں کے طور پر شرکت کرنے کے لیے ساتھ ساتھ پیرس کا سفر بھی کیا۔

لیکن زندگی اب بھی معنی سے محروم تھی۔ سارتر کا ہر شے کی بے معنویت کا نظریہ درست معلوم ہوتا تھا — کہ کسی بھی چیز کا کوئی حقیقی وجود نہیں ہے۔ رولینڈ کے ساتھ اپنے تعلق کے کسی ناخوشگوار انجام سے خود کو بچانے کے لیے روتھ پری کلینکل امتحان دینے کے بعد مینز سے ماربرگ شہر منتقل ہو گئیں۔

ماربرگ کے یونیورسٹی ٹاؤن میں روتھ نے اپنی طب کی تعلیم جاری رکھی اور ساتھ ہی ساتھ طلبا کے کیتھولک چرچ میں شمولیت بھی اختیار کر لی۔ حقیقت کی تلاش جاری رکھتے ہوئے، روتھ زندگی، محبت اور موت کے بارے میں جستجو اور بحث مباحثے کے عمل سے گزرتی رہیں۔ وہ اکثر ایک اہلِ علم جیسوئٹ پادری فادر کوچ کے پاس جایا کرتیں جنھوں نے بعد میں ان کو بتایا، ”میں نے بارہا تمھیں بتانا چاہا کہ مجھے دوسرے کام بھی ہیں، لیکن تمھاری علم کی لگن نے مجھے یہ بات کہنے سے باز رکھا۔“ وہ کتابیں پڑھا کرتیں اور رومانو گارڈینی کی کتاب ”دی لارڈ“ سے بے حد متاثر ہوئیں۔

ماربرگ میں روتھ کی ملاقات گوئنتھر سے ہوئی جو اسی یونیورسٹی میں فلسفے اور کلاسیکی ادب کا طالب علم تھا۔ انھیں ایک دوسرے کو رسمی انداز میں ”آپ“ سے ”تم“ کے بے تکلفانہ تخاطب تک پہنچنے میں کئی مہینے لگے۔ لیکن جب ان کی دوستی مستحکم ہو گئی تو وہ جلد ہی ایک دوسرے کو بہت گہرائی میں جاننے لگے۔ ان کی دوستی روتھ کی داخلی سکون کی جستجو کے متوازی چلتی تھی۔ وہ دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے دل نشیں مناظر کے درمیان گھوما کرتے، دو ساتھی مسافروں کی طرح جو ایک مشترکہ سچ کی تلاش میں ہوں۔

ایک ستاروں بھری رات کو، جب وہ دونوں ساتھ ساتھ ماربرگ کے عالیشان لینڈ گریوز کاسل کی دیوار پر بیٹھے خاموشی سے نیچے اندھیری وادی کو تک رہے تھے، گوئنتھر نے خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا، ”ہمیں یا تو خودکشی کر لینی چاہیے یا کیتھولک ہو جانا چاہیے۔“ اس نے ان دونوں کے لیے فیصلہ کر دیا تھا۔ لیکن جس وقت وہ شادی شدہ زندگی ساتھ ساتھ گزارنے کی غرض سے روتھ کی جانب

دیکھ رہا تھا، روتھ کی آنکھیں ان دنیاوی بندھنوں سے آگے دیکھنے لگی تھیں۔ کیونکہ روتھ نے کبھی کسی راستے کو آخر تک پہنچنے سے پہلے ترک نہیں کیا تھا۔ اگر انھیں کیتھولک بننا تھا تو انھیں ایک آرڈر میں شامل ہو کر ایک نن کی زندگی اختیار کرنی ہی تھی۔

لیکن یہ فیصلہ کرنا اتنا آسان نہ تھا۔ انھیں گونتھر سے بہتر رفیقِ حیات نہیں مل سکتا تھا۔ اس کی محبت بڑی نرم خو تھی اور وہ انھیں بہت گہرائی سے سمجھتا اور ان کا خیال رکھتا تھا۔ ان دونوں کی دوستی روتھ کی اندرونی کشمکش کے باوجود کئی سال جاری رہی۔ اس وقت تک روتھ بورڈ کا امتحان پاس کر کے ایک اسپتال سے انٹرن کے طور پر وابستہ ہو چکی تھیں۔ گونتھر اکثر ماربرگ کے یونیورسٹی ٹاؤن سے ٹرین میں سوار ہو کر ساور لینڈ کی فرسے لدی پہاڑیوں پر واقع دلکش مناظر والے ونٹربرگ ان سے ملنے آتا۔ وہ شاہ بلوط کے درختوں کی قطاروں والے جنگلوں میں گھومتے اور راستے میں ڈیزی کے پھول چنتے چلتے۔

ایک ویک اینڈ پر ملنے کے لیے ماربرگ آنے کی باری روتھ کی تھی۔ گونتھر انھیں لینے اسٹیشن پر آیا۔ شام انھوں نے اکٹھے گزاری۔ تب وہ لمحہ آیا جس کا وہ بڑے اشتیاق سے انتظار کرتی رہی تھیں۔ گونتھر نے ان سے شادی کی درخواست کی۔ روتھ نے، جو اس سوال کا جواب "ہاں" میں دینے کی منتظر تھیں، خود کو جواب میں معذرت کرتے ہوئے پایا، "مجھے افسوس ہے گونتھر، لیکن میں ہاں نہیں کہہ سکتی۔ میری زندگی کسی اور مقصد کے لیے وقف ہے۔"

انھوں نے اپنی اندرونی جنگ جیت لی تھی، اور اس پر گونتھر سخت صدمے کی حالت میں رہ گیا۔ لیکن کسی نہ کسی طور اسے اس پورے عرصے اس کا علم رہا تھا، جیسا کہ اس نے روتھ کو بعد میں بڑے بھاری دل کے ساتھ بتایا۔ "ہمارے انتہائی قرب کے لمحات میں بھی، مجھے اپنے اور تمھارے درمیان ایک کانچ کی دیوار محسوس ہوتی تھی۔ اگر تم نے بتایا ہوتا کہ تمھارے انکار کی وجہ کوئی اور مرد ہے تو میں اس سے اچھی طرح نمٹ لیتا۔ لیکن اب جبکہ تم نے مجھے بتایا ہے کہ تم نے مجھے خداوند کی محبت کے لیے ترک کیا ہے تو پھر کوئی اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہے۔"

وہ دونوں رات کی تاریکی میں خاموشی سے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے جنگل سے گزرتے رہے یہاں تک کہ دن نکل آیا۔ یہ جدا ہونے کا لمحہ تھا۔ اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر اسٹیم انجن کی سیٹی بجی۔ انھیں ایک دوسرے کی آنکھوں میں چھائی دھند بمشکل دکھائی دے رہی تھی۔

Scanned with CamScanner

روتھ وینزبرگ واپس جا کر اسپتال کے مصروف شب و روز میں گم ہو گئیں جہاں وہ ایمرجنسی کے آپریشن اور نازک زچگیوں کی دیکھ بھال کیا کرتی تھیں۔ ان مصروفیات کے درمیان وہ نن کے طور پر کسی کیتھولک آرڈر میں شامل ہونے کے امکانات کے بارے میں تبادلۂ خیال کے لیے وقت نکال لیتی تھیں۔ ان کے والد کو ان کا فیصلہ منظور نہ تھا۔ لیکن ان کی والدہ سادگی سے سوچتی تھیں، ''اگر اس کی داخلی طلب یہی ہے تو اسے اسی پر عمل کرنا چاہیے۔'' اس وقت تک روتھ کی سب بڑی بہنوں کی شادیاں ہو چکی تھیں اور وہ کام بھی کرنے لگی تھیں۔ سب سے بڑی بہن والٹراؤ استانی تھی، اس سے چھوٹی ریجینا ایک لائبریری میں کام کرتی تھی اور آرمگارڈ، جو روتھ سے دو سال بڑی تھی، قانون کی ڈگری حاصل کر چکی تھی۔ سب سے چھوٹی بہن باربرا، جس نے ایک لیبارٹری اسسٹنٹ کے طور پر تربیت پائی تھی، ایک اعصابی مرض میں مبتلا تھی۔ چونکہ اس کی دیکھ بھال کے لیے والدین اور دوسری بہنیں موجود تھیں، اس نے خود ہی روتھ کے فیصلے کی تائید کر دی تھی۔ اور آخر کار وہ دن آ پہنچا جب روتھ کو پیرس میں ''ڈاٹرز آف دی ہارٹ آف میری'' کی کمیونٹی میں شامل ہونا تھا۔

5

پیرس کے لوور میوزیم میں لیونارڈو ڈاونچی کی 'مونا لیزا' اپنے سامنے کھڑی روتھ پر مسکرا رہی تھی۔ روتھ نے نوتردام کیتھیڈرل کے نفیس تعمیری حسن کو بھی سراہا جہاں نپولین بوناپارٹ نے 1804 میں فرانس کے بادشاہ کے طور پر اپنی تاجپوشی کی رسم ادا کرائی تھی، اور سانت شاپیل کے گرجا گھر کی رنگین شیشوں والی دیواروں کو بھی جن کے اندر کانٹوں کا وہ تاج محفوظ تھا جو یسوع مسیح کو پہنایا گیا تھا۔

کانونٹ کے اندر روتھ کی ملاقات جاپان، ہندوستان، ایتھوپیا اور برازیل سے آئی ہوئی شاگرداؤں سے ہوئی جن سے انھوں نے دنیا کی دوسری ثقافتوں کے بارے میں جانا لیکن جاننے کا یہ عمل کچھ زیادہ سہل نہ تھا۔ اپنے ابتدائی دنوں میں سے ایک دن روتھ غسل خانے سے پورے کپڑے پہنے بغیر باہر نکل آئیں۔ ان کے اس عمل نے ہندوستان سے آئی ہوئی سسٹرز کو پریشان کر دیا۔ اس واقعے کی اطلاع سلیمین سپیریر کو پہنچائی گئی۔ اس نرم خو خاتون نے روتھ کو اپنے پاس بلا کر سمجھایا کہ ایک

Scanned with CamScanner

چیز جو کسی ایک ثقافت میں معمول کی بات سمجھی جاتی ہے، کسی دوسری ثقافت میں انتہائی ناقابلِ قبول ہو سکتی ہے۔ لیکن جرمن روتھ کی ہندوستانی سسٹرز سے جلد ہی دوستی ہو گئی جب ایک ہندوستانی شاگردہ کو پہلی بار ہسٹیریا یا ہیجان (ہسٹیریا) کا دورہ پڑا۔ اس موقعے پر جب باقی سب شاگردائیں گنگ کھڑی تھیں کیونکہ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کیا جائے، روتھ نے آگے بڑھ کر انھیں سمجھایا کہ یہ ایک نفسیاتی بیماری ہے جس کی شدت کو دوا کے ذریعے قابو میں لایا جا سکتا ہے۔ ان کی تجویز کردہ باربیچورک کی دوا سے مریض لڑکی کو واقعی فائدہ ہوا اور کانونٹ میں ہر ایک نے سکون کا سانس لیا۔

جلد ہی کانونٹ میں موجود ہندوستانی ننوں کی طرف سے درخواستوں کا تانتا بندھ گیا کہ روتھ ہندوستان آ کر لوگوں کی خدمت کریں۔ وہ خود واپس اپنے وطن مشرقی جرمنی جانا چاہتی تھیں جو اب جرمن ڈیموکریٹک ریپبلک بن چکا تھا، لیکن بیلجیئن ہیڈ سسٹر نے انھیں مشورہ دیا کہ انھیں ایک کمیونسٹ ملک میں لوٹنے کا خطرہ مول لینے کے بجائے ہندوستان جانے کے امکان پر غور کرنا چاہیے۔ روتھ نے ایشیا کے غریبوں کی حالتِ زار کے بارے میں پڑھ رکھا تھا۔ انھوں نے ہندوستانی ویزا کی درخواست دے دی۔ اس دوران انھوں نے بون کے ایک اسپتال کے زچگی اور نسوانی علاج کے یونٹ میں اپنی ایک سال کی تربیت بھی مکمل کر لی۔ اسی عرصے میں ان کے والد بیمار پڑ گئے اور انھیں ایک اسپتال میں داخل کروانا پڑا۔ روتھ چھٹی لے کر ان کی تیمارداری کے لیے چلی گئیں۔ لیکن وہ کچھ ہی عرصے میں چل بسے اور روتھ ان کی تدفین میں شرکت کے بعد پیرس لوٹ آئیں۔ مگر ہندوستانی ویزا کا دور دور تک پتا نہ تھا۔ تب کسی نے مشورہ دیا کہ انھیں کراچی (پاکستان) چلے جانا چاہیے جہاں سے ہندوستان پہنچنا نسبتاً آسان ہوگا۔

جنگ کے بعد کے ہنگامی برسوں میں خود روتھ اپنے آس پاس کی زندگی میں اتنی مگن تھیں کہ انھیں خبر تک نہ ہوئی تھی کہ 14 اگست 1947 کو اسلامی جمہوریہ پاکستان دنیا کے نقشے پر ابھر آیا ہے۔ اس کے مغربی اور مشرقی حصے کے درمیان وسیع ہندوستانی علاقہ حائل تھا۔ ملک کی یہ عجیب و غریب ساخت برصغیر کے مسلمانوں کے علیحدہ وطن کے مطالبے پر ملک کی تقسیم کا نتیجہ تھی۔ اس حساب کتاب کو انجام دینے کے بعد برطانوی مہم جو رخصت ہو گئے اور دونوں نوزائیدہ ملکوں کو ایک دوسرے سے مستقل طور پر نبرد آزما چھوڑ گئے۔

Scanned with CamScanner

جس وقت روتھ نے کراچی کے کیتھولک کانگریگیشن کی رکن اور میکسیکو کی رہنے والی فارماسسٹ برنیس وارگاس کی درخواست قبول کی، تب تک پاکستان اپنی شیرخوارگی کے پرآشوب دور سے نکل آیا تھا اور ایک نوعمر ملک بن چکا تھا۔

یہ ملک اپنے بچپن ہی میں اپنے باپ قائداعظم محمد علی جناح کی وفات کے باعث یتیم ہو چکا تھا۔ قائداعظم کی وفات ٹی بی جیسی مہلک بیماری سے ہوئی جسے ستمبر 1948 تک مخفی رکھا گیا۔ انھی کی قیادت میں آل انڈیا مسلم لیگ نے پاکستان کے قیام کی جدوجہد کی تھی۔ ان کی المناک وفات کے چار برس کے اندر اندر ملک کے پہلے وزیراعظم لیاقت علی خاں کو راولپنڈی میں ایک عام جلسے کے دوران گولی مار کر قتل کر دیا گیا۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے کئی غیر مقبول حکومتیں اقتدار میں آئیں۔ ملک کے دونوں حصوں کے درمیان معاشی، سیاسی اور سماجی اختلافات کے نتیجے میں کھنچاؤ بڑھتا گیا۔ ہندوستان کے ساتھ کشمیر کے تنازعے کے باعث دونوں ملکوں کو سماجی شعبوں سے کہیں زیادہ اپنی دفاعی صلاحیت کی تعمیر پر خرچ کرنا پڑا۔ 1950 کے عشرے کے آخر تک پاکستان ایک غیر ترقی یافتہ زرعی معیشت، انتہائی پست شرح خواندگی، اور شیرخوارگی کی عمر میں بچوں اور زچگی میں ماؤں کی موت کی اونچی شرح جیسے مسائل کا سامنا کر رہا تھا۔ اس کے بیشتر شہری دور افتادہ دیہات میں رہتے تھے جہاں صاف پانی اور نکاس جیسی بنیادی سہولتوں تک کا فقدان تھا۔ کراچی، جو ملک کا سب سے بڑا شہر تھا، اور بڑی بندرگاہ اور دارالحکومت بھی تھا، ان دسیوں لاکھ مہاجروں کو بسانے کے گمبھیر مسئلے سے دوچار تھا جو تقسیم کے وقت سرحد پار سے آئے تھے۔

جس وقت روتھ یورپ سے پاکستان کے لیے روانہ ہوئیں، مغربی جرمنی اپنے چانسلر کونراڈ ایڈیناور کی قیادت میں "اقتصادی معجزے" کے نور میں نہایا ہوا تھا۔ فرانس، صدر چارلس ڈیگال کی سربراہی میں، اپنی معاشی اور سیاسی طاقت بحال کر رہا تھا۔ پاکستان نے کانوِنٹ کی اس شاگردہ کے استقبال کی تیاری یوں کی کہ اکتوبر 1958 میں جنرل ایوب خاں نے صدر کا عہدہ سنبھال لیا۔ دراز قد اور بارعب شخصیت کے مالک ایوب خاں نے ملک کے دارالحکومت کو ساحلِ سمندر پر واقع کراچی سے مارگلہ کی پہاڑیوں کے دامن میں واقع اسلام آباد منتقل کرنے کا فیصلہ کیا اور معاشی اور سماجی اصلاحات کا پروگرام شروع کیا جس کے تحت ملک کو پہلی بار کسی قدر استحکام نصیب ہوا۔

جب روتھ نے اپنی والدہ کو بتایا کہ وہ پاکستان جا رہی ہیں تو انھیں فکر لاحق ہو گئی۔ انھوں نے خواب دیکھا کہ ان کی بیٹی ایک لفٹ میں سوار اوپر کی طرف جا رہی ہے۔ لفٹ کو دو رسیاں اوپر کھینچ رہی ہیں جن میں سے ایک مضبوط ہے اور دوسری کمزور، جو بس ٹوٹنے ہی والی ہے۔ ان کے دل میں کمزور رسی کو دیکھ کر زور کا ہول اٹھتا ہے لیکن تب ہی ان کا دھیان مضبوط رسی کی طرف جاتا ہے اور وہ خود سے کہتی ہیں، "پھر بھلا کیا ڈر ہا!"

6

نسیم بیگم 1960 کے عشرے میں پاکستان کی مقبول گلوکارہ تھیں۔ انھوں نے نامور شاعر منیر نیازی کی غزل گائی:

اس بے وفا کا شہر ہے اور ہم ہیں دوستو
اشکِ رواں کی نہر ہے اور ہم ہیں دوستو

اداکارہ مسرت نذیر اپنی خوابناک آنکھوں کو گلیسرین کے آنسوؤں سے نم کیے، جھلملاتی شمعوں کی روشنی میں نسیم بیگم کے اداس نغموں کی دھن میں کراچی کے سینما گھروں کے بلیک اینڈ وائٹ اسکرینوں پر ڈولتی پھر رہی تھیں۔

ایک اجنبی شہر کی ایک نیم تاریک جھونپڑی میں ایک نابینا "کوڑھی" کے چہرے پر جھکی روتھ فاؤ اس کی متعفن اور بگڑی ہوئی ناک میں سے گوشت کھانے والے کیڑے ایک چمٹی کی مدد سے چن رہی ہیں۔ پھر ایک اور مریض کی باری آتی ہے جس کے بدوضع ہاتھوں پر جلنے کے زخم ہیں، کیونکہ اس کے ہاتھوں کی درد یا جلن محسوس کرنے کی صلاحیت جذام کی بیماری کے باعث ختم ہو چکی ہے اور اس کے بدن کی تمام گرد اور غلاظت دھو کر اسے صاف کپڑے پہنائے جاتے ہیں۔ ایک اور بیمار وہاں لیٹا اپنے سوجے ہوئے پاؤں کے پیپ پڑے زخموں کی تکلیف سے کراہ رہا ہے جن سے اٹھتی عفونت اور ان پر بھنکتی مکھیوں نے پورے کمرے کو ناقابلِ برداشت بدبو سے بھر دیا ہے۔ روتھ یہاں نادار ترین غریبوں اور گداگروں کے درمیان ہیں جو ایک ایسے بھیانک مرض کے ہاتھوں بدہیئت اور اپاہج ہو گئے ہیں جس کا ابھی کچھ عرصہ پہلے تک کوئی معلوم علاج نہ تھا۔ یہ بیماری مریض کو ہلاک تو نہ کرتی تھی

لیکن اسے تکلف اور مصیبت بھری زندگی گزارنے پر مجبور کر دیتی تھی۔ ہاتھوں اور پیروں کے بدہیئت اور ٹوٹنے پھوٹنے ہو جانے کی وجہ سے وہ کسی باعزت روزگار کے قابل نہ رہتے تھے۔ کوئی شخص اپنے بیٹے یا بیٹی کی شادی کسی ایسے خاندان میں کرنے کا سوچ بھی نہ سکتا تھا جس کا کوئی فرد ''کوڑھی'' ہو۔ اس مرض میں مبتلا سارے لوگ یہاں سماج کے حاشیے پر رہنے پر مجبور تھے۔

یہ میکسیکو سے آئی ہوئی نوجوان فارماسسٹ برنیس تھیں جنھوں نے اس وقت کے آرچ بشپ آف کراچی موں سینیور قان سلطن برگ کی درخواست پر 16 اگست 1955 کو پہلی بار اس بستی کا دورہ کیا تھا۔ اس میں یونیسیف کے دفتر کی نمائندہ بیٹی سینیرس ان کے ہمراہ تھیں۔

میں داخلے کے راستے پر ایک سڑا ہوا کتا پڑا تھا۔ سڑاند اور تعفن سے برنیس کا سر چکرا گیا۔ وہ الٹے قدموں واپس ہوئیں اور کہنے لگیں: ''یہ میرے بس کی بات نہیں!'' دو جذامی جنھوں نے برنیس کو اندر قدم رکھتے دیکھ لیا تھا، پکار اٹھے۔ ان میں سے ایک مسلمان اور دوسرا مسیحی تھا۔ عبدالوہاب نے کہا، ''اللہ کے نام پر!'' مسیحی لزارس نے کہا، ''یسوع مسیح کے لیے!'' ان دونوں کے بدہیئت اور متعفن جسموں پر رینگتے کیڑوں کو دیکھ کر برنیس کو متلی ہونے لگی۔ وہ وہاں رک نہ سکیں اور لوٹ گئیں۔ کانونٹ واپس پہنچ کر بھی ان کی طبیعت خراب رہی اور ہفتے بھر تک انھیں بھوک نہ لگی۔

میکلوڈ روڈ کے پیچھے کی بستی میں رہنے والے گداگروں نے کسی نہ کسی طرح گرو مندر کے پاس واقع سسٹر کی رہائش گاہ کا پتا لگا لیا۔ اب برنیس کے پاس ان کی درخواست قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کیونکہ ان میں سے ایک کے بارے میں بتایا گیا کہ وہ مرنے کے قریب ہے۔ جب وہ دوبارہ وہاں پہنچیں تو لزارس کو بستر مرگ پر پڑا پایا۔ آخری وقت کی دعا کے لیے پادری کو طلب کرنا پڑا۔ جب سینٹ پیٹرک کیتھیڈرل کے فادر پنٹو نے لزارس سے اس کی آخری خواہش دریافت کی تو وہ صرف اتنا کہہ سکا، ''میری خواہش ہے کہ سسٹر یہاں رہنے والے ہم جذامیوں کے لیے کچھ کریں۔'' انھوں نے برنیس سے کہا: ''سسٹر، آپ اپنے ماں باپ کو چھوڑ کر یہاں آئی ہیں، کیا آپ ہمارے لیے کچھ نہیں کر سکتیں؟'' برنیس کو کہنا ہی پڑا، ''ہاں!''

بعد میں برنیس نے میکسیکو کے شہر گواڈالاہارا میں مقیم اپنے والدین کو خط میں لکھا: ''میں آپ کو اور تو سب کچھ بتا سکتی ہوں، لیکن اس بدبو کو بیان نہیں کر سکتی۔'' ان کے والدین اس مقصد کے لیے مدد

Scanned with CamScanner

بھیجنے والوں میں پہلے تھے۔ انھوں نے دوائیں اور پٹیاں بھیجیں۔ برنس نے کالونی میں پیغام بھجوایا کہ وہ وہاں آنے کو تیار ہیں اگر وہاں سے مرے ہوئے چوہوں کو صاف کر دیا جائے اور گٹر کا جو گندا پانی وہاں جمع ہے، اس کے نکاس کا بندوبست کیا جائے۔ ایک ہفتے بعد جب وہ وہاں واپس پہنچیں تو کوئی مردہ چوہا دکھائی نہ دیا، اور زمین اگرچہ اب بھی گیلی تھی لیکن وہ اس پر چل سکتی تھیں۔

دوستوں سے اور خود گداگروں سے تین سو روپے کی رقم اکٹھی کی گئی۔ یونیسیف کے دفتر سے خالی کارٹن مانگے گئے۔ اس کے بعد "جذامیوں" نے خود ڈسپنسری تعمیر کرنے میں مدد دی۔ لکڑی کے کھوکھوں کی چھت بنائی گئی اور کارڈ بورڈ کی دیواریں۔ ریڈ کراس نے دوائیں مہیا کیں۔ کچھ سفارت خانوں سے رابطہ قائم کر کے بستر کی فالتو چادریں جمع کی گئیں اور انھیں پھاڑ کر زخموں کے لیے پٹیاں بنائی گئیں۔ بعد میں کیتھولک ریلیف سروسز نے مدد کے لیے آگے بڑھ کر دودھ کا پاؤڈر اور پکانے کا تیل فراہم کیا۔ برنس، مدر سیمیون فیبر اور سسٹر فرانسس براؤن کو ساتھ لے کر کراچی کے پرانے بازار کی ایک دکان پر پہنچیں تاکہ پرانے کپڑے اور کمبل خرید سکیں۔ دو مریضوں کے پاس ایک گدھا گاڑی تھی جس میں رکھ کر یہ سامان اس اسٹور روم تک پہنچایا گیا جو ماما پارسی اسکول کی طرف سے مہیا کیا گیا تھا۔

ایک دن چھوڑ کر برنس وارگاس، مدر فیبر اور سسٹر براؤن پیدل یا کراچی کی کھٹارا بسوں میں سے ایک پر سوار ہو کر جذام کے ان مریضوں کے پاس پہنچتیں جو کارڈ بورڈ کی بنی ڈسپنسری کے باہر بے تابی سے ان کا انتظار کر رہے ہوتے جس کا نام ان کے کیتھولک آرڈر کی فرانسیسی بانی میری ایڈیلیڈ کے نام پر رکھا گیا تھا۔

برنس نے اردو کے جو پہلے دو الفاظ سیکھے وہ "صبح" اور "شام" تھے کیونکہ مریضوں کی دی جانے والی بیشتر دوائیں انھی دو اوقات میں دی جانی ہوتی تھیں۔ بہت جلد مریضوں نے برنس کو پیار سے "سسٹر صبح شام" کا لقب دے دیا۔ برما کے رہنے والے جذام کے مریض رنگونی نے دوسرے ساتھی مریضوں کی انگریزی میں ترجمانی کا کام سنبھال لیا۔

1958 میں جلدی امراض کی ایک پاکستانی نوجوان اور پرکشش ماہر ڈاکٹر برنس کے پاس آئیں۔ ڈاکٹر زرینہ فضل بھائی، جن کا بچہ کانگریگیشن کے زیر اہتمام چلنے والے کنڈرگارٹن میں پڑھتا

تھا اور شوہر ایک مالدار تاجر تھے، ہمیشہ جھلملاتی ریشمی ساڑھی میں ملبوس ہوتی تھیں۔ انھیں جلدی امراض کی ایک کانگریس میں، جو کراچی کے ایک ممتاز ہوٹل میٹروپول میں منعقد ہونے والی تھی، پیش کرنے کے لیے جذام سے متعلق معلومات کی ضرورت تھی۔ برنیس اور زرینہ میں فوراً دوستی ہو گئی۔ لیکن زرینہ کو جذامیوں کی بستی میں جانے کے لیے اپنی ہچکچاہٹ پر قابو پانا ضروری تھا۔

اس دوران مدر فیبر اور سسٹر براؤن جا چکی تھیں اور ان کی جگہ مدر میری ڈائل اور ہیلن لیوٹ نے لے لی تھی۔ جب روتھ فاؤ کراچی ایئرپورٹ سے گرومندر والے ہاسٹل میں پہنچیں، اور راستے میں لگی بوگن ویلیا کی باڑھ پر لگے پھولوں پر گلابوں کا گمان کیا، تب ان کی ملاقات مدر ڈائل، ہیلن اور برنیس سے ہوئی۔

ایک بار پھر یہ برنیس ہی تھیں جنھوں نے ایک سہ پہر روتھ کو اپنے ساتھ جذامیوں کی بستی میں چلنے کی دعوت دی۔ وہ دونوں، بید کی ٹوکریوں میں دوائیں اور پٹیاں اٹھائے، ایک پرہجوم بس میں سوار ہو کر وہاں پہنچیں۔ داخلے کے راستے پر گٹر کے پانی کو کھڑا دیکھ کر روتھ کو پہلے تو ہچکچاہٹ ہوئی لیکن پھر انھوں نے برنیس کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اس مصیبت زدہ بستی میں قدم رکھنے کا فیصلہ کیا۔

7

نہیں! میکلوڈ روڈ (حالیہ آئی آئی چندریگر روڈ) کے عقب میں واقع بستی کے نظارے کے لیے روتھ کو اپنی اس وقت تک کی زندگی نے ہرگز تیار نہیں کیا تھا۔

جس وقت روتھ جرمنی میں بڑی ہو رہی تھیں، یورپ میں جذام ایک بھولا بسرا مرض بن چکا تھا۔ اپنی طبی تربیت کے پورے عرصے میں انھوں نے کبھی کوئی جذام کا مریض نہیں دیکھا تھا۔ وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھیں کہ بیکٹیریا کا پیدا کردہ کوئی انفیکشن، اگر اس کا بروقت علاج نہ کیا جائے، ہلکے سفید یا سرخی مائل بظاہر بے ضرر چکتوں سے شروع ہو کر، جسم کی ایسی بدہیئتی تک پہنچ سکتا ہے۔

انھوں نے جرمنی میں تارکینِ وطن کے چہروں پر چھائی ہوئی پریشانی کا مشاہدہ کیا تھا، دوسری جنگ عظیم میں زخمی سپاہیوں کے جسموں سے بہتا خون اور مسخ شدہ لاشیں دیکھی تھیں۔ لیکن پاکستان کے دارالحکومت اور سب سے بڑے شہر کراچی کے بڑے کاروباری مرکز کے عقب میں جذامیوں کی

بستی میں انھیں جو کچھ دکھائی دیا وہ ناقابلِ یقین تھا۔ نابینا مرد اور عورتیں، مسخ شدہ ناکیں، مڑے ہوئے چہرے، گلے ہوئے ہاتھ اور پاؤں، پیپ بھرے متعفن زخم، اور گرد بھنبھناتی مکھیاں اور سڑتے ہوئے گوشت کو کترتے چوہے۔

کانونٹ کی تیس سالہ شاگردہ، جس نے ناداری، پاکیزگی اور اطاعت کی قسم کھائی تھی، جس نے اپنی زندگی انسانی مصائب کے خلاف جدوجہد کے لیے وقف کرنے کا عہد کیا تھا، اپنی زندگی کے مقصد تک آ پہنچی تھی۔ اس سے بڑی انسانی ابتلا دنیا میں اور کہیں نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ وہ تقدیر ساز لمحہ تھا جب انھوں نے پاکستان میں بس جانے کا فیصلہ کیا۔

زندگی کا یہی وہ مقصد تھا جس نے انھیں یہ کہنے پر مجبور کیا تھا: "مجھے افسوس ہے کوئنٹر، لیکن میں ہاں نہیں کہہ سکتی۔ میری زندگی کسی اور مقصد کے لیے وقف ہے۔"

برنیس نے ڈسپنسری قائم کرنے کے لیے سخت محنت کی تھی۔ انھوں نے جذام کے تقریباً ڈیڑھ سو مریضوں کے متواتر رستے ہوئے زخموں اور گھاؤوں کا علاج کرنے اور ان کے خاندانوں کی دیکھ بھال کرنے کی اپنی سی تمام تر کوشش کی تھی، لیکن وہ ڈاکٹر نہیں تھیں۔ ڈاکٹر آتارو چاؤ اور ڈاؤ میڈیکل کالج کے تین طالب علم وقتاً فوقتاً ان کی مدد کر دیا کرتے تھے، لیکن یہ رضاکار صرف جز وقتی کام کے لیے دستیاب تھے۔ آخرکار انھوں نے پیرس میں اپنے کانگریگیشن سے ایک خاتون ڈاکٹر یہاں بھیجنے کی استدعا کی تھی۔

روتھ نے جذام کے موضوع پر لکھی جانے والی مستند کتابیں پڑھیں جن میں رابرٹ کوچرین کی کتاب شامل تھی۔ پھر انھوں نے امریکی معالجِ جذام اور تامل ناڈو، ہندوستان، کے شہر ویلور میں قائم کرسچین میڈیکل کالج کے پرنسپل ڈاکٹر پال برانڈ کو خط لکھا؛ دنیا بھر میں ہندوستان ایک ملک تھا جہاں جذام سے متاثر ہونے والے سب سے زیادہ افراد رہتے تھے۔ ڈاکٹر برانڈ نے انھیں ویلور آ کر تربیتی کورس کرنے کی دعوت دی۔

1961 میں روتھ ہوائی جہاز کے ذریعے کراچی سے مدراس اور وہاں سے بس میں سوار ہو کر ویلور پہنچیں جو دریائے پالار کے کنارے واقع ایک خوشحال تجارتی قصبہ ہے اور کرسچین میڈیکل کالج اور اسپتال کے لیے معروف ہے جسے 1900 میں امریکی مشنری ایڈا اسکڈر نے قائم کیا تھا اور جو

ہندوستان کے وسیع ترین اسپتالوں میں سے ایک ہے۔

ہر صبح روتھ گہرے سبز رنگ سے ڈھکے گنے کے کھیتوں کو پار کر کے سپتال میں قائم جذام کی تحقیق اور جذامیوں کی بحالی کے شہرت یافتہ مرکز پہنچتیں۔ راستے میں انھیں ہر طرف اچھلتے کودتے بندر اور ناریل کے ایک پیڑ سے اڑ کر دوسرے پیڑ پر جاتے طوطے دکھائی دیتے۔ اسپتال کے اس مرکز میں انھوں نے جذام کی تشخیص اور علاج کے بارے میں نئی معلومات اور مہارت حاصل کی۔ جنوبی ہند میں اپنے قیام کا انھوں نے بے حد لطف اٹھایا۔ وہ کیلے کے پتوں پر پروسے ہوئے چاول اور ترکاری کھاتیں، کھلے دیہاتی علاقے میں سائیکل چلاتیں اور گرمجوش ہندوستانی عورتوں سے دوستیاں کرتیں۔ چھ ہفتے کی سخت تربیت مکمل کر کے وہ رنگین مندروں اور رقص کرتی دیویوں کے اس دیس سے نکل کر واپس توحید کے مرکز پاکستان چلی آئیں۔

وہ میکلوڈ روڈ کی بستی میں ایک نئے ولولے کے ساتھ لوٹیں اور اپنے کام کی نئے سرے سے تنظیم کی۔ باقاعدہ رجسٹریشن، مریض کی ترتیب وار تفصیلات کے اندراج اور طبی ٹیسٹ کرنے کا نظام قائم کیا گیا اور سادہ لیبارٹری ٹیسٹ شروع کیے گئے۔ جذام کے ایک زیر علاج مریض عبدالرحمٰن کو، جس کے ہاتھ مرض کے ہاتھوں مسخ ہو چکے تھے، خوردبین کے استعمال کی تربیت دی گئی۔ وہ تدریس کے پیشے سے وابستہ رہ چکے تھے اور بستی کے واحد فرد تھے جس نے گداگری کا پیشہ اختیار کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ٹی بی سینٹر کے اسپیشلسٹ ڈاکٹر یدو نے مہربانی کر کے عبدالرحمٰن کو لیبارٹری ٹیکنیشین کے کورس میں داخلہ دے دیا، حالانکہ کورس میں شامل دوسرے طالب علموں نے ایک جذامی کو داخلہ دیے جانے کی صورت میں کورس کا بائیکاٹ کرنے کی دھمکی دی تھی۔ عبدالرحمٰن نے چھ ماہ کا کورس بڑی کامیابی سے مکمل کیا اور ڈسپنسری میں واپس آ کر اپنا کام سنبھال لیا۔ خوردبین ان کی گود میں رکھی ہوتی کیونکہ اسے رکھنے کے لیے علیحدہ میز کی وہاں جگہ نہ تھی۔

اُن دنوں ڈاکٹر جذام کے کسی مریض کو اپنے کلینک یا اسپتال میں داخل ہونے دینے کے روادار نہ ہوتے تھے۔ جب مظہر حسین کے پیر میں گنگرین ہو گیا تو جناح اسپتال کے ہڈیوں کے سرجن نے اس کا آپریشن کرنے کی ہامی بھر لی، لیکن یہ آپریشن اسپتال کے مردہ خانے ہی میں کیا جا سکا۔ آپریشن کے بعد جب مظہر حسین کو ٹیٹنس کی تکلیف ہو گئی تو روتھ کے آنسو نکل آئے۔ وہ ایک کے

بعد دوسرے اسپتال میں مدد حاصل کرنے کے لیے دوڑتی پھریں اور آخرکار سول اسپتال کے یونٹ میں پہنچیں۔ اسسٹنٹ ڈاکٹر نے مظہر کو اسپتال کے پچھواڑے کے برآمدے میں داخل کیا۔ مریض کی حالت بہتر ہوگئی لیکن اسسٹنٹ ڈاکٹر کو اسپتال کے سپرنٹنڈنٹ کی طرف سے جواب طلبی کا سامنا کرنا پڑا۔ اپنے جواب میں ڈاکٹر جعفر علی ہاشمی نے لکھا: "سر، اگر میں اس مریض کو داخل کرنے سے انکار کر دیتا جسے ایک غیر ملکی خاتون خود اپنے ساتھ لے کر آئی تھیں جنھیں ہمارے ملک کے اس قانون کا علم تھا کہ اسپتال میں داخل ہونا ہر مریض کا حق ہے، تو کیا یہ بات آپ کو پسند آتی؟" اس جواب نے ڈاکٹر ہاشمی کو برطرفی سے بچا لیا لیکن ان کا تبادلہ فوری طور پر میونسپلٹی کے جذامی علاج کے مرکز میں کر دیا گیا جو بہت دور منگھوپیر میں واقع تھا۔

اس سے پہلے کئی ڈاکٹر اس مرکز میں تعینات ہونے سے انکار کر چکے تھے لیکن ڈاکٹر ہاشمی نے اپنے تبادلے کو خندہ پیشانی سے قبول کیا اور ڈاکٹر روتھ سے مدد کی درخواست کی تاکہ اس خستہ حال مرکز کو نئے سرے سے بحال کیا جا سکے۔ میکلوڈ روڈ کی بستی اور منگھوپیر کے مرکز کے درمیان ہفتے میں دو بار کے دوروں کا انتظام کیا گیا اور اس طرح یہ ادارہ دوبارہ کارآمد بنا لیا گیا۔ ڈاکٹر ہاشمی نے خود کو ایک قابل منتظم ثابت کیا۔

آنکھوں کے امراض کے اسپیشل اسپتال کے اسپیشلسٹ ڈاکٹر ایم ایچ رضوی بھی ان معدودے چند ڈاکٹروں میں سے ایک تھے جو کسی جذامی کو اپنے اسپتال میں داخلہ دینے سے انکار نہیں کرتے تھے۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ جاتے کہ روتھ مریضوں کو ساتھ لے کر بس کے ذریعے پہلے لی مارکیٹ اور پھر پیدل ان کے اسپتال پہنچتیں، صرف اس غرض سے کہ کسی طرح ان مریضوں کی بینائی بچائی جا سکے۔

اپنے مقصد سے یہی لگن تھی جس سے متاثر ہو کر ڈاکٹر زرینہ نے 1962 میں میکلوڈ روڈ کی بستی میں قدم رکھا۔ جب قیمتی لباس میں ملبوس ماہر امراض جلد خستہ حال ڈسپنسری میں داخل ہوئیں تو روتھ نے انھیں ایک مالدار گھرانے کی بیگم سمجھا جو شاید بریانی کی چند دیگیں بطور خیرات لے کر آئی ہوں گی اور انھیں وہیں چھوڑ کر فوراً باہر نکل جائیں گی۔ لیکن زرینہ نے اپنی استقامت کو ثابت کیا۔ ان کی پرائیویٹ پریکٹس بہت عمدہ چل رہی تھی اور پہلے پہل انھوں نے مائکرو اسکوپی کی خدمات فراہم

Scanned with CamScanner

کرنے کی پیشکش کی، لیکن بہت جلد نوجوان غیر ملکیوں کی مدد سے ان کے زیر اہتمام چلنے والی اس ڈسپنسری کا ہر کام سنبھال لیا۔ یہ سب عورتیں تھیں، الگ الگ سرزمینوں سے آئی تھیں، مختلف زبانیں بولتی تھیں، لیکن ناداروں کی مدد کرنے کا جذبہ آپس میں مشترک رکھتی تھیں۔

انھی دنوں انگلستان کی ملکہ الزبتھ دوم نے پاکستان کا دورہ کیا۔ ان کے ساتھ بڑی تعداد میں مغربی صحافی بھی آئے۔ کراچی کی بڑی تجارتی شاہراہ سے گزرتے ہوئے چند صحافی جذامیوں کی بستی میں بھی آ نکلے۔ چند ہفتے بعد ایک جرمن ٹیبلوائڈ اخبار "بلڈ" میں ایک مضمون شائع ہوا جس کا عنوان تھا: "... اور رات میں چوہوں کا حملہ!" اس سنسنی خیز سرخی نے وورزبرگ میں رہنے والے ہرمن کوبیر کی توجہ اپنی جانب کھینچی۔ اتفاق سے کوبیر جرمن لیپرسی ایسوسی ایشن کے صدر تھے۔ انھوں نے فوراً کراچی میں رتھ فاؤ کی رہائش گاہ کا پتا دریافت کیا اور انھیں خط لکھا: "یہ کس طرح ہوا کہ ایک جرمن ڈاکٹر جذام کے خلاف کام کر رہی ہے اور جرمن لیپرسی ایسوسی ایشن کو اس کی خبر تک نہیں۔" جواب میں رتھ نے لکھا: "یہ کس طرح ہوا کہ جذام کے خلاف کام کرنے والی ایک جرمن ڈاکٹر کو خبر تک نہیں کہ کوئی جرمن لیپرسی ایسوسی ایشن بھی وجود رکھتی ہے۔" جرمنی سے آنے والے شائستہ پیغام میں دریافت کیا گیا: "ہم آپ کے لیے کیا کر سکتے ہیں؟" میکلوڈ روڈ کی جانب سے اپنی کارڈ بورڈ کی بنی ڈسپنسری کی تصویر بھیجی گئی جس میں کسی قسم کے آلات تھے نہ تربیت یافتہ عملہ۔ وورزبرگ میں ایسوسی ایشن کے دفتر نے فوراً ڈسپنسری کے لیے سامان روانہ کیا اور ساتھ میں ایک تربیت یافتہ نرس مسز ایلی کو بھی بھیجی۔

انھی دنوں ترقی پذیر ملکوں میں ترقیاتی منصوبوں پر کام کرنے والے جرمن بشپس کی تنظیم "میسریور" کے ایک وفد نے کراچی کا دورہ کیا۔ ان کے نمائندے نے رتھ سے دریافت کیا: "آپ ڈسپنسری کی عمارت کیوں نہیں بنوا لیتیں؟" "میرے پاس اس کے لیے رقم کہاں ہے؟" سوال کے جواب میں سوال کیا گیا۔ نمائندے نے عندیہ دیا کہ جرمنی کے لوگ اس سلسلے میں ہاتھ بٹا سکتے ہیں۔ اس بات نے ایک امکان کا دروازہ کھول دیا۔ شہر کے مرکزی علاقے صدر میں ایک دو منزلہ نرسنگ ہوم اس کے مالک ڈاکٹر پنٹو سے خرید لیا گیا جو انگلستان منتقل ہو رہے تھے۔ اس کی قیمت میسریور نے ادا کی۔

نرسنگ ہوم کے سامنے واقع کلینک کی مخالفت کے پیش نظر "میری ایڈیلیڈ ڈسپنسری" کو نئی

عمارت میں 9 اپریل 1963 کی رات کے اندھیرے میں منتقل کیا گیا۔ پڑوسیوں کو اس کا علم صبح کے وقت ہوا اور انھوں نے انڈوں، ٹماٹروں، پتھروں اور گالیوں سے خیر مقدم کیا؛ یہ سب چیزیں ڈسپنسری کی بغیر شیشوں کی کھڑکیوں سے گزر کر اندر پہنچیں۔ جب روتھ کے کانوں میں "گدھے کے بچے" کے الفاظ پڑے تو یہ انھیں خاصے دلکش محسوس ہوئے۔ انھیں سمجھانے کی ضرورت پیش آئی کہ ان الفاظ کا مطلب کیا ہے۔

اس کے بعد عدالت میں ایک مقدمہ شروع ہوا جو روتھ اور زرینہ نے مل کر لڑا اور آخر کار جیت لیا۔ اس میں جذام کے علاج کے بین الاقوامی ماہروں مثلاً ڈاکٹر پال برانڈ، ڈاکٹر اسٹینلے براؤن اور عالمی ادارۂ صحت کے جذام کے مشیر ڈاکٹر اے سیکلوی کے خطوط نے اہم کردار ادا کیا۔

ڈاکٹر سیکلوی ہی نے روتھ کو مشورہ دیا کہ وہ جذام کے انسداد کے مقامی منصوبے میونسپل لیپرسی کنٹرول پروگرام کو دوبارہ فعال کرنے کی کوشش کریں جو بہت دنوں سے عملاً بے مصرف ہو چکا تھا۔ جب روتھ اس پروگرام کے انچارج سے ملنے پہنچیں تو نمایاں توند والے پان چباتے شخص نے انھیں مسکراتے ہوئے اپنے کلینک دکھانے کی پیشکش کی۔ جب وہ گاڑی میں سوار ہو کر غیر فعال کلینکوں کے تالے پڑے دروازوں تک پہنچتے تو کوئی چوکیدار یا چپراسی انچارج سے پوچھ بیٹھتا کہ اس کے ساتھ یہ خاتون کون ہے۔ یہ فرض کرتے ہوئے کہ انھیں اردو نہیں آتی ہوگی، انچارج اپنے پان کی پیک سے بھرے منھ سے بڑے فخر سے کہتا، "یہ ہماری گڑیا ہیں!" تاہم گڑیا کو اب تک اتنی اردو آ چکی تھی کہ یہ بات اس کی سمجھ میں آ گئی لیکن وہ منھ بند کیے بیٹھی رہی۔

ایک بار پھر یہ ڈاکٹر سیکلوی ہی تھے جنھوں نے سوات کے ایک دورے کے بعد روتھ سے سلطان محمد کا ذکر کیا اور مشورہ دیا کہ وہ سلطان محمد کو کراچی بلوا کر جذام کے ٹیکنیشین کے طور پر تربیت دیں۔ سلطان محمد ایک نوجوان پیرامیڈیکل ورکر تھے اور سوات کے ایک گاؤں پیر بابا کی ڈسپنسری میں کام کرتے تھے۔ پیر بابا کی درگاہ پاکستان کے پورے شمالی حصے میں جذام کے مریضوں کی پناہ گاہ تصور کی جاتی تھی۔ ان مریضوں میں سے بہت سے ایک ایک کر کے کراچی آ جاتے اور گداگری کرنے لگتے۔ ریاست سوات کے ایک دل والی نے درگاہ کے پاس ان بدنصیب جذامیوں کے لیے ایک ڈسپنسری اور اس کے اردگرد رہنے کے لیے چند مکان بنوا دیے تھے۔ ڈاکٹر سیکلوی نے والیِ سوات

Scanned with CamScanner

عبدالحق اور تنزیب سے سلطان محمد کی کراچی میں تربیت کی اجازت پہلے ہی لے لی تھی۔

8

سلطان محمد 1965 میں جذام کے ٹیکنیشنوں کے پہلے دستے میں شامل ہوکر چھ ماہ کا تربیتی کورس کرنے کے غرض سے کراچی پہنچے۔ روتھ نے زرینہ کی مدد سے کورس کا نصاب تیار کیا اور دونوں نے مل کر امیدواروں کے ایک مختصر گروپ کو اناٹومی، فزیالوجی اور جذام کے مرض کے بارے میں بنیادی تعلیم دینا شروع کیا۔ ان امیدواروں میں میری ایڈیلیڈ لیپرسی سینٹر اسپتال اور میونسپلٹی کے کارکنوں کے علاوہ بلاشبہ سلطان محمد بھی شامل تھے۔

کورس کے مکمل ہوتے ہوتے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان پہلی بڑی جنگ چھڑ گئی۔ جرمن سفارت خانے نے روتھ کو پاکستان سے چلے جانے کا مشورہ دیا۔ لیکن انھوں نے انکار کر دیا۔ ہوائی حملے کے سائرن، بلیک آؤٹ اور کراچی میں ہونے والے دھماکوں کی آوازیں انھیں اپنے بچپن میں دوسری عالمی جنگ کے تجربات کی یاد دلا رہی تھیں۔ اسپتال کی کھڑکیوں کے شیشوں کو فوراً پردوں سے ڈھک دیا گیا، اور ایمرجنسی کی صورت حال میں بچاؤ کے لیے ریت کی بوریاں حاصل کی گئیں۔ جیسے ہی سائرن کی آواز گونجتی، تمام مریضوں کو زمینی منزل پر واقع محفوظ راستے پر پہنچایا جاتا۔ جب تک ہوائی حملے کا خطرہ برقرار رہتا، روتھ مریضوں کے ساتھ رہتیں۔

سترہ دن کی جنگ کا اختتام جنگ بندی پر ہوا۔ جو منصوبے ملتوی کر دیے گئے تھے اب ان پر عمل شروع ہوا۔ اب شمال مغربی سرحدی صوبے کا دورہ کرنے کا وقت آ گیا تھا تاکہ اس کام کی رہنمائی کی جا سکے جو تربیت یافتہ لیپرسی ٹیکنیشین نے وہاں شروع کیا تھا۔

مدر میری ڈائکل نے، جو اب اسپتال کے تمام انتظامی معاملات سنبھال چکی تھیں، اس سفر میں روتھ کے ہمراہ چلنے کی پیشکش کی۔ ننھے گلابی پھولوں والی سرمئی رنگ کی شلوار قمیص پہنے اور اسی رنگ کے دوپٹے سے اپنے سر اور کندھوں کو ڈھانپے روتھ مدر ڈائکل کے ساتھ پشاور جانے والے ایک ہوائی جہاز پر سوار ہوگئیں۔ سلطان محمد، جسے ان کی آمد کی اطلاع پہلے سے دے دی گئی تھی، پشاور ایرپورٹ پر کہیں دکھائی نہ دیا۔ بہت دیر انتظار کرنے کے بعد مدر ڈائکل نے ایک تانگے والے سے کہا کہ وہ

Scanned with CamScanner

انھیں مین بازار پہنچا دے جہاں سے وہ پیر بابا جانے کے لیے ٹیکسی حاصل کر سکیں۔ دونوں خواتین تانگے کی پچھلی سیٹ پر سڑک کی طرف رخ کر کے بیٹھ گئیں۔ روتھ شلوار قمیص میں اور مدر ڈائل گھٹنوں تک لمبے اسکرٹ میں ملبوس۔ لیکن سیٹ پر بیٹھنے سے اسکرٹ سمٹ کر ان کے گھٹنوں سے اوپر سرک آیا۔ ہوتے ہوتے تانگے کے پیچھے سائیکل سوار نوجوان پٹھان لڑکوں کا ایک جلوس چلنے لگا جو ہوا میں پھڑ پھڑاتی ڈھیلی شلوار قمیص پہنے تھے اور مدر ڈائل کی سڈول پنڈلیوں کا نظارہ کرتے ہوئے خوشی سے نعرے لگا رہے تھے۔ شرمندگی سے روتھ کا رنگ پیلا پڑ گیا، لیکن ساٹھ برس کی آئرش امریکی مدر ڈائل، دراز قد اور اپنے خوش وضع اسکرٹ میں بھرپور بھری بھرکم دکھائی دیتی ہوئی، اس سرحدی شہر کی درختوں سے سجی سڑکوں پر خود کو ملنے والی اس تمام توجہ کا لطف اٹھاتی رہیں۔

بازار میں پہنچ کر وہ ٹیکسی کی تلاش میں کھڑی ہو گئیں اور انھوں نے خود کو وہاں موجود مردوں میں تنہا اور سب کی بے پناہ توجہ کا مرکز پایا۔ ان کے اردگرد گزرتے ہوئے مردوں کے چہروں پر خشونت تھی اور کندھوں پر بندوقیں لٹک رہی تھیں۔ اچانک روتھ کی نظر سلطان محمد پر پڑی جو ان کی طرف چلا آ رہا تھا۔ آنکھیں چار ہوتے ہی سلطان محمد نے خدا کا شکر ادا کیا اور روتھ نے خداوند کا۔ جلد ہی وہ تینوں ایک بس میں سوار سوات کی طرف رواں دواں تھے۔

بس پشاور کی وادی کے سرسبز کھیتوں سے نکل کر ایک سنگلاخ راستے پر ہوتی ہوئی بلند و بالا پہاڑوں کی طرف چلی۔ ناہموار راستے کے ایک طرف اونچے پہاڑ تھے اور دوسری طرف گہری کھائیاں۔ جب گنجائش سے زیادہ بھری ہوئی بس تنگ راستے پر چلتے ہوئے دائیں اور بائیں لہراتی تو مدر ڈائل اپنی تسبیح نکال لیتیں۔ روتھ اس قدر خوفزدہ ہو چکی تھیں کہ جب سلطان محمد نے انھیں بتایا کہ اس کا آبائی شہر آ پہنچا ہے تو انھیں یقین نہ آیا۔

درگاہ کے رہائشی حصے میں دونوں غیر ملکی خواتین کے رہنے کا بندوبست کیا گیا۔ مسئلہ صرف یہ تھا کہ وہاں نہ کوئی بیت الخلا تھا اور نہ ان کے غسل کے لیے کوئی جگہ۔ صرف چشمے کے اوپر کی کھلی جگہ اس کام کے لیے موجود تھی۔ روتھ کو اس خوبصورت ماحول کو گندا کرنے پر ندامت محسوس ہوئی۔

اگلی صبح اٹھ کر انھوں نے پہاڑوں کی عالیشان چوٹیوں، ان کی ڈھلانوں پر اگے دیودار، صنوبر اور فر کے درختوں اور نیچے چراگاہوں میں چرتی بھیڑوں کا وسیع نظارہ دیکھا۔ روتھ اس حسین نظارے

Scanned with CamScanner

سے متاثر ہو کر دعا اور مراقبے میں ڈوب گئیں۔

گرم خوشبودار قہوے کی پیالی اور خستہ نان کے ناشتے کے بعد ان کے کام کا آغاز ہوا۔ گاؤں کا سروے کیا گیا، مردوں، عورتوں اور بچوں کا معائنہ کیا گیا، دوائیں دی گئیں اور زخموں کی مرہم پٹی کی گئی۔ جب ایک طویل اور تھکا دینے والے دن کے بعد آرام کرنے کا وقت آیا تو چوکیدار شمشیر نے اپنی چارپائی کھینچ کر عورتوں کے رہائشی حصے کے دروازے کے پاس کر لی تا کہ دونوں غیر ملکی خواتین مہمانوں کی حفاظت کر سکے۔ پاکستانیوں کی نرم خو مہمان نوازی نے دونوں کو بہت متاثر کیا۔ دن کے وقت انھوں نے محسوس کیا تھا کہ سڑک کے دوسری طرف سے آتے ہوئے مرد کس طرح دور سے انھیں دیکھتے ہی نظریں پھیر لیتے تھے۔ بظاہر کرخت دکھائی دینے والے اور کندھوں پر بندوقیں لٹکائے پٹھانوں کی خوش اخلاقی ان اچھلتے ہوئے چشموں کی طرح تھی جو اس شاندار سرزمین سے گزرتے تھے۔

چند ہفتے وہاں گزار کر رتھ کراچی لوٹ آئیں، اس بات پر خوش کہ چھ مہینے کے تربیتی کورس سے مقامی لڑکوں کو اس قابل کر دیا تھا کہ وہ فیلڈ میں اپنا کام اچھی طرح سنبھال سکیں۔ اس حقیقت نے کہ وہ اس پہاڑی علاقے میں آزادی سے ہو آئی تھیں جہاں اپنے باپ یا شوہر کے گھر سے نکل کر جاتے ہوئے عورتیں ہچکچاتی تھیں، رتھ کو ایک تسکین کا احساس بخشا تھا۔ مردوں سے بھرے ہوئے حجرے سے لے کر ڈپٹی کمشنر کے دفتر تک وہ جہاں بھی گئیں، لوگ ان کے ساتھ احترام سے پیش آئے۔ انھیں اس سرزمین سے محبت ہو گئی جہاں انھیں اس قدر اپنائیت محسوس ہوئی تھی۔ ان کے اردگرد کی فضا مہم جوئی سے لبریز تھی۔

کراچی لوٹ کر ان کی ملاقات سوات کے رہنے والے ایک دیہاتی سے ہوئی۔ وہ گاؤں کے جرگے میں بزرگوں کے فیصلے کی بھنک پا کر کراچی بھاگ آیا تھا۔ لوگوں نے اس کی جلد پر پڑے خوفناک چکتے دیکھ لیے تھے۔ آس پاس کے دیہات میں "کوڑھی" کا مقدر ہمیشہ سے صرف موت ہوتا تھا۔

چند مہینوں کے کامیاب علاج اور اچھی طرح تسلی دینے کے بعد اسے اس کے گاؤں واپس بھیج دیا گیا۔ کئی سال بعد جب رتھ نے اس کے گاؤں کا دورہ کیا تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئیں کہ وہ اپنے گاؤں کا سردار بن چکا ہے، مسرور شادی شدہ زندگی گزار رہا ہے اور صحت مند بچوں کا باپ ہے۔ خدا کے کام بھی عجیب ہوتے ہیں، رتھ نے مسکراتے ہوئے سوچا۔

Scanned with CamScanner

علاج تک رسائی کا مسئلہ صرف پہاڑی علاقوں کے دیہات تک محدود نہ تھا بلکہ کراچی میں بھی، خاص طور پر پسماندہ بستیوں کے رہنے والوں کے لیے اسی قدر سنگین تھا۔ اس مسئلے کے پیش نظر 1963 ہی میں ملیر کے ایک سرکاری اسپتال کے خالی سرونٹ کوارٹر میں ایک کلینک قائم کیا گیا۔ لانڈھی کا کلینک ایک درخت کے نیچے 1964 میں شروع ہوا اور بعد میں اسے ایک خالی اسٹور روم میں منتقل کیا گیا۔ آخرکار 1970 کے عشرے کے آغاز میں جرمنی سے آنے والے عطیات کی مدد سے ان کلینکوں کے لیے نئے الگ یونٹ حاصل کیے گئے۔

9

جرمنی کے جن لوگوں نے پاکستان کے جذام کے مریضوں کے لیے اپنی محنت کی کمائی میں سے عطیات بھیجے وہ وہاں کے مالدار ترین لوگ نہیں تھے۔ وہ عام محنت کش شہری تھے، جیسے مسز شرائینر۔ یہ خاتون روتھ سے پہلی بار اس وقت ملی تھیں جب روتھ ونٹر برگ کے اسپتال میں ایک نوعمر انٹرن کے طور پر کام کر رہی تھیں۔ مسز شرائینر ایک قریبی گاؤں سے دوستوں کی ایک ٹولی کے ہمراہ ونٹر برگ آئی تھیں تاکہ شہر کے پاس واقع اسکی اِنگ کے مرکز میں جا کر تفریح کر سکیں۔ بس سے اترتے ہوئے ان کا پاؤں پھسل گیا اور سر میں سخت چوٹ آئی۔ انھیں اسپتال میں کئی ہفتوں تک مکمل آرام کرنے کا مشورہ دیا گیا۔ ان کی تنہائی دور کرنے کے لیے نوعمر انٹرن نے انھیں ایک چھوٹا سا ٹرانزسٹر ریڈیو لا دیا۔ صحت یاب ہونے کے بعد مسز شرائینر ریڈیو واپس دینے گئیں۔ ڈاکٹر روتھ نے اسے واپس لینے سے انکار کر دیا۔ ڈاکٹر اور مریض نے گرمجوشی سے بغلگیر ہو کر ایک دوسرے کو الوداع کہی۔

برسوں بعد مسز شرائینر نے کسی جگہ ڈاکٹر روتھ کا ذکر پڑھا کہ وہ دوردراز کے ملک پاکستان میں کام کر رہی ہیں۔ انھیں یہ نام جانا پہچانا سا لگا۔ انھوں نے دیے گئے پتے پر خط لکھ کر دریافت کیا، ''کیا آپ وہی روتھ فاؤ ہیں؟'' اثبات میں جواب ملنے پر مسز والٹرڈ شرائینر نے 'فرینڈز آف کراچی' کے نام سے ایک گروپ منظم کیا جو پورے سارلینڈ کے علاقے میں سفر کرتے ہوئے اپیل جوس بیچتا، اسکولوں میں میلے اور مینا بازار منعقد کرتا اور ''پاکستان میں جذام پر فتح پانے'' کے مقصد ان طریقوں سے اونی کمبلوں اور چھوٹی چھوٹی رقموں کے عطیات جمع کرتا گھومنے لگا۔ اس طرح انھوں

Scanned with CamScanner

نے لاکھوں جرمن مارک کی رقم اکٹھی کی جسے پاکستان بھجوا دیا گیا۔ اور مسز شرائینر محض ایک عام بینک ملازم تھیں۔ جب روتھ نے انھیں شکریے کا پیغام بھیجا تو ان کا جواب تھا: "ہم پاکستان کی مدد کے لیے جو بھی تھوڑا بہت کرتے ہیں اس کا ہمیں صلہ واپس ملتا ہے۔ ہمارے نوجوان انسانیت کی خدمت کرنے کی خواہش رکھتے ہیں اور کمیونٹی کے بڑی عمر کے لوگ مددگار ثابت ہونا چاہتے ہیں۔ اس طرح ہم سب کو اپنی خواہش پوری کرنے کے چھوٹے چھوٹے موقعے مل جاتے ہیں۔ ہمیں تو خود آپ کا شکرگزار ہونا چاہیے۔ آپ کی، والٹراؤڈ شرائینر۔"

اس کے علاوہ میری این تھیں جنھیں چوبیس برس کی عمر میں پولیو کا مرض لاحق ہو گیا تھا اور چلنے پھرنے کے لیے ویل چیئر کی ضرورت پڑ گئی تھی۔ جب 1968 میں روتھ پہلی بار اپنے وطن واپس گئیں تو انھوں نے اپنی خصوصی کار میں انھیں پورے جرمنی کی سیر کرائی۔ روتھ کی والدہ ان کا خیر مقدم کرنے خاص طور پر ایئر پورٹ آئیں اور ان کے ساتھ ساتھ ہر جگہ گئیں جہاں روتھ سلائیڈ شو اور تقریروں کے ذریعے پاکستان میں جذام کے انسداد کے پروگرام کے بارے میں لوگوں کو بتاتی رہیں۔ جب لوگ ان کے پاس آ کر احترام بھری آواز میں ان سے سرگوشی کرتے: "آپ کیسی غیر معمولی ماں ہیں کہ آپ نے روتھ جیسی غیر معمولی بیٹی کی پرورش کی ہے،" تو وہ شرم سے سرخ ہو جاتیں۔ وہ اپنے دل کی گہرائیوں میں خدا کا شکر ادا کرتی تھیں کہ اس نے انھیں روتھ کی ماں کے طور پر چنا تھا۔

روتھ کی بہن آرمگارڈ جو ان سے دو برس بڑی تھیں اور جنھوں نے قانون کی تعلیم حاصل کی تھی، 1971 میں بھاگم بھاگ کراچی پہنچیں تا کہ اس قانونی قضیے سے نمٹنے میں میری ایڈیلیڈ لیپرسی سینٹر کے وکیل اے کے بروہی کی مدد کر سکیں جو ایک جوشیلے یونین لیڈر کی وجہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ آرمگارڈ جو بچپن میں روتھ سے لڑنے جھگڑنے والی بڑی بہن رہی تھیں، بعد میں سات برس تک کراچی میں رہیں اور مریضوں اور اسپتال کے کارکنوں کی فلاح و بہبود کی اسکیمیں تیار کرنے میں روتھ کی مدد کرتی رہیں، جن میں خاص طور پر ایک رہائشی منصوبہ شامل تھا جس کے لیے رقم ایک جرمن صنعتکار ریکس روتھ نے فراہم کی تھی اور جسے بے حد سراہا گیا۔

بہت سے پاکستانی مردوں اور عورتوں نے بھی آگے بڑھ کر کھلے دل سے اسپتال کی مدد کی۔ ان میں مسز (جسٹس) فیروز نانا بھی شامل تھیں۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ مظہر حسین جذام کے

Scanned with CamScanner

مرض سے صحت یاب ہونے کے بعد اپنی ماں کو اپنی خوشی میں شریک کرنے کے لیے ہندوستان جانا چاہتا ہے تو مسز نانا نے رازداری سے اس کے پورے سفرِ خرچ کا بندوبست کیا۔ ان کی بیٹی بڑی ہو کر ماہرِ تعلیم بنیں اور اپنے صوبے کی وزیرِ تعلیم کے عہدے تک بھی پہنچیں پروفیسر انیتا غلام علی خواہ کتنی بھی مصروف کیوں نہ ہوں، میری ایڈیلیڈ لیپری سینٹر اور اس کے مریضوں کے لیے ہمیشہ وقت نکال لیتی ہیں۔

ڈاکٹر زرینہ فضل بھائی نے، جنھیں سماجی تقریبات منعقد کرنے میں خاص ملکہ حاصل تھا، سرکاری افسروں اور ملٹی نیشنل اداروں سے رابطہ قائم کر کے اسپتال کے لیے امداد جمع کی۔ انھوں نے اپنے پورے خاندان کو ان کوششوں میں شامل کر لیا۔ ان کا بیٹا جذام کے مریضوں کو ٹیوشن پڑھاتا، بیٹی اسپتال کے ریکارڈ میں اندراجات کرتی اور جسٹس اکبر فضل بھائی ہمیشہ یہ شکایت کرتے ہوئے آتے کہ میری ایڈیلیڈ لیپری سینٹر نے ان کی حسین بیوی کو ان سے چھین لیا ہے۔

لیکن موت زرینہ کو نہ صرف ان کے محبت بھرے خاندان سے بلکہ میری ایڈیلیڈ لیپری سینٹر اور اس کے ان ہزاروں مریضوں سے بھی چھین کر لے گئی جن کا انھوں نے اتنے پیار اور توجہ سے علاج اور دیکھ بھال کی تھی۔

جب کچھ مخالفوں نے یہ الزام لگایا کہ غیر ملکیوں کا یہ گروپ لوگوں کو عیسائی بنانے کے لیے یہاں آیا ہے تو زرینہ ہی تھیں جنھوں نے آگے بڑھ کر انھیں سیدھا جواب دیا: ''میں ان لوگوں کے ساتھ برسوں سے کام کر رہی ہوں۔ میں مسلمان تھی، مسلمان ہوں اور مسلمان رہوں گی۔ ان لوگوں نے کبھی میرا مذہب تبدیل کرانے کی کوشش نہیں کی۔''

ڈاکٹر زرینہ فضل بھائی مارچ 1999 میں انتقال کر گئیں۔

صفیہ خان، جنھوں نے بمبئی یونیورسٹی سے گریجویشن کیا تھا اور انگلستان سے انگریزی زبان میں ڈپلوما حاصل کیا تھا، زرینہ فضل بھائی کی دوست تھیں۔ وہ کراچی کے مانے ہوئے نیوٹاؤن گرلز سیکنڈری اسکول کے بانیوں میں شامل اور اس کی پرنسپل تھیں۔ جب ان کا اسکول قومیا لیا گیا تو انھوں نے وہاں کام کرنا چھوڑ دیا اور میری ایڈیلیڈ لیپری سینٹر کی ٹیم میں شامل ہو گئیں۔ وہ مختلف اسکولوں میں جا جا کر سلائیڈ شو اور تقریریں کرتی تھیں اور یہ انھی کا خیال تھا کہ اسکول کے بچے ''ماچسوں کے

Scanned with CamScanner

مقابلے'' کے ذریعے اسپتال کے لیے چندہ جمع کریں۔ صفیہ خان 1984 میں وفات پانے تک انتھک ولولے کے ساتھ کام کرتی رہیں۔

ڈاکٹر زرینہ اور صفیہ خان کی وراثت آنے والے برسوں میں آگے بڑھتی گئی اور بہت سی کامیاب پاکستانی خواتین میری ایڈیلیڈ لیپرسی سینٹر کی مدد کے لیے آگے آتی رہیں، نہ صرف جذام کے انسداد بلکہ ٹی بی اور نابینا پن کے انسداد کے لیے بھی۔ پروفیسر رابعہ حسین جیسی سائنسدان، ڈاکٹر برناڈیٹ ڈین جیسی ماہر تعلیم، غزالہ احمد جیسی میڈیا منیجر اور شیریں رحمت اللہ جیسی تجربہ کار سماجی کارکن اس کی مجلس عاملہ کی رکن ہیں۔

1966 میں جب روتھ دوسری بار سوات کے دورے پر گئیں تو ان کے ساتھ بیلجیم سے تعلق رکھنے والی گول مٹول، سدا مسکراتی نرس ژنین گیوزبھی تھیں۔ انھوں نے 1962 میں ٹیم میں شمولیت اختیار کی تھی، یعنی اسی سال جب زرینہ فضل بھائی ٹیم کا حصہ بنیں۔ 1963 میں جب اسپتال اپنی نئی عمارت میں منتقل ہوا تو ژنین کو اس کی پہلی میٹرن بنایا گیا۔ انھوں نے اسپتال میں نرسنگ سروسز کی تنظیم کی۔ اسپتال کے نئی عمارت میں آنے کے دوسرے ہی دن ایک صاحب نئے اسپتال کو دیکھنے چلے آئے۔ ژنین نے انھیں اسپتال گھمانے کی پیشکش کی۔ وارڈوں کا معائنہ کرتے ہوئے اس نوجوان پارسی جنٹلمین خرسیگارا نے اچانک رک کر پوچھا، ''مگر بیڈ کہاں ہیں؟'' انھیں سادہ سا جواب ملا، ''ہم نے ابھی اتنے آگے تک نہیں سوچا ہے۔'' اگلے دن بارہ بالکل نئے بیڈ ان صاحب کی طرف سے عطیے کے طور پر اسپتال پہنچ گئے۔

10

راولپنڈی سے بذریعہ سڑک سوات جاتے ہوئے روتھ اور ژنین کی نظر ایک بورڈ پر پڑی جس پر لکھا تھا: ''ڈائرکٹر ہیلتھ سروسز، آزاد کشمیر و شمالی علاقہ جات۔'' وہ اس ٹیم ورک کو دیکھنے کے تجسس میں گاڑی سے اتر کر اندر چلی گئیں۔ ڈائرکٹر این یو احمد ایک جنٹلمین ثابت ہوئے۔ جب معلوم ہوا کہ پورے آزاد کشمیر اور شمالی علاقوں کی ڈسپنسریوں میں ان کے پاس پیرامیڈیکل کارکنوں کا عملہ موجود ہے تو دونوں خواتین نے ان کارکنوں کو جذام کے علاج میں تربیت دینے کی پیشکش کی کیونکہ انھوں نے

ان علاقوں سے جذام کے بہت سے مریضوں کو علاج کے لیے کراچی آتے ہوئے دیکھا تھا۔ این یو اے نے یہ پیشکش قبول کر لی۔ آٹھ کارکنوں کو لیپر سی ٹیکنیشن کے اگلے تربیتی کورس میں شامل ہونے کے لیے کراچی بھیجا گیا۔ ان آٹھ میں دو کشمیری نوجوان محمد اشرف اور سید تصدق حسین گیلانی بھی شامل تھے۔ یہ ایک این جی او — میری ایڈیلیڈ لیپر سی سینٹر — اور گورنمنٹ ہیلتھ سروسز کے درمیان ایک منفرد شراکت کی ابتدا تھی، جس کے اخراجات جی ایل آر اے، میسریور اور عالمی ادارۂ صحت نے فراہم کیے۔

جب روتھ اور زرینہ نے 1979 میں آزاد کشمیر کا دورہ کیا تو محمد اشرف اور سید تصدق، دونوں سرکاری پیرامیڈیکل کارکن جنہوں نے میری ایڈیلیڈ لیپر سی سینٹر میں تربیت پائی تھی، ان کی رہنمائی کے لیے موجود تھے۔

عباس پور کے نزدیک وہ ایک تنگ پہاڑی راستے پر سفر کر رہے تھے۔ اچانک گھاس سے ڈھکی ایک ڈگر پر روتھ کا پاؤں رپٹ گیا۔ وہ پھسل کر ایک سنگلاخ چٹان پر جا گریں اور ان کی پنڈلی میں موچ آ گئی۔ وہ دونوں فوراً روتھ کو سہارا دینے کے لیے بڑھے۔ سنبھل کر کھڑے ہوتے ہوئے ان کی نظر ایک دم اس شخص پر پڑی۔ غار سے باہر جھانکتے اس کے گلتے ہوئے چہرے میں اس کی آنکھیں حیرانی سے چمک کر پھیل گئی تھیں۔ حیرت کا سامنا حیرت سے ہوا۔ روتھ اپنی سوجی ہوئی پنڈلی کی تکلیف کو بھول کر، اشرف کے سہارے غار میں چلی گئیں۔ وہ لیپرومیٹس کا مریض تھا اور تیز بخار میں مبتلا تھا۔ اس کے سر میں جوئیں پڑی ہوئی تھیں، بال دھول سے اٹ کر جٹائیں بن گئے تھے اور کپڑے لیر لیر تھے۔ اس نے بتایا کہ جذام کے مرض میں مبتلا ہونے کی وجہ سے اس کے گھر والوں نے اسے نکال دیا ہے۔

بخار اور بدن کی خشکی کے باعث وہ اتنا کمزور ہو گیا تھا کہ چل نہیں پا رہا تھا۔ اشرف اور تصدق پاس کے گاؤں سے ایک چارپائی مانگ کر لائے اور اسے جیپ میں سوار کیا۔ عباس پور کے جذام کے کلینک میں زرینہ نے اپنی نرسنگ کی مہارت سے کام لیتے ہوئے، لڑکوں کی مدد سے اسے نہلایا۔ پھر وہ اسے راولپنڈی لائے اور وہاں کے جذام کے اسپتال میں اسے داخل کرایا۔ اس اسپتال کو ایک اور این جی او "ایڈ ٹو لیپر سی پیشنٹس" (ALP) چلاتی تھی جو پنجاب اور شمال مغربی سرحدی صوبے کے ہزارہ ڈویژن میں جذام کے مرض کے خلاف کام کر رہی تھی اور جس کا انتظام خدمت کے جذبے سے

Scanned with CamScanner

سرشار جرمن رضا کاروں کے ایک گروپ کے ہاتھوں میں تھا۔ اب اس این جی او کا میری ایڈیلیڈ لیپرسی سینٹر کے ساتھ قریبی تعاون شروع ہو چکا تھا۔

راولپنڈی جاتے ہوئے انھیں پتا چلا کہ جذام کا یہ مریض ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتا ہے جس کے سات افراد میں جذام کی ابتدائی علامات پائی گئی ہیں، جس سے کسی چھوت کے مریض کی موجودگی کی تصدیق ہوتی تھی۔ خاندان کے تمام افراد کا معائنہ کیا گیا، سوائے باپ کے جس کے بارے میں گھر والوں نے کہا کہ "وہ بکریاں چرانے اوپر پہاڑوں میں گیا ہوا ہے۔"

راولپنڈی میں علاج کے بعد صحت یاب ہو کر وہ اپنے خاندان سے جا ملا۔

ایسا ہی ایک واقعہ 1980 میں شمالی علاقوں میں پیش آیا جب وہ گلگت سے کچھ دور واقع دیہات کا سروے کر رہی تھیں۔ ایک گاؤں میں ٹیم کو احساس ہوا کہ گاؤں والے ان سے پوری طرح تعاون نہیں کر رہے ہیں۔ ایک پہاڑی راستے پر چڑھتے ہوئے انھوں نے ایک لڑکے سے پوچھا کہ کیا گاؤں میں جذام کا کوئی مریض موجود ہے۔ اس نے اوپر پہاڑوں میں ایک غار کی طرف اشارہ کیا۔ وہ ایک سخت چڑھائی کے بعد ہانپتے ہوئے وہاں پہنچے۔ غار کے داخلے پر پتھروں کی ایک دیوار کھڑی تھی۔ لڑکے نے سرگوشی میں بتایا تھا کہ اندر ایک لڑکی بند ہے۔ گلگت سے تعلق رکھنے والے پیرامیڈیکل کارکن عبداللہ نے اوپر چڑھنے میں روتھ کی مدد کی۔ روتھ نے اندھیرے غار میں آواز دی۔ ان کی پکار کا کوئی جواب نہ آیا۔ انھوں نے دیوار کے سوراخ میں سے اپنا ہاتھ غار میں داخل کیا۔ ایک نرم ہاتھ نے ان کے ہاتھ کو سختی سے جکڑ لیا۔ وہ آہستہ آہستہ سرک کر غار میں گھس گئیں۔ اندر سیلن اور اندھیرا تھا۔ انسانی فضلے کی بدبو ان کی ناک میں آئی۔ تب نیم تاریکی میں انھیں لڑکی کے سوکھے ہوئے بدن کی شبیہ دکھائی دی۔ اوینہ کی عمر بمشکل چودہ برس کی تھی۔ وہ چیتھڑوں میں لپٹی وہاں کھڑی ٹھنڈ اور شاید خوف سے کانپ رہی تھی۔ ڈاکٹر روتھ نے اپنا ڈھیلا ڈھالا جیکٹ اتار کر فوراً اسے پہنا دیا تاکہ وہ سردی سے بچ جائے اور خوف کی کیفیت سے نکل آئے۔ محبت اور مسیحائی کی متلاشی آنسو بھری آنکھیں لیے وہ لڑکی فرطِ جذبات میں ان کے بازوؤں میں سمٹ گئی۔ اس کے غلیظ چیتھڑوں میں سے جذام کے چکتے دکھائی دے رہے تھے۔ لڑکوں نے اسے سہارا دے کر غار سے باہر نکالا۔

لیکن لڑکی کے گھر والوں نے اسے واپس لینے سے انکار کر دیا۔ وہ یہ ماننے کو تیار نہ تھے کہ

Scanned with CamScanner

جذام کا دواؤں سے علاج ہو سکتا ہے۔ اس تمام محنت سے تھکے ہوئے عبداللہ نے اپنا فیصلہ سنایا۔ وہ لڑکی کو اپنے ساتھ لے جائے گا۔ ''لیکن کہاں؟'' روتھ نے حیران ہو کر پوچھا۔ ''میرے گھر میں سات لوگ ہیں۔ ایک اور کے آنے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا،'' اس نے عزم کے ساتھ جواب دیا۔

موثر علاج کے نتیجے میں صحت یاب ہونے کے بعد ادینہ نے عبداللہ کے چھوٹے بھائی سے شادی کر لی۔ اب وہ چار صحت مند بچوں کی خوش و خرم ماں ہے۔

چند سال بعد جب روتھ کو عبداللہ کی اچانک موت کی اطلاع ملی تو وہ اپنے آنسو نہ روک پائیں۔ یہ آنسو سرکاری محکمۂ صحت میں اپنے ایک ساتھی کارکن اور اپنے ایک بیش بہا دوست کی موت پر نکلے تھے۔ انھیں وہ دن یاد آیا جب عبداللہ لیپرسی ٹیکنیشن کے طور پر تربیت پانے کراچی آیا تھا، پھر شمالی علاقوں میں اس کے ساتھ کیے ہوئے گرمجوش فیلڈ ٹرپ یاد آئے، اور بلاشبہ جاڑوں کی برفباری شروع ہونے سے ذرا پہلے ادینہ کا ملنا یاد آیا۔

ادینہ کی کہانی پر بعد میں پی ٹی وی نے ایک ڈرامہ تیار کیا جس میں ادینہ کا کردار نامور اداکارہ روحی بانو نے ادا کیا۔ روحی بانو نے اس ڈرامے میں اپنے کردار کو اپنے پورے ایکٹنگ کیریئر کا یادگار ترین کردار قرار دیا۔

اگر ادینہ نے اپنے بچپن کے دو قیمتی سال پاکستان کے کوہ ہندوکش کے ایک، اندھیرے غار میں گزارے تھے تو دوسری طرف ذکیہ کو افغانستان میں اتنی ہی، بلکہ اس سے بھی کہیں بڑی بد قسمتی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ روتھ ہی نے ذکیہ کو بھی اس کی طویل مصیبت زدہ حالت سے باہر نکالا۔ روتھ، جو انسانی مصائب کے خلاف کام کرنے کے مقصد سے پاکستان آئی تھیں، پہلی بار 1983 میں اسی مشن پر ہمسایہ ملک افغانستان پہنچی تھیں۔

1979 میں افغانستان پر سوویت یونین کے حملے کے بعد افغان مہاجرین کی ایک بڑی تعداد نے پاکستان میں پناہ لی تھی۔ ان میں سے بہت سوں میں جذام کے مرض کی پیش رفت کی واضح علامات پائی جاتی تھیں۔ یہ اس بات کی خاصی بڑی شہادت تھی کہ اس جنگ زدہ ملک میں یہ بیماری بہت پھیلی ہوئی ہے۔ مجاہدین کے ایک گروپ نے روتھ سے درخواست کی تھی کہ اس مرض کے منبع تک پہنچ کر اس کی روک تھام کی تدبیر کریں۔ روتھ نے اس سلسلے میں دو افغانوں، حسن اور مبارک،

سے مشورہ کیا جو کراچی میں علاج کے بعد جذام کے مرض سے صحت یاب ہو کر لیپرسی ٹیکنیشن کے طور پر تربیت حاصل کر چکے تھے۔ رتھ کو جذام سے متعلق حکومت پاکستان کا وفاقی مشیر مقرر کر دیا گیا تھا۔ اس حیثیت سے انھوں نے صدر سے ملاقات کی اور افغانستان کے دورے کی اجازت طلب کی۔ صدر جنرل ضیاء الحق نے انھیں اجازت دے دی۔

رتھ نے زرد رنگ کا برقع اوڑھا اور سرخ رنگ کی ٹویوٹا لینڈ کروزر میں سوار ہو گئیں جسے ایک افغان مجاہد چلا رہا تھا۔ وہ رات کے اندھیرے میں کوئٹہ شہر کی سڑکوں سے گزر کر پوپھٹے سرحد پار کر کے افغانستان میں داخل ہو گئے۔ بنجر پہاڑی راستوں پر دو دن متواتر سفر کے بعد، راستے میں چینکیں بھر بھر کر قہوہ پیتے اور درختوں سے خوبانیاں توڑ کر کھاتے ہوئے، وہ مرکزی افغانستان میں ہزارہ جات کے علاقے میں پہنچے جس پر مجاہدین کا قبضہ تھا۔

آس پاس کے دیہات کے سروے کے دوران ان کی ملاقات ایک شخص سے ہوئی جس نے کراچی میں جذام کا کامیاب علاج کروایا تھا۔ اس نے بتایا کہ ایک لڑکی جسے جذام میں مبتلا ہونے کے بعد اس کے والدین نے مردہ مشہور کر دیا ہے، اس کے شک کے مطابق زندہ ہے اور اسے گاؤں میں کسی جگہ چھپا دیا گیا ہے۔ اس نے پہاڑی کے اوپر بنے ہوئے ایک مکان کی جانب اشارہ کیا۔ ٹیم پہاڑ پر چڑھ کر پتھروں کے بنے اس مکان تک پہنچی۔ لڑکی کی ماں میں جذام کے مرض کی ابتدائی علامات دکھائی دیں۔ انھوں نے اس سے بچی کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے انھیں وہی جواب دیا کہ وہ مر چکی ہے۔

لیپرسی ٹیکنیشن مبارک نے مکان کے اردگرد چکر لگایا اور مویشیوں کے چھوٹے سے باڑے میں جھانکا۔ لڑکی وہاں ایک کونے میں دبکی ہوئی تھی۔ مبارک نے دہشت زدہ ہو کر رتھ کو آواز دی۔ انھوں نے ہچکچاتے ہوئے باڑے میں قدم رکھا۔ اندر اندھیرا اور تعفن پھیلا ہوا تھا۔ وہ قریب سے دیکھنے کے ارادے سے آگے بڑھیں۔ وہ میکلوڈ روڈ کے بدہیئت گداگروں کے درمیان ایک پوری عمر گزار آئی تھیں لیکن افغانستان میں بہت اندر جا کر واقع اس مویشیوں کے باڑے میں انھیں جو مسخ شدہ انسانی چہرہ دکھائی دیا، ویسا چہرہ دیکھنے کی انھوں نے کبھی توقع نہیں کی تھی۔ اور یہ چہرہ ایک چھبیس سالہ عورت کا تھا۔ دکھ کی سوجی ہوئی سرخ آنکھیں اپنے حلقوں سے باہر ابل آئی تھیں۔ اس کی ناک

Scanned with CamScanner

پوری گل کر جھڑ چکی تھی۔ منہ ٹیڑھا ہو گیا تھا اور اس میں سے رال بہ رہی تھی۔ اس کی آواز تک مرض کے باعث بگڑ کر بھاری سرگوشی میں بدل گئی تھی۔ جب مبارک نے اسے سمجھایا کہ وہ لوگ اس کا علاج کرنے آئے ہیں تو اس نے دوا مبارک کے چہرے پر دے ماری اور کہا، "تم لوگ اب آئے ہو جب۔۔۔" مبارک کو اسے فارسی میں سمجھانے میں پورا ایک گھنٹہ لگا کہ علاج شروع کرنا بہت ضروری ہے۔ آخرکار وہ اسے باڑے سے باہر نکال لائے لیکن اب اس کی ماں ان کے راستے میں دیوار بن کر کھڑی ہو گئی۔ ہرگز نہیں! اس کی اور بھی بیٹیاں ہیں جن کی شادی ہونی ہے۔ اگر اس نے کوڑھ سے مسخ شدہ اس لڑکی کو اپنے گھر میں آنے دیا تو اس کی بیٹیوں کو کوئی رشتہ نہیں دے گا۔ اب صرف ایک ہی راستہ تھا کہ ذکیہ کو برقعے میں لپیٹ کر کراچی لے آیا جائے۔ اس کے باوجود اس کے جسم سے اٹھتا تعفن اتنا شدید تھا کہ ڈرائیور اس وقت تک گاڑی چلانے پر آمادہ نہ ہوا جب تک وہ گاڑی کے سب سے دور والے کونے پر سامان کے پاس نہ جا بیٹھی۔

اسپتال میں داخل ہونے کے بعد وہ روتھ کے سوا کسی کو اپنے پاس نہ پھٹکنے دیتی تھی۔ جب سینئر نرس رضیہ نے اسے سمجھایا کہ وہ بھی ذکیہ کی طرح شیعہ مسلمان ہے تو کہیں جا کر اس نے اسے خود کو نہلانے اور بال سنوارنے کی اجازت دی۔ رضیہ کو اس کے ناخن کاٹنے کی ضرورت نہ پڑی کیونکہ ناخن پہلے ہی انگلیوں کے ساتھ جھڑ چکے تھے۔ اس کے ہاتھوں اور پیروں کی جگہ صرف ٹھونٹھ رہ گئے تھے۔

دواؤں سے ذکیہ کا انفیکشن چند ماہ کے اندر ٹھیک ہو گیا لیکن پچھلے بیس برس علاج سے غفلت برتنے کے نتیجے میں اس کا جسم جس طرح مسخ ہو چکا تھا اس کی درستی ممکن نہ تھی۔ جب گاؤں والوں کو اس کی موت کی جھوٹی خبر دی گئی تب اس کی عمر صرف چھ سال تھی۔

آسٹریلیا کی ری کنسٹرکٹو سرجن ڈاکٹر گریس وارن، جو 1967 سے میری ایڈیلیڈ لیپرسی سینٹر میں آ کر ہزاروں مریضوں کے آپریشن کر چکی تھیں، ذکیہ کے لیے کچھ زیادہ نہ کر پائیں۔ بیس برس طویل نفسیاتی ابتلا نے ذکیہ پر اپنے گہرے اثرات چھوڑے تھے اور اس پر کسی کسی وقت اچانک جارحیت کا دورہ پڑ جاتا تھا جس میں وہ تکیے اور برتن اٹھا اٹھا کر پھینکنے اور آئینے اور واش بیسن توڑنے لگتی تھی۔

ان دوروں کے درمیانی وقفوں میں ذکیہ کی خوش مزاج طبیعت ابھر آتی اور وہ چوری چھپے باورچی خانے میں جا کر قالتو پھل چرا لاتی اور اسپتال میں چکر لگاتے ہوئے اپنے ساتھی مریضوں کے

ساتھ بانٹ کر کھاتی۔ شام کے وقت وہ چھت پر چلی جاتی اور واٹر ٹینک کی چھت سے شہر کی وسعت کا گھنٹوں نظارہ کیا کرتی، یا پھر نیچے آ کر ٹی وی دیکھنے لگتی اور کشتی لڑتے پہلوانوں یا پنجابی عشقیہ گانے گاتی ملکۂ ترنم نور جہاں کو داد دینے کے لیے اپنے ہاتھوں کے ٹھونٹھوں سے تالیاں بجاتی۔

ذکیہ نے منگھوپیر میں اسکول اور کڑھائی کی ورکشاپ کے برابر میں واقع، سسٹر ژنین کے زیرِ اہتمام چلنے والے میری ایڈیلیڈ لیپرسی سینٹر اپاہج خانے میں 1999 میں اپنی زندگی پوری کی۔ سسٹر ژنین اور اسکول کی طالبات اور رفت کار لڑکیاں اکثر اس سے ملنے آتیں اور اس کے لیے تحفے اور پھول لاتیں۔ ان میں سے کئی، مثلاً بیلجیم کی فزیوتھیراپسٹ کیتھلین سویلن، اس کی قریبی دوست بن گئی تھیں۔

11

سنیچر 15 جولائی 1945 کو این فرینک نے اپنی ڈائری میں لکھا تھا:

"میرے لیے اتنے انتشار، کرب اور موت کی بنیاد پر اپنی زندگی تعمیر کرنا قطعی ناممکن ہے۔ میں دنیا کو رفتہ رفتہ ایک ویرانے میں بدلتا ہوا دیکھ رہی ہوں، آنے والے طوفانوں کی گرج سن رہی ہوں جو ایک دن ہم سب کو نیست و نابود کر دے گا۔ مجھے لاکھوں انسانوں کی زندگی کے مصائب محسوس ہوتے ہیں۔ پھر بھی جب میں آسمان کی طرف نگاہ اٹھاتی ہوں تو کسی نہ کسی طرح مجھے احساس ہوتا ہے کہ سب کچھ بہتر ہو جائے گا، کہ یہ سفاکی بھی آخرکار ختم ہو جائے گی، کہ امن اور سکون ایک بار پھر لوٹ آئیں گے۔ اس دوران مجھے اپنے آدرشوں سے مضبوطی سے جڑے رہنا چاہیے۔ شاید ایک دن آئے گا جب میں ان آدرشوں کو حاصل کر پاؤں گی۔"

این فرینک نے جرمنی کے ایک خاندان میں 12 جون 1929 کو، روتھ فاؤ سے صرف تین ماہ پہلے، جنم لیا تھا۔ وہ سولہ برس کی چھوٹی سی عمر میں ایک کنسنٹریشن کیمپ میں چل بسی۔ اس کی لاش، اس کی بہن کی لاش کے ساتھ، ایک اجتماعی قبر میں ڈال دی گئی۔

این فرینک ایک صحافی، ایک لکھاری بننا چاہتی تھی۔ وہ پوری دنیا کا سفر کرنے کا خواب دیکھتی تھی، لیکن وہ اپنا یہ خواب پورا نہ کر سکی۔

اس کے برخلاف روتھ فاؤ موت اور تباہی سے بچ نکلیں۔ آج وہ حکومت پاکستان کی وفاقی مشیر ہیں۔ یہ عہدہ انھیں 1979 میں پیش کیا گیا تھا۔ انھوں نے اسے ہچکچاتے ہوئے قبول کیا، صرف اس غرض سے کہ جذام کے مریضوں اور ان کا علاج کرنے والے پیرامیڈیکل کارکنوں کی آواز اسلام آباد کی افسر شاہی کی راہداریوں تک پہنچ سکے۔

ان کارکنوں کی بات کریں تو یہی وہ نوجوان تھے جو روتھ کی رہنمائی کرتے ہوئے انھیں مکران کے ریگزاروں اور گلگت کے پہاڑوں میں لے گئے تھے۔ انھی نے روتھ کے ساتھ مل کر کراچی میں عائد کرفیو، بلوچستان کے گرج چمک کے طوفان اور اچانک پھوٹ پڑنے والے سیلاب اور آزاد کشمیر کے برفانی تودے کی پروا کیے بغیر خدمت کی اعلیٰ مثال قائم کی۔ سندھ کی تپتی ریت پر سفر، بھوک اور پیاس کی شدت، زہریلے کیڑے مکوڑوں کے احساس کے ساتھ کھلے آسمان تلے راتوں کا قیام، پورے پاکستان میں یہ سفر رکا نہیں، تھما نہیں۔

اس جدوجہد نے روتھ کو اپنے کام کا اعتراف اور احترام بخشا۔ وفاقی جمہوریہ جرمنی نے انھیں 1969 میں پہلا اعزاز Bundesverdienstkreuz، 1978 میں دوسرا Grosse Bundesdienstkreuz، 1985 میں تیسرا Grosse Verdienstkreuz mit Stern اور 1994 میں چوتھا Osterreichische Albert Schweitzer-Gesse llschaft عطا کیا۔ پاکستان نے، جسے وہ پیار سے "میرے دل کا ملک" کہتی ہیں، انھیں 14 اگست 1969 کو ستارۂ قائداعظم، 23 مارچ 1978 کو ہلال امتیاز، اور 23 مارچ 1989 کو ہلال پاکستان کے اعزاز اور پاکستان کی اعزازی شہریت پیش کی۔ 1991 میں امریکہ کی ڈیمین ڈٹن سوسائٹی فار لیپرسی ایڈ نے انھیں ڈیمین ڈٹن ایوارڈ سے نوازا۔ سال 2002 ان کے لیے فلپائن کا رامون میگسیسے ایوارڈ لے کر آیا۔

پاکستان میں کم لوگوں کو علم ہو گا کہ ڈاکٹر روتھ فاؤ پانچ کتابوں کی مصنفہ ہیں، جو سب جرمن زبان میں ہیں۔ ان میں سے پہلی کتاب کا انگریزی ترجمہ 1987 میں To Light a

Candle کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔

یہ وہ یادداشتیں ہیں جن کے اصل جرمن روپ کی ایک کاپی ایک خاتون اپنے سینے سے لگائے کھڑی دکھائی دیں جب روتھ نے اپنے آبائی وطن کے ایک سفر کے دوران جوان اور بوڑھے جرمن مردوں اور عورتوں کو آٹوگراف دیتے ہوئے اچانک نظریں اٹھا کر دیکھا۔ خاتون ان کی ہم عمر دکھائی دیتی تھی۔ جب ان کی نظریں ملیں تو وہ ان کے قریب آئی اور پوچھا، ''مجھے پہچانتی ہو؟... میں گابی ہوں۔'' ہاں بالکل! وہ ان مسکراتی ہوئی نیلی آنکھوں کو کیسے بھول سکتی تھیں جو ان کے ذہن پر برسوں مسلط رہی تھیں۔ وہی آنکھیں جو اس وقت آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ دونوں سہیلیاں ایک دوسرے کے گلے لگ کر بے ساختہ رو پڑیں۔

بعد میں گابی نے روتھ کو بتایا کہ یہ کتاب ایک بک اسٹور میں اتفاق سے اس کے ہاتھ لگ گئی تھی۔ سرورق پر روتھ کا نام لکھا دیکھ کر وہ اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ اس نے ورق الٹ کر دیکھا تو کھوئے ہوئے بچپن کے تذکرے میں اسے اپنا نام بھی دکھائی دیا۔ پھر گابی نے اپنے خاندان پر پڑنے والی ابتلا کا تذکرہ کیا اور بتایا کہ کس طرح وہ لوگ فرار ہو کر ہمسایہ ملک بیلجیم پہنچے اور وہاں جنگ کے خاتمے تک روپوش رہے۔

بنی نئی حاصل کردہ دنیا میں روتھ کو بھی اپنے حصے کی تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ انھیں اپنے سر میں مائیگرین کا جو درد یونیورسٹی کے دنوں سے محسوس ہوتا تھا، اسے انھوں نے کبھی سنجیدگی سے نہیں لیا تھا۔ جب بھی وہ فیلڈ میں دورے پر ہوتیں تو جیپ کی پچھلی سیٹ یا کسی چارپائی پر آدھ گھنٹہ لیٹ کر دوبارہ اٹھ کر کام میں جت جاتیں، جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

ایک بار افغانستان کے صوبہ بامیان میں، جو خاصی اونچائی پر واقع ہے، انھیں نمونیا ہو گیا۔ جذام کے افغان کارکن محمد جمعہ نے انھیں لال کے مقام سے نیچے یاکولنگ تک پہنچایا۔ وہاں ان کی اتفاقیہ ملاقات اقوامِ متحدہ کے ایک ڈاکٹر سے ہو گئی۔ ڈاکٹر نے ان کے لیے ایک خصوصی طیارے کا بندوبست کیا جو انھیں کابل لایا اور وہ وہاں اقوامِ متحدہ کے اسپتال میں داخل ہوئیں۔ وہاں ایک ہفتہ رہنے کے بعد جب وہ صحت یاب ہوئیں تو اقوامِ متحدہ کے ایک اور طیارے کے ذریعے اسلام آباد پہنچیں۔ انھوں نے زندگی بھر اپنے لیے کوئی خصوصی سلوک طلب نہیں کیا تھا، چائے کی ایک فاضل

Scanned with CamScanner

پیالی تک نہیں۔ نہ کبھی انھوں نے اپنے لیے کوئی فالتو لباس خریدا۔ وہ جو کچھ بھی پہنتیں وہ کسی دوست، یا کمیونٹی کی ساتھی یا کسی ایسے مریض کا دیا ہوا تحفہ ہوتا جو اپنی صحت یابی سے خوش ہو کر انھیں تحفہ دینا چاہتا اور انکار کر کے جس کا دل توڑنا ان کے بس میں نہ ہوتا۔ ان کو ملنے والے طلائی تمغوں کا سونا بھی پگھلا کر جذام کے غریب مریضوں کی بیٹیوں کے جہیز کے زیوروں میں شامل کر دیا گیا تھا۔

اس وی آئی پی طیارے کی بیضوی کھڑکی سے نیچے پھیلے تیزی سے گزرتے ہوئے ویرانے کو دیکھ کر انھیں طیارے میں خود کو پا کر عجیب سا احساس ہوا۔ ٹھیک اس وقت اقوام متحدہ کا ایک اہلکار آ کر ان کے برابر میں بیٹھ گیا۔ ان سے مخاطب ہو کر اس نے دھیمی آواز میں کہا: "آپ کو پتا ہے، ہم لوگ آپس میں بات کر رہے تھے کہ صرف آج ہم اس اڑنے والی جنگی مشین پر ہونے والے خرچ کو با جواز سمجھ سکتے ہیں۔" روتھ اس کی طرف دیکھ کر مسکرائیں۔ ان کی آنکھیں نم تھیں۔

لیکن ہر شخص اتنا مہربان نہیں تھا جتنا اس پرواز پر ملنے والا نوجوان افسر۔ اور وہ کلاشنکوف بردار فرقہ پرست جنگجو تو ہرگز نہیں جو ایک روز گلگت میں دریائے اسفیری کے پار واقع جذام/ ٹی بی کے کلینک میں گھس آئے تھے۔ وہاں سب لوگ ایک لمبے تربیتی سیشن کے درمیانی وقفے میں بیٹھے سستا رہے تھے۔ ان قاتلوں کی خون آشام آنکھیں دیکھ کر روتھ لپک کر اپنی کرسی سے کھڑی ہو گئیں اور اپنے عملے کو بچانے کے لیے اپنی کرسی ہوئی چادر ان پر تان دی۔ حملہ آوروں کو باتوں میں الجھا کر انھوں نے عملے کے ارکان سے اشارے میں وہاں سے بھاگ نکلنے کی التجا کی۔ حملہ آور وہاں سفید بالوں والی ایک غیر ملکی عورت کو دیکھ کر ٹھٹکے تو تھے لیکن جلد ہی سنبھل گئے۔ جب انھوں نے روتھ کو زور کا دھکا دے کر فرش پر گرایا تو انھیں اپنے دائیں بازو میں شدید درد محسوس ہوا۔ انھیں لگا کہ انھیں گولیاں چلنے کی آواز اور چیخ پکار سنائی دی ہے، اور پھر سب کچھ دھندلا گیا۔ جب انھیں ہوش آیا تو غسل خانے سے خون بہہ کر باہر آ رہا تھا۔ وہ کسی طرح لڑکھڑاتی ہوئی قریب ترین فوجی چوکی تک پہنچیں۔ دو سینئر پیرا میڈیکل کارکن رشید اور شاد دین بھی ان کے ساتھ ہو لیے۔ جب تک فوجی سپاہی کلینک میں پہنچے، قاتل غسل خانے میں جان بچا کر چھپے پانچ افراد کو قتل کر کے فرار ہو چکے تھے۔ مقتولوں میں عملے کے دو سینئر ارکان اور تین مریض شامل تھے۔ ڈاکٹر روتھ کا ٹوٹا ہوا بازو اگلے دن سے پہلے پلاسٹر میں نہ ڈالا جا سکا کیونکہ وہ باقی ماندہ عملے، مریضوں اور ان کے خاندان کی ڈھارس بندھانے میں مصروف تھیں۔

Scanned with CamScanner

پاکستان کے جذام کے انسداد کے پروگرام کی کامیابی کے لیے روتھ نوجوان سرکاری پیرامیڈیکل کارکنوں کی مرہونِ منت تھیں جنھیں انھوں نے میری ایڈیلیڈ لپرسی سینٹر کے تربیتی مرکز میں تربیت دی تھی اور جو اب پورے پاکستان میں انسدادِ جذام کے کلینک اپنی نگرانی میں چلا رہے تھے۔ وفاقی مشیر کے طور پر انھوں نے ان محنتی ساتھی کارکنوں کی محنت کو تسلیم کرنے اور انھیں ترقی دینے کے لیے ایک کریئر اسٹرکچر تیار کر کے حکومت کو پیش کیا۔ یہ پیرامیڈیکل کارکنوں کے زمرے کی بہبود کے لیے ملک میں اپنی قسم کا پہلا منصوبہ تھا اور اس سے صحت کے دوسرے شعبوں میں بھی اس طرح کی بہتری کی راہ کھل گئی۔

یہ نوجوان، جو غریب اور دیہی پس منظر رکھتے تھے اور جنھیں زندگی میں ترقی پانے کے موقعے بمشکل نصیب ہوتے تھے، اپنی تعلیم اور باعزت ہیلتھ ورکروں کے طور پر اپنی ترقی کے لیے ڈاکٹر روتھ کے احسان مند تھے۔ یہ خاتون ان کے لیے ماں سے بڑھ کر مہربان ثابت ہوئی تھیں۔ انھوں نے ان عام نوجوانوں کو اپنی اپنی کمیونٹی اور کام کی جگہ میں رہنماؤں کی صورت میں ڈھال دیا تھا۔ اور اس تجربے سے دونوں فریقوں کی شخصیت کو فیض حاصل ہوا تھا۔ انھوں نے ایک ایشیائی مسلم ثقافت کی اقدار کو جاننے کے عمل میں روتھ کی مدد کی تھی جسے وہ احترام کی نظر سے دیکھنے لگی تھیں۔

ان کی رہنمائی میں یہ نوجوان دوسری خواتین، اپنی ماؤں اور بیویوں کے خیالات کو بہتر طور پر قبول کرنے کے قابل ہوئے تھے۔ انھیں اپنی بیٹیوں کو تعلیم دینے کی ضرورت کا احساس ہوا تھا۔ اپنے کام کے دوران انھیں جمہوری شراکت اور دوسروں کو ذمے داریاں سونپنے کی ضرورت پڑی تھی۔ انھیں احساس ہونے لگا کہ دوسرے شخص کی غلطی معاف کرنا خود اپنے لیے بھی فائدہ مند ہوتا ہے۔ دوسروں کی خدمت کے عوض لازوال سکون اور مسرت حاصل کرنے کا فن بھی لوگوں نے ڈاکٹر روتھ فاؤ سے سیکھا تھا۔

دوسری طرف ڈاکٹر روتھ ان کے مضبوط عقائد، مستحکم خاندانی رشتوں، بزرگوں کے لیے ان کے احترام، خطرہ مول لینے پر آمادگی، دشواریوں کا سامنا کرنے کی جرأت اور کم وسائل کے باوجود زندگی سے بھرپور لطف اٹھانے کی اہلیت کے لیے انھیں سراہتی تھیں۔ وہ ان کے خاندان کی عورتوں کی سخت کوشی کی معترف تھیں اور ان کے ننھے بچوں کی شرارتی معصومیت پر فدا تھیں۔ وہ ان کے ساتھ مل

Scanned with CamScanner

کہ ان کی خوشیوں میں ہنسی اور غموں میں روئی تھیں۔ وہ ان کے حقوق کے لیے لڑی تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ یہ نوجوان انھیں ناامید نہیں کریں گے۔

1971 کی انڈو پاک جنگ کے نتیجے میں بنگلہ دیش ایک الگ ملک بن گیا اور کراچی میں بہاری پناہ گزینوں کا ایک ریلا آ پہنچا۔ ان میں سے بہت لوگ جذام کے مرض میں مبتلا تھے۔ کراچی کے سینئر لیپرسی سپروائزر عبدالعزیز اس چیلنج کا سامنا کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ہنگامی امداد کا انتظام کیا گیا۔ اورنگی میں ایک خیمے میں چھوٹی سی ڈسپنسری کھولی گئی۔ آسٹریا سے کرٹروڈ مسلیمن کے جمع کردہ فنڈ سے ایک رہائشی اسکیم شروع کی گئی۔ ان خاتون نے اپنے دوستوں کے خاندانوں سے فی خاندان ایک مکان کا خرچ فراہم کرنے کی درخواست کی تھی۔ اس فلاحی اسکیم کے تحت سینکڑوں مکان تعمیر کیے گئے۔

جب روتھ سندھ کے ریگستان کو پار کر کے کیرتھر پہاڑی سلسلے کے دامن میں واقع رنی کوٹ میں داخل ہوئیں تو سید عزادار حسین ان کے ساتھ تھے۔ تپتی دھوپ میں سروے کرنے کے نتیجے میں روتھ کی جلد پر آبلے پڑ گئے لیکن وہ خوش تھیں کہ ان کی ٹیم نے ریتیلے علاقے میں جذام کے گیارہ مریضوں کا پتا چلا لیا تھا۔ رات میں وہ کھلے آسمان تلے کانٹے دار جھاڑیوں کے درمیان جیب میں پیاز رکھ کر سوتیں تاکہ زہریلے سانپوں کو دور رکھ سکیں۔

عبدالحمید شاہ نے جان ہتھیلی پر رکھ کر براہوی زبان بولنے والے مینگل قبیلے کے سردار سے اجازت حاصل کی کہ ڈاکٹر روتھ کی ٹیم بلوچستان کے خضدار ڈویژن میں واقع ان کے علاقے پرالی میں داخل ہو سکے۔ اجازت ملنے پر ٹیم پیدل وہاں داخل ہوئی۔ ایک پہاڑی ندی کے سوکھے ہوئے پاٹ کو پار کرتے ہوئے انھیں اچانک زور کی گرج سنائی دی۔ حمید شاہ نے مڑ کر دیکھا تو پانی کے ایک زبردست ریلے کو اپنی سمت آتے دیکھا۔ انھوں نے روتھ کا ہاتھ تھاما اور دونوں دوڑ کر پاٹ کے دوسرے کنارے پر پہنچ گئے اور یوں اچانک پھوٹ پڑنے والے سیلاب میں غرق ہوتے ہوتے بچے۔ اگلے دن وہ سورج ڈوبنے تک پیدل چل کر جنگل کے سرے پر بنی جھونپڑی تک پہنچے جہاں مسخ چہرے اور گلے ہوئے ہاتھوں والی ایک عورت کو تنہا چھوڑ دیا گیا تھا۔ ان کے اس عورت کے پاس واقع کنوئیں سے پانی پینے اور اس کے ہاتھ کی بنی چپاتیاں کھانے کے سادہ عمل سے لوگوں کا خوف جاتا

Scanned with CamScanner

رہا اور اس عورت کو قبیلے میں دوبارہ شامل کر لیا گیا۔

1998 میں ایک بار پھر خضدار جانے والی سڑک پر حمید شاہ روتھ کے ساتھ تھے جب جرمنی میں ان کی والدہ کے انتقال کی خبر آئی۔ گاڑی واپس نہیں موڑی جا سکتی تھی۔ راستے کے اختتام پر مریض ان کے منتظر تھے۔ ماں بیٹی کی آخری ملاقات تقریباً چھ مہینے پہلے ہوئی تھی جب روتھ پچھلی بار اپنے آبائی وطن گئی تھیں۔ کسی نہ کسی طرح دونوں کو اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ وہ ایک دوسرے سے آخری بار مل رہی ہیں۔ یہ ایک پرمسرت ملاقات تھی۔

1980 میں ملا محمد انھیں طوفانی بارش اور برفباری میں سے گزارتے ہوئے شمال مغربی سرحدی صوبے کے لوئر دیر ضلعے کے مقام سرباغ لے گئے۔ اس موسم کا انتخاب ٹیم نے خاص طور پر اس لیے کیا تھا کہ وہاں کے زیادہ تر مردوں اور عورتوں سے ان کی ملاقات ہو سکے جو بعد میں پہاڑوں میں گم ہو جاتے ہیں۔ اس طرح خانہ بدوشوں کی 98 فیصد آبادی کا سروے کیا جا سکا اور جذام کے تیس نئے مریضوں کی نشاندہی ہوئی۔ ایک رات گاؤں کی جھونپڑی میں کھٹملوں نے روتھ کو سونے نہ دیا تو وہ تازہ ہوا میں سانس لینے باہر نکل آئیں، لیکن باہر نکلتے ہی پڑوسی کے کتے نے انھیں کاٹ لیا۔ اگلی صبح جب ملا محمد نے ریبیز سے بچاؤ کا ٹیکہ لگوانے کی تجویز پیش کی تو روتھ نے مسکرا کر انکار کر دیا۔ ''نہیں نہیں، یہ کوئی پاگل کتا نہیں۔ اس نے تو محض اپنا فرض ادا کیا۔''

1995 میں فسادزدہ کراچی شہر میں واقع ایشیا کی سب سے بڑی کچی آبادی اورنگی میں جب مخالف نسلی گروہوں نے ایک دوسرے پر فائرنگ شروع کر دی تو عبدالحمید انصاری، اطہر عالم اور ڈاکٹر روتھ کو بھاگ کر پناہ لینی پڑی۔ اس سے اگلے برس پورے پاکستان میں جذام کے مرض پر قابو پا لیا گیا، اور یہ منزل عالمی ادارۂ صحت کی طے کردہ تاریخ یعنی سنہ 2000 سے پورے چار سال پہلے حاصل ہو گئی۔ دسمبر 2000 تک ملک بھر میں پھیلے ہوئے 170 مرکزوں میں جذام کے پچاس ہزار مریضوں کا اندراج کر لیا گیا تھا۔ تین سو پچیس پیرامیڈیکل کارکن، جن میں زیادہ تر سرکاری ملازم تھے، لیپرسی ٹیکنیشین کے طور پر تربیت پا کر فیلڈ میں کام کر رہے تھے۔

روتھ فاؤ کا خواب پورا ہو گیا تھا، لیکن وہ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنے والی نہیں تھیں۔ شمالی علاقوں اور آزاد کشمیر میں ٹی بی پر قابو پانے اور سندھ، بلوچستان اور شمال مغربی سرحدی صوبے میں نابینا پن کو

روکنے کے پروگراموں کی ابتدا کرنے کے بعد بھی انھوں نے اپنا سفر جاری رکھا۔ نوجوان پاکستانی ڈاکٹروں کو وہ اپنی ذمے داریاں اٹھانے کے قابل پہلے ہی بنا چکی تھیں۔

12

وہ ایک نوجوان میڈیکل گریجویٹ تھا۔ ایک دوست کے مشورے پر اسے 1971 میں عملے میں شامل کیا گیا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ نوجوان ڈاکٹر ذہین اور اپنے کام میں ماہر تھا۔ اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا تھا کہ اسے مریضوں اور اسپتال کے عملے کا بہت خیال تھا۔ اس کی بنیاد یقیناً مضبوط تھی۔ لیکن بیشتر انسانی بنیادوں کی طرح، وہ اسی پرانے جال میں جا پھنسا۔ وہ خود کو طاقتور، طاقتور تر اور طاقتور ترین بنانا چاہتا تھا۔

روتھ نے اپنی ذات میں حد درجہ انکساری مثال قائم کرنے کی کوشش کی تھی۔ پورے ادارے کے کسی کمرے کے باہر ان کے نام یا عہدے کی تختی لگی ہوئی نہیں تھی۔ جس کمرے میں وہ سوتی تھیں اور جس میں ان کی پرانی ڈھرانی کپڑوں کی الماری رکھی تھی، اسی کو وہ اپنے دفتر کے طور پر بھی استعمال کرتیں۔ کونے میں رکھی واحد میز برسوں سے ان کے مینول ٹائپ رائٹر کو سنبھالے ہوئے تھی جس کی جگہ حال ہی میں ایک جرمن دوست سے تحفے میں ملے ہوئے کمپیوٹر نے لے لی تھی۔ صدر کے نام خط ہو یا امدادی اداروں کو شکریے کے رقعے، سب اسی دفتر سے لکھے جاتے۔ اپنی سیکرٹری بھی وہ خود تھیں اور اپنی ڈرائیور بھی۔ اپنے طرزِ زندگی کو دوسروں پر ٹھونسنے کی انھیں ہرگز خواہش نہ تھی لیکن جب انھوں نے اپنے ساتھ کام کرنے والوں کی پہل کاری کی حوصلہ شکنی ہوتے دیکھی تو انھیں بڑی بے اطمینانی محسوس ہوئی۔ انھیں، پنے وجدان سے پتا چلا کہ ادارہ اپنے وقار سے محروم ہوتا جا رہا ہے۔

جرمن تعاون کار بہت دور تھے اور اس تصویر کو دیکھ نہیں سکتے تھے۔ پاکستانیوں کو آمرانہ نظامِ کاری کی عادت پڑی ہوئی تھی۔ انتظامی میٹنگوں میں ان کے برابر بیٹھے ہوئے ارکان بھی ان کی نیت پر کسی قدر شک کرنے لگے۔ ہوں... بڑھاپا، ارتکاز کی کمی... دفتری سیاست، بادشاہ گری... ارے نہیں، خدا کی پناہ!

روتھ نے گفتگو چھیڑی اور ممکنہ اقدامات کے بارے میں رائے طلب کی۔ وہ کوئی ایسا حل نکالنا

چاہتی تھیں جس میں کسی کی ہتک نہ ہو۔ دوسرے شخص کو ہارتے ہوئے دیکھنے میں بھلا کیا لطف! اس کے باوجود چہرے سرخ ہوئے، نتھنے پھڑکے، میز پر زور زور سے ہاتھ مارے گئے اور پیر پٹخے گئے۔ زمین لرز اٹھی۔ روتھ اپنی جگہ سکون سے جمی بیٹھی رہیں، تبدیلی کو سہارا دینے کے لیے پرعزم۔ افراد کو سیکھنے کی اور ادارے کو نمو پانے کی ضرورت تھی۔

آخر کار سنہ 2000 میں ایک موقع آیا۔ مذکورہ ڈاکٹر کا نام ایک کنسلٹینسی کے لیے تجویز کیا گیا۔ اس کی جگہ ایک سینئر رکن، جن کی سب عزت کرتے تھے، 2000 میں چیف ایگزیکٹو آفیسر بن گئے۔ چلتی ہوئی زبانیں بند ہو گئیں، حیرت زدہ آنکھیں تبدیلی کا مشاہدہ کرنے لگیں۔ ماما فاؤ کی دانش ایک بار پھر درست ثابت ہوئی تھی۔

راولپنڈی سے کراچی تک نوجوان منتظم اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے لگے۔ نوجوان پٹھان بیوہ گل پری ایک تربیت یافتہ فارماسسٹ کے طور پر اپنی جگہ سنبھال کر ادارے کو بھی بڑھنے میں مدد دینے لگیں اور اپنے دو بیٹوں کی پرورش بھی کرنے لگیں۔ انفرادی تخلیقی صلاحیت کو سراہا جانے لگا۔

ننوں کے ایک چھوٹے سے گروپ کی قائم کی ہوئی ڈسپنسری نے ثابت کیا کہ وہ بڑھ کر ایک باوقار ادارہ بن چکی ہے، جس نے خود کو ایک این جی او کے طور پر منوایا جو ملک کے بڑے حصے میں جذام جیسے طویل المدت مرض کا مفت علاج فراہم کرتی ہے۔ اس نے این جی او اور حکومت کے درمیان شراکت کا ایک منفرد ماڈل پیش کیا اور ساتھ ہی ساتھ بین المذاہب رواداری اور ثقافتی افہام و تفہیم کی ایک مثال بھی قائم کی۔

کراچی میں ادارے کا ہیڈ کوارٹر ایک سات منزلہ عمارت میں قائم ہے جس میں مسلمانوں کے لیے مسجد اور مسیحیوں کے لیے ایک گرجا گھر بھی ہے۔ عید، کرسمس اور دیوالی کے تہوار عملے کے تمام مسلمان، مسیحی اور ہندو ارکان یکساں جوش کے ساتھ مل کر مناتے ہیں۔ جذام کے سالانہ دن کی تقریب قرآن مجید اور پھر انجیل کی آیات کی تلاوت سے شروع ہوتی ہے۔

اور بلاشبہ اس تقریب کو شروع کرنے کے لیے سسٹر برنیس وارگاس کی شرکت لازمی ہوتی ہے۔ وہ اپنی خراب صحت کے باوجود اسپتال کی فارمیسی کی دیکھ بھال کرنے کے لیے آج بھی ہر روز بلاناغہ آتی ہیں۔ سدا مسکراتے چہرے کے ساتھ انھیں کسی مریض کے پاس بیٹھنے اور عملے کے کسی رکن

Scanned with CamScanner

سے گپ شپ کرنے میں خوشی محسوس ہوتی ہے۔ انھیں ہمیشہ خیال رہتا ہے کہ دوائیں جہاں کہیں ان کی ضرورت ہو، پہنچیں اور بروقت پہنچیں، خواہ وہ تربت میں بچوں کے لیے آنکھوں میں ٹپکانے کے قطرے ہوں یا اسکردو میں مریضوں کے لیے ٹی بی کی دوا ہو۔ اگرچہ اب وہ اس بات پر خوش ہیں کہ انھوں نے میکلوڈ روڈ کی بستی کے ایک صحت یاب پٹھان مریض کی نوجوان اور تعلیم یافتہ بیٹی گل پری کو اپنے کام کی تربیت دے دی ہے۔

13

''میں آپ کو کیا بتاؤں کہ ان لوگوں نے ہمارے لیے کیا کیا ہے؟ انھوں نے کتنی محنت سے کام کیا اور اب بھی کر رہی ہیں۔ کراچی میں شدید بارشیں ہو رہی تھیں، لیکن انھوں نے کبھی ایک دن کا بھی ناغہ نہیں کیا۔ سسٹر وارگاس اور ڈاکٹر فاؤ گھٹنوں تک کھڑے گٹر کے گندے پانی میں سے گزر کر پہنچتی تھیں۔'' یوسف میکلوڈ روڈ کے دنوں کو اس طرح یاد کرتا ہے۔ یوسف 1954 میں ہندوستان کے صوبے آندھرا پردیش سے کراچی آیا تھا۔ جذام کا مریض ہونے کے باعث اس کے پاس جانے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ سو وہ میکلوڈ روڈ کی بستی میں رہ پڑا اور کوئی اور چارہ نہ پا کر بھیک مانگنے لگا۔

پھر یہ سسٹرز آئیں اور ڈسپنسری قائم ہوگئی۔ یوسف کا علاج کر کے اسے اسپتال ہی میں ہیلپر کے طور پر ملازمت دے دی گئی۔ اس نے جذام کی ایک اور صحت یاب مریضہ سے شادی کی اور اس کی تین بیٹیاں ہوئیں۔ بڑی بیٹی اب شادی شدہ ہے۔ چھوٹی دو بیٹیوں میں سے ایک مقامی اسکول کی پرنسپل ہے اور دوسری صحت کے ایک نامور ادارے میں کمپیوٹر پروگرامر کے طور پر کام کرتی ہے۔

یوسف اب اپنے مسخ شدہ ہاتھ پیروں کے ساتھ سکون سے گھر پر بیٹھتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ یہ سب میری ایڈیلیڈ لیپرسی سینٹر کی مدد کے بغیر ممکن نہیں تھا۔ اس کی تین عزیز بیٹیاں تعلیم تو ہرگز حاصل نہیں کر سکتی تھیں، جو اب اپنی ذہانت اور محنت کی بدولت اس کا بڑھاپے کا سہارا ہیں۔

روتھ فاؤ کی بڑی بہن ازمگارڈ گونشوریک نے اپنے تاثرات اس طرح بیان کیے:

''مجھ سے روتھ کی زندگی کا خاکہ لکھنے کو کہا گیا تھا۔ میں اس کی سگی بہن ہوں، اس لیے ظاہر ہے

Scanned with CamScanner

مجھے اس کے بارے میں ہر شخص سے زیادہ علم ہونا چاہیے۔

''مگر میں سوچتی ہوں، اگر میں اس کی زندگی کی تفصیلات بیان کروں تو اس کے کیا معنی ہوں گے؟ 1929 میں (لائپزگ، جرمنی میں) ایک بالائی متوسط طبقے کے گھرانے میں پیدا ہوئی، جو چار بہنوں اور ایک بھائی پر مشتمل تھا۔ ہٹلر کی حکمرانی اور دوسری عالمی جنگ کے دوران بڑی ہوئی۔ 1948 میں جرمنی کے مغربی حصے کی طرف چلی آئی۔ 1957 میں اپنی طب کی تعلیم مکمل کر کے 1960 میں پاکستان آ گئی۔

''ایسے لوگ بہت سے ہیں جو اس کے بارے میں ان حقائق سے واقف ہیں، اور اس کی اپنے مقصد سے لگن اور اس کے کام کو جانتے ہیں، لیکن میں اس کی شخصیت کو ذرا مختلف انداز سے بیان کرنے کی کوشش کروں گی، اس طرح جیسے میں نے اسے بچپن کے دنوں سے جانا ہے۔ اگر کوئی پوچھے کہ روتھ کی شخصیت کی خاص باتیں کیا ہیں تو میرا جواب ہوگا: اس کی اپنے ساتھی انسانوں سے محبت، اپنے مقصد کو حاصل کرنے اور خوابوں کو حقیقت بنانے کی صلاحیت، اور آزادی کی خواہش۔

''اگر کوئی اس کی اپنے ساتھی انسانوں سے محبت اور اس کی صلاحیت کی بات کرتا ہے، تو ضرور کرے۔ جہاں تک میرا سوال ہے، میں اس شے کی بات کروں گی جسے میں نے 'آزادی کی خواہش' کا نام دیا ہے۔ وہ پندرہ سال کی تھی جب اس نے خود کو زندگی میں پہلی بار آزاد محسوس کیا۔ دوسری عالمی جنگ ختم ہو چکی تھی اور اس کے ساتھ ہٹلر کی آمرانہ حکومت بھی۔

''مجھے اپریل 1945 کے وہ دن اچھی طرح یاد ہیں۔ اپنے زیادہ تر ہم وطنوں کی طرح ہم اپنا قریب قریب سب کچھ کھو بیٹھے تھے، ہمارے پاس کھانے کو کچھ نہ تھا، اسکول بند پڑے تھے، ایسی کوئی چیز باقی نہ بچی تھی جو زندگی کو پُرلطف بنا سکے۔ لیکن ہم آزاد تھے! ہم نے اپنی آزادی کا جشن منانے کے لیے اِدھر اُدھر کا سفر کر کے اپنے دوستوں سے ملنے کا قصد کیا، جن کی ہمیں عرصے سے کوئی خبر نہ ملی تھی کیونکہ ڈاک کا نظام معطل ہو چکا تھا۔ پبلک ٹرانسپورٹ بہت کم تھی مگر ہم نے کسی نہ کسی طرح سفر کر ہی لیا۔

''پرانے، گھسے ہوئے سوٹ کیس میں رکھنے کے لیے کوئی سامان نہ تھا (اضافی کپڑے اور جوتے ہمارے پاس تھے ہی نہیں) سوائے کھانے کی چیزوں کے، کیونکہ ہمیں معلوم تھا کہ کوئی شخص

Scanned with CamScanner

ہمیں کچھ کھلا نہیں سکے گا۔ چنانچہ اس میں ہم نے اپنی خوراک رکھ لی جو محض آلوؤں اور چقندروں پر مشتمل تھی۔

"تین ہفتے میں یہ خوراک ختم ہو گئی، اور ہم خوش خوش لوٹ آئے۔ ہم نے اس سفر کا بے پناہ لطف اٹھایا۔ تمام دشواریوں، مسلسل برتی بارش، اور اپنے خالی پیٹوں کے باوجود، ہم جانتے تھے کہ ہم آزاد ہیں ور زندگی کا لطف اٹھانا ہمارے بس میں ہے۔ چنانچہ ہم نے فیصلہ کیا کہ اب ساری زندگی آزاد رہیں گے اور صرف وہ کام کریں گے جنھیں اپنی دانست میں درست کام سمجھیں گے۔

"ٹھیک تیس برس بعد (جب میں روتھ اور اس کے پروجیکٹ سے منسلک ہونے کے لیے پاکستان پہنچی تھی)، ہم حیدرآباد میں ملے۔ ہم نے رات وہاں کے لیپرسی سینٹر میں گزاری، دریائے سندھ کا نظارہ کیا اور دل کھول کر ہنسے۔

"کیا ہمارے خواب پورے ہوئے؟ ہم نے ایک دوسرے سے دریافت کیا۔ آزادی سے زندہ رہنے کے اور اپنی پسند کا کام کرنے کے خواب۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ دریائے سندھ یورپی لوگوں کے لیے ایک خاص معنی رکھتا ہے۔ ہمیں اس کے بارے میں بچپن میں اسکول میں پڑھایا جاتا ہے، اور یورپ میں شاید ہی کوئی بچہ ہو گا جو بڑے ہو کر اس کا نظارہ کرنے کی خواہش نہ رکھتا ہو۔ آزادی، صرف اپنے لیے نہیں، بلکہ ایسی آزادی جو ہمیں دوسرے انسانوں کی مدد کے قابل بناتی ہو۔

"جیسا کہ میں نے کہا، آزادی غالباً ایسا لفظ ہے جو روتھ کو سب سے زیادہ عزیز ہے۔ درحقیقت اپنے والد کے لایپزگ سے وائزبادن ہجرت کرنے کے بعد وہ خاندان کی پہلی فرد تھی جو وہاں سے نکل آئی۔ والد ابھی تک روزگار کی تلاش میں تھے۔ یہ قدرت کا کرشمہ تھا کہ اس برطانوی فوجی نے اپنا منھ دوسری طرف پھیر لیا اور اسے مغربی جرمنی کی سرحد میں داخل ہونے دیا۔ وہ جنت میں اس مہربان شخص سے ملنے کی امید رکھتی ہے تاکہ اس کا ذاتی طور پر شکریہ ادا کر سکے۔

"اس نے تمام چیزوں کا لطف اٹھایا۔ اس نے جرمنی کے مغربی (آزاد) حصے میں اپنی تعلیم کا لطف اٹھایا۔ اس نے ان برسوں کا لطف اٹھایا جب اس کے پاس سفر کے لیے وقت اور موقع موجود تھا۔ سفر کے لیے، لوگوں سے ملنے کے لیے، انھیں دوست بنانے کے لیے۔

"اور مجھے ہمیشہ محسوس ہوتا ہے کہ ان برسوں نے اس کی زندگی پر بہت گہرا اثر چھوڑا، ان

Scanned with CamScanner

برسوں نے جن کا اس نے پورا لطف اٹھایا، کیونکہ اس سے اس کے فیصلے کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے کہ اسے انسانوں کی خدمت کرنی ہے۔ اس کی وقعت اس لیے زیادہ ہے کہ یہ فیصلہ ایک مثبت رویے کے ساتھ کیا گیا تھا، کسی مایوسی یا ناکامی کے زیر اثر نہیں۔ اور اگر کوئی مجھ سے پوچھے تو میں کہوں گی کہ میں خوش ہوں کہ یہ فیصلہ خوش دلی کے ساتھ کیا گیا۔''

روتھ فاؤ کی قریبی دوست مسز والٹراؤ شرائبر نے 28 ستمبر 1991 کو ویورز برگ میں ڈاکٹر فاؤ کو ڈیمین ڈٹن ایوارڈ پیش کیے جانے کے موقعے پر درج ذیل الفاظ کہے:

''پیارے دوستو!

''ہمارے معزز مہمان کی طرف سے ڈاکٹر روتھ فاؤ کو اعزاز اور امتیاز دیا جانا میرے لیے نہایت متاثر کن بات ہے۔ اس کی اہمیت اس لیے اور بھی زیادہ ہے کہ ہمارے 'فرینڈز آف کراچی' کے ارکان کو اس مسیحی مشن کے کام سے وابستہ رہنے، اسے قریب سے دیکھنے، اور اس کی اپنے وسائل اور عطیات کے ذریعے مدد کرنے کا تیس برس سے موقع ملتا رہا ہے۔

''ہماری سرگرمیوں کا مرکز ساورلینڈ کا علاقہ ہے جسے بعض اوقات 'قصباتی' بھی کہا جاتا ہے۔ شاید اس میں کوئی نقصان بھی نہیں کیونکہ ہمارے علاقے کے لوگوں کا، اور خدا کا شکر ہے کہ نوجوانوں کا بھی، جوش و خروش بڑے شہروں اور پرہجوم علاقوں میں رہنے والوں سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ بلکہ شاید اس کے برعکس کچھ زیادہ ہی ہے۔

''1946 اور 1947 کے درمیانی عرصے کی شدید سفاک سردیوں میں بہت سے لوگوں کی جان بچنا امریکہ اور مغربی وسطی کے قصباتی علاقوں، دیہات اور چھوٹے شہروں سے آنے والی امداد ہی کی بدولت ممکن ہوا تھا، بھلا ہم اسے کیسے بھول سکتے ہیں!

''میں آج آپ کو اطلاع دے سکتی ہوں کہ ہمارے فرینڈز سرکل کے ارکان کے عطیات بھیجنے کے جوش و خروش کے نتیجے میں، ہم پچھلے تیس برس کے عرصے میں کئی ملین جرمن مارک کی رقم اور اشیا پاکستان میں اپنی ڈاکٹر فاؤ کی سرگرمیوں میں شامل ہونے کے لیے مہیا کر چکے ہیں۔ لیکچر، بازار، اسکولوں کے میلے، یہاں تک کہ سیب کا رس بیچنے جیسی سرگرمیاں بھی ان نتائج میں مددگار ثابت

ہو گئیں۔ یہاں میں 1989 میں منعقد ہونے والے مشعل بردار مظاہرے کا خاص طور پر ذکر کروں گی جس کا عنوان تھا: 'لاکھوں جذامیوں کے لیے امید کی روشنی'۔

''یہ سب کس طرح شروع ہوا؟ روتھ فاؤ سے میری پہلی ملاقات 1956 میں ہوئی۔ ایک بڑے حادثے کے بعد میں وئنز برگ اسپتال میں داخل تھی جب میری نگران ڈاکٹر نے اس ابتلا سے باہر نکلنے کے لیے حوصلہ کرنے پر اکسایا۔ اس کا نام تھا ڈاکٹر روتھ فاؤ۔

''1962 میں مجھے پاکستان سے آئے ہوئے ایک خط کو دیکھنے کا موقع ملا جس میں وہاں جذامیوں کی حالت زار بیان کی گئی تھی: ان کے لیے اسپتال ٹین کی ایک جھونپڑی میں قائم تھا اور نرسنگ اور علاج کے لیے درکار طبی سامان کی شدید کمی تھی۔ ڈاکٹر فاؤ اس زمانے میں جذام کی معالج بن گئی تھیں جب تیسری دنیا کے اسپتالوں میں جذامیوں کا داخلہ ایک ناممکن بات سمجھی جاتی تھی۔ پاکستان سے آنے والی یہ رپورٹ دہلا دینے والی تھی (جرمن محاورے میں یہ انسان کی کھال میں گھس جانے والی شے تھی)۔ اس کا مطلب تھا کہ فوراً کچھ کیا جانا ضروری تھا۔

''انسانی سوچ کے ٹکراتے ہوئے ان لوگوں کی ابتلا کے مقابلے میں، میں نے سوچا میرے اپنے دکھ کتنے غیر اہم ہیں۔ چنانچہ 1961 کے شروع میں وئنز برگ میں میرے ایک واقفکار نے اولین عطیات جمع کیے: دوائیں، سوتی کپڑے، اونی کمبل وغیرہ۔ فرائینول سے وورزبرگ تک میرے اولین رابطے، جرمنی کی انسداد جذام کی ایسوی ایشن سے میری پہلی حوصلہ افزا ملاقات، دوستوں کو راغب کرنا، مختلف قسم کے وسائل اکٹھے کرنا، صنعتی اداروں کو ساتھ ملا کر کلیسا کے ساتھ کام کرنا۔ ہم نے صحافیوں سے بھی رابطے کیے لیکن اس سلسلے میں سب سے اہم خود ڈاکٹر فاؤ کے اپنے تجربات کی رنگا رنگ رپورٹیں تھیں جنھیں ہم اپنے سرکلر میں باقاعدگی سے شائع کیا کرتے اور جن کا عنوان ہوتا: 'ہم پاکستان میں جذامیوں کی مدد کرتے ہیں'، اور جن کا بہت اچھا اثر ہوا۔

''مختصر یہ کہ یہ تعاون جاری رہا اور اب بھی جاری ہے، جیسا کہ کہاوت ہے، ایک مبارک ستارے کی چھاؤں میں نہیں، بلکہ خدا کی برکت کے سائے میں۔ کراچی کے دوستوں کے جرمن حلقے میں شامل ہم لوگ اپنی ڈاکٹر فاؤ کی سرگرمیوں کی ترقی میں اور زیادہ حصہ ڈالنا چاہتے ہیں، وہ جن کی کوششوں کو آج اتنے متاثر کن طریقے سے سراہا جا رہا ہے، تاکہ ہم سب اس مقصد تک پہنچ سکیں جس

Scanned with CamScanner

ن سکیں امید ہے: عیسوی سن 2000 تک پاکستان میں جذام پر مکمل فتح۔"

ڈاکٹر روتھ فاؤ نے منکسوچر نیوز لیٹر میں اپنے لفظوں میں لکھا کہ انھوں نے اپنی سترویں سالگرہ کیسے گزاری:

"میں کہاں سے شروع کروں؟

"ان تمام چھوٹے چھوٹے محبت بھرے اشاروں اور موقعوں کے ذکر سے جنھوں نے 25 ستمبر کی آمد کا اعلان کیا؟ ناممکن: ان کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ اگرچہ ان میں کسی کو بھلایا نہیں جا سکے گا۔ ان میں سے کچھ مثالیں یہ ہیں: اسٹاف کے نمائندوں نے سب سے پہلے آ کر اپنا تحفہ دیا: شلوار قمیص، زرد رنگ کی، جو میرا پسندیدہ رنگ ہے۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ میں اسے پہلی بار 25 ستمبر کو پہنوں گی۔

"وہ اپنے ساتھ سالگرہ کا کارڈ بھی لائے تھے: 'ماں، تمھارے لیے، محبت کے ساتھ۔ ماں وہ ہے جو مانگنے سے پہلے مدد کو پہنچتی ہے، جو کسی صلے کی توقع کے بغیر اپنی محبت دیتی ہے، اور سب سے بڑھ کر، ماں وہ ہے جس کی محبت کی کوئی انتہا نہیں۔'

"یوحنا کی انجیل کا یہ جملہ مجھے ہمیشہ مسرور کرتا ہے: 'اور جب اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ان سے محبت کرے گا تو اس نے آخر تک ان سے محبت کی... آخر تک۔'

"میں نے جو زندگی گزاری ہے اس سے بہتر زندگی کا میں خواب میں بھی تصور نہیں کر سکتی تھی۔

"بعد میں 25 ستمبر 1999 کو کیتھیڈرل میں عبادت۔ منبر پر چھ پادری تھے، ایک ساتھ خوشی کا اظہار کرتے ہوئے — ان میں سے ہر ایک کا ہمارے پروگرام سے کچھ نہ کچھ تعلق رہ چکا تھا — ہر ایک کے پاس اس کی اپنی کہانی تھی۔

کیتھیڈرل کرسیوں کی آخری قطار تک لوگوں سے بھرا ہوا تھا — مسیحی، مسلمان، ہندو، بدھ، پارسی۔ سماجی کارکن، مریض، میری ایڈیلیڈ لیپرسی سینٹر کی مجلس عاملہ کے ارکان، دوست۔ اسد م آباد سے آیا ہوا مسلمان سماجی کارکن الیاس عبادت پوری ہونے پر مجھ سے پوچھتا ہے: 'مجھے پتا نہیں آپ سے یہ سوال کرنا چاہیے یا نہیں۔ یہ عبادت اس قدر پروقار اور خوبصورت تھی، لیکن اس کے باوجود مجھ میں کسی چیز کی کمی محسوس ہوتی تھی۔ آپ نے اتنی ساری شمعیں جلائیں لیکن ان سب کی روشنی

صرف منبر تک محدود رہی۔ میں انتظار ہی کرتا رہ گیا کہ آپ ان میں سے کچھ شمعیں اٹھا کر ان کی روشنی ہمارے درمیان تقسیم کریں گی، تاکہ ہم مستقبل میں آپ کے مشعل بردار بن سکیں۔"

"ہماری ایک نوجوان سسٹر اور ہندو ساتھی کارکن جو یہ بات سن رہی تھی، اس نے اس بار 25 ستمبر کو الیاس کے اس خیال کو عمل کا روپ دے دیا۔ جی ہاں، اسی ۲۵ ستمبر کو۔

"پولیس اور رینجرز نے وہ تمام سڑکیں جو اسپتال کی طرف جاتی ہیں، اپوزیشن کو اس علاقے میں ایک مظاہرہ کرنے سے روکنے کے لیے بند کر رکھی تھیں جو اتفاق سے 25 ستمبر ہی کو ہونا تھا۔ اور ادھر پوری ٹیم نے اس موقعے کے لیے اتنی تیاریاں کی تھیں اور مریض اس تقریب کے اتنے دنوں سے بیتابی سے منتظر تھے!

"شام پانچ بجے، ٹریفک کے گزرنے کے لیے سڑکیں ذرا سی دیر کے لیے کھولی گئیں۔ ہم سب لپک کر تقریب کے مقام پر پہنچ گئے، اگرچہ وہاں پہنچنے کے بعد ہمیں گیٹ پر گھنٹہ بھر انتظار کرنا پڑا کیونکہ انتظامی کمیٹی نے اپنی تیاریاں ابھی پوری نہ کی تھیں۔

"شہر میں بدامنی ہونے کے باوجود آٹھ سو ساتھی کارکن اور مریض حفاظت سے وہاں پہنچ چکے تھے۔ نغمے، خاکے، کھیل، انگریزی اور اردو میں تقریریں۔ پھر ہم نے پھولوں کی پتیوں کی بوچھار اور خاندان کے افراد کی تالیوں کے درمیان بڑا سا کیک کاٹا — یہاں تک کہ آخرکار تقریب کا سب سے ناقابل فراموش لمحہ آ پہنچا: شمعیں روشن کرنے کا لمحہ۔ سوامی ایک نہایت خوبصورتی سے سجی ہوئی ایک شمع مجھے تھماتا ہے، ہاشم (جذام کا ایک صحت یاب مریض) مجھے آگ پیش کرتا ہے — ہم شمع کو دونوں سروں سے جلاتے ہیں۔ میری اپنی زندگی بھی اسی طرح گزری ہے: دونوں سروں سے جلتی ہوئی ایک شمع کی طرح۔

"میری جلائی ہوئی شمع تاریک ہال میں پہلی روشنی ہے۔ لیکن جب میں اپنی آنکھیں اٹھاتی ہوں تو یہ روشنی پورے ہال میں پھیل چکی ہے، اس کے آخری کونے تک، اور وہاں سے باہر نکل کر راہداری اور زینے تک۔ بہت ساری شمعوں کی سنہری، پُرحرارت روشنی نے تاریک ہال کو روشنی، گرمجوشی اور امید کے ایک جگمگاتے جزیرے میں بدل دیا ہے۔

"انتظامی گروپ، جس نے اس پروگرام کے انعقاد کی ذمے داری پوری کی ہے، اپنی شمعیں

Scanned with CamScanner

بڑی احتیاط سے میری جلائی ہوئی شمع سے روشن کرتا ہے۔

''اس روشنی کو کوئی بجھا نہیں سکے گا — یہ وعدہ اس پوری شام کے دوران مجھے بے شمار بار ہال کے ہر کونے سے اٹھتا سنائی دیتا ہے۔ اندھیرے کو کوسنے کے بجائے ایک شمع جلانا بہتر ہے۔ یا خدا، اس ٹیم کو اپنی رحمت اور حفاظت میں رکھنا۔

''باہر سڑک پر رینجرز کی گاڑیاں، اپنے گونج دار سائرن بجاتی ہوئی، رنانے سے گزر رہی ہیں جبکہ ہر طرف جلی ہوئی بسیں، موٹر سائیکلیں اور کاریں بکھری ہوئی ہیں اور ہوا میں رہ رہ کر مشین گن کی فائرنگ کی آوازیں گونج رہی ہیں — اور اندر لیپرسی ٹیم اتحاد، امن اور مفاہمت کی تقریب منا رہی ہے۔

''سنی اور شیعہ، مسیحی اور ہندو، خاکروب اور منتظم، مریض اور صحتمند ساتھی کارکن اور دوست، ہندوستانی اور افغان مہاجر، سندھی اور پٹھان، بلوچ اور پنجابی۔ ان کے گھر والوں کو بھی بلایا گیا ہے، بیویاں اور بچے، دوسرے مرد مہمانوں کے ساتھ — میں بہت خوش ہوں۔''

11 اگست 2001 کو روزنامہ ڈان، کراچی، میں ''جذام کے علاج کے مراکز'' کے عنوان سے شائع ہونے والا ایڈیٹر کے نام ایک خط:

''میرا خط 25 جولائی کے اخبار میں شائع ہونے والی ڈیرہ غازی خان کی شاہ صدر دین یونین کونسل کے ایک گاؤں کے رہنے والے تین بچوں کی تصویر کے حوالے سے ہے جو مبینہ طور پر جذام میں مبتلا ہیں۔

''ضلعی انتظامیہ کی تشکیل دی ہوئی ایک ٹیم نے جس میں چھ میڈیکل اسپیشلسٹ شامل تھے، گاؤں کا دورہ کیا اور تصدیق کی کہ مذکورہ خاندان کے افراد Xeroderma Pigmentosa نامی مرض میں مبتلا ہیں جو موروثی طور پر والدین سے اولاد کو منتقل ہوتا ہے۔ جذام کو خارج از امکان قرار دیا گیا۔

'' خبر ڈان نے حقائق کی چھان بین کے بغیر 28 جولائی کو ایک اداریہ 'جذام اب بھی ایک مسئلہ ہے' کے عنوان سے شائع کر دیا۔ جذام ایک قابل علاج مرض ہے اور 'سماجی بدنامی کا خوف'

صرف اس وقت جنم لیتا ہے جب کسی شخص میں اس مرض کی باقاعدہ تشخیص ہو چکی ہو۔ اس اداریے میں اس بات کی بھی نشان دہی نہیں کی گئی کہ پاکستان میں اس مسئلے کا موثر حل موجود ہے۔

'اس سے میری مراد ڈاکٹر روتھ کے ایم فاؤ اور ان کے قائم کردہ میری ایڈیلیڈ لیپرسی سینٹر سے ہے۔

''پچھلے سال، جب میں پولیٹکل ایجنٹ کے طور پر ڈیرہ غازی خان کے قبائلی علاقے میں تعینات تھا، میرا کیمپ کوہ سلیمان نامی سلسلے کے دور ترین پہاڑوں میں واقع تھا اور خشک سالی کی ریلیف کا کام جاری تھا۔ گھوڑے کی پیٹھ پر سفر کرنا آسان نہ تھا، چنانچہ میں اپنے انتظامی کام کے علاوہ دوائیں بھی ساتھ لے کر چلتا تھا تاکہ مفت میڈیکل کیمپ لگائے جا سکیں۔ ایسے ہی ایک دورے میں میں نے پانچ افراد میں جذام کے مرض کی تشخیص کی، جن میں میرا میزبان بھی شامل تھا جس کے چھپر کی چھت والی کاٹیج میں میں نے دو راتیں بسر کی تھیں۔

''مجھے ہمیشہ اپنے ڈی ایم جی آفیسر ہونے پر فخر رہا ہے جو پرانے کولونیل نظام کی آخری اور واحد اچھی باقیات ہے۔ اچھوتوں کے ساتھ رہنا اور جذامیوں کے ساتھ کھانا میرے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔

''تاہم میرے میزبان نے یہ کہہ کر میرے مبالغہ آمیز فخر کو دھچکا پہنچایا کہ اگرچہ اس ویرانے میں آکر ان کے ساتھ رہنے والا میں پہلا ڈی ایم جی آفیسر تھا، اور وہ بھی ان دشوار دنوں میں جب یہاں پینے کو پانی بھی دستیاب نہیں، لیکن میں وہاں آنے والا پہلا ڈاکٹر ہرگز نہیں تھا۔

''چھ سال پہلے ایک 'سفید فام فرشتہ صفت خاتون' گھوڑے کی پیٹھ پر تین دن کا دشوار سفر کر کے اس سنگلاخ پہاڑی علاقے میں پہنچی تھی۔ اس نے جذامیوں کے مرض کی تشخیص کی تھی اور علاج کے لیے دوائیں دی تھیں۔ سب سے بڑھ کر اس نے نحیف، کم حیثیت خداؤں کے ان بچوں کو، امید عطا کی تھی کہ وہ نارمل انسانوں کی طرح رہ سکتے ہیں۔

''اب ڈاکٹر روتھ کے لیپرسی سینٹر کے پاس اس علاقے کے 68 مریض رجسٹرڈ ہیں جن میں سے 19 اب تک زیر علاج ہیں، جن میں میرا میزبان بھی شامل تھا۔

''پاک لوگوں کی اس سرزمین میں جرمنی کی ایک فرنگی عورت نے آکر جذام کے خلاف جہاد

برپا کیا ہے جبکہ خود ہمارے یہاں پیدا ہونے والی 'جہادی تنظیمیں' انسانیت کے خلاف جنگ میں معروف ہیں۔ زندہ باد ڈاکٹر روتھ، خدا آپ پر مہربان ہو!"

ڈاکٹر راحیل احمد صدیقی، ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر (جنرل)، ڈیرہ غازی خان۔

14

اپنی کتاب To Light a Candle میں روتھ فاؤ ایک سوال اٹھاتی ہیں: "کیا دو ایسے مذہبوں کے لیے جن میں سے ہر ایک کو ابدی سچائی پا لینے کا دعویٰ ہو، ایک دوسرے سے کوئی بامعنی مکالمہ کرنا ممکن ہے؟ اس سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔ میں صرف اپنی زندگی کے تجربات بیان کرسکتی ہوں۔" اس کے بعد وہ لاہور کی بادشاہی مسجد کے اپنے دورے کا حال بیان کرتی ہیں جسے بادشاہ اورنگزیب نے شاہی قلعے کے سامنے 1674 میں بنوایا تھا۔ وہاں وہ مشہور وکیل اللہ بخش کریم بروہی کے ساتھ گئی تھیں۔

"میں ایک مسلمان دوست کے ساتھ وہاں گئی تھی۔ خاموش، خنک برآمدوں میں چپ چاپ چلتے اور دیواروں پر نازک نقاشی کی تحسین کرتے ہوئے میں اچانک مرکزی صحن میں آنکلی۔ وسیع، خالی صحن۔ لامحدودیت کا احساس۔ اور تین گنبد، محراب کے اوپر موتیوں کے ڈھیروں جیسے، بہت دور معلوم ہوتے ہوئے۔

"اس ناقابلِ تصور، واحد ہستی نے، جس کی شان میں یہ مسجد بنوائی گئی تھی، اچانک میرے وجود پر غلبہ پالیا، مجھے سحرزدہ کردیا۔ وہ ناقابلِ فہم ہستی فانی انسان کو کسی صورت میں اپنا جلوہ دکھا سکتی تھی۔ میں نے اپنی مغربی پرورش سے پیدا ہونے والی تمام تر قوتِ ارادی سے کام لے کر خود کو گھٹنوں کے بل جھک کر رو پڑنے سے باز رکھا۔

"یہ وہ روحانی واردات تھی جو مجھ پر اپنے مسلمان دوست کے سامنے طاری ہوئی، اور جس نے میری روحانی زندگی پر گہرا نقش چھوڑا۔"

ہر صبح جب وہ میری ایڈیلیڈ لیپرسی سینٹر اسپتال کی دوسری منزل پر واقع اپنے ایک کمرے کے

Scanned with CamScanner

فلیٹ سے سیڑھیاں اتر کر، سادہ سوتی شلوار قمیص میں ملبوس، نیچے آتی ہیں تو دروازے کے پاس رک کر پٹھان چوکیدار غنچہ گل سے اپنی سلیس اردو میں مختصر سی گپ شپ کرتی ہیں۔ وہ بھی جذام کا ایک صحت یاب مریض ہے۔ پھر وہ اب تک سوئے ہوئے شہر کی گلیوں سے گزر کر سوا سو سال پرانے سینٹ پیٹرکس کیتھیڈرل تک جاتی ہیں۔

راستے میں چیتھڑے چننے والا ایک افغان ان کے پاس سے بے پروائی سے گزرتا ہے۔ سڑک کے کنارے سویا ہوا ایک نشئی ان کی طرف پیٹھ پھیر لیتا ہے۔ کونے پر ایک دبلا پتلا، متواتر کھانستا ہوا خوانچہ فروش فٹ پاتھ پر اپنا خوانچہ جما رہا ہے۔ پاس کی ایک جھونپڑی سے کسی ننھی بچی کے رونے کی آواز ہوا میں گونجتی ہے۔

ان کا دل لہو ہونے لگتا ہے۔ انھیں خواہش ہوتی ہے کہ کاش وہ اس سرزمین کے غریب باشندوں کے لیے اس سے کچھ زیادہ کر سکتیں، اس سرزمین کے لیے جس سے انھوں نے بے پناہ پیار کیا ہے۔

کیتھیڈرل کے محرابی ہال میں ان کا دبلا پتلا، مختصر سا وجود بلند و بالا چوبی صلیب کے سامنے کھڑا ہوتا ہے۔ سر جھکائے، آنکھیں بند کیے، وہ دایاں ہاتھ اپنے سینے پر رکھے کپکپاتی ہوئی سرگوشی میں کہتی ہیں:

"یا خدا، میں تجھے پانے کے قابل نہیں
صرف ایک لفظ کہہ دے تاکہ میرے زخم بھر جائیں۔"

ایک نیا دن شروع ہو چکا ہے۔ خدا کے حکم پر عمل کرنے کا ایک اور دن۔ بیالیس برس پہلے کے اس دن کی طرح جب انھوں نے کراچی کے ایرپورٹ پر پہلا قدم رکھا تھا۔ اور ان کے پاس زادِ راہ کے طور پر صرف تین چیزیں تھیں: ناداری، پاکیزگی اور اطاعت، اور کچھ نہیں، نہ اس سے زیادہ، نہ اس سے کم۔

❁❁

نئی کتابیں

نئے نام کی محبت
نظمیں
تنویر انجم

Rs.350

یاقوت کے ورق
نظمیں
علی اکبر ناطق

Rs.200

ہندی کہانیاں: ۴
انتخاب اور ترتیب
اجمل کمال

Rs.350

بالوں کا گچھا
(ناول)
خالد طور

Rs.500

Scanned with CamScanner

سہ ماہی ادبی کتابی سلسلے ''آج'' کی اشاعت ستمبر 1989 میں کراچی سے شروع ہوئی اور اب تک اس کے 73 شمارے شائع ہو چکے ہیں۔ ''آج'' کے اب تک شائع ہونے والے خصوصی شماروں میں گابریئل گارسیا مارکیز، ''سرائیوو سرائیوو'' (بوسنیا)، نرمل ورما، اور ''کراچی کی کہانی'' کے علاوہ عربی، فارسی اور ہندی کہانیوں کے انتخاب پر مشتمل شمارے بھی شامل ہیں۔

''آج'' کی مستقل خریداری حاصل کر کے آپ اس کا ہر شمارہ گھر بیٹھے وصول کر سکتے ہیں اور ''آج کی کتابیں'' اور ''سٹی پریس'' کی شائع کردہ کتابیں 50 فیصد رعایت پر خرید سکتے ہیں۔ (یہ رعایت فی الحال صرف پاکستانی سالانہ خریداروں کے لیے دستیاب ہے۔)

چار شماروں کے لیے شرح خریداری (بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان میں: 800 روپے

بیرون ملک: 80 امریکی ڈالر

آج کے کچھ پچھلے شمارے محدود تعداد میں دستیاب ہیں

اس کے علاوہ ماہنامہ ''شب خون'' الٰہ آباد

کے بھی کچھ پچھلے شمارے محدود تعداد میں دستیاب ہیں

Scanned with CamScanner

۷۵

قیمت

۳۸۰ روپے

آج کی کتابیں

۳۱۶ مدینہ سٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ

صدر، کراچی ۷۴۴۰۰